تذکرہ شہید رحمۃ اللہ

محمد خالِد سیف

یعنی

برِ صغیر پاک و ہند کی اسلامی تاریخ کے عظیم جرنیل
حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی حیاتِ مبارکہ، تعلیم و تربیت،
دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف، جہاد فی سبیل اللہ، معاندینِ
اہلِ بدعت کے اعتراضات اور ان کے جوابات اور سیرت و
سوانح سے متعلق دیگر امور پر مشتمل ایک نہایت شگفتہ و
شاداب تذکرہ!

"تذکرۂ شہید" میں اس یگانۂ روزگار اور
نابغۂ عصر کے سوانح وحالات پر تفصیل سے روشنی
ڈالی گئی ہے جن کو تاریخ کے اوراق میں مولانا
شہیدؒ کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس
کتاب کا دراصل موضوع یہ ہے کہ حضرت شہیدؒ
کی عظمتِ فکر وعمل کو قارئین کرام کے سامنے پیش
کیا جائے اور بتایا جائے کہ تاریخ کی نظر میں
اس گرامی قدر شخصیت کا مقام کتنا اونچا ہے،
اسلام سے اس کی وابستگی کس درجہ استوار ہے،
اللہ کا عشق کس طرح اسکی رگ رگ میں جاری وساری
ہے، توحید کے انوار وتجلیات اس پر کس درجہ
واضح ہیں، علم وادراک کے دریچے اس کے
سامنے کس طرح وا ہیں اور اس کے جذبۂ عشق و
وفا اور حمیت وغیرتِ دین نے کیونکر "بخاک وخون
غلطیدن" کی روایتِ پارینہ کو زندہ رکھا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ فاضل مصنف نے
حضرتِ شہیدؒ کی شخصیت کے بارے میں
اُن تمام گوشوں کو اُجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ
نہیں اٹھا رکھا، جو ایک عرصے سے استخوانِ
نزاع بنے ہوئے تھے۔

مولانا محمد حنیف ندوی

تذکرہ شہیدؒ

محمد خالد سیف

مکتبۂ غزنویہ
۴۔ شیش محل روڈ۔ لاہور

تاریخ اشاعت: مئی ۱۹۸۳ء

اہتمام: محمد سرور طارق

کتابت: احسان الحق، محمد عاشق حسین، زیدی

طباعت: کمرشل نیوز پرنٹنگ پریس، فیصل آباد

قیمت: ۳۶ روپے

فہرست مضامین

"اگر مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے بعد ان کے مرتبہ کا ایک مولوی بھی پیدا ہو جاتا، تو آج ہندوستان کے مسلمان ایسی ذلت کی زندگی نہ گذارتے۔"

(حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ)

"شاہ اسمٰعیلؒ اپنے کمالات کے باعث ربِ ذوالجلال کی قدرت کا ایک نمونہ تھے۔"

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ ص ۷۵۲، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور)

"مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی (عربی) کتاب ردّ الاشراک کا "تقویۃ الایمان" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اگر پانچ سو برس پہلے لکھی جاتی، تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا۔"

"اسلام کے اظہار سے پہلے میں نے شاہ صاحبؒ کی "تقویۃ الایمان" پڑھی تھی، چنانچہ ردِّ شرک کے متعلق مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا، بلکہ ایک لحاظ سے یہ کتاب مجھے اسلام میں لانے کا ذریعہ بنی۔ غرضیکہ امام محمد اسمٰعیلؒ میرے استاد اور امام ہیں اور مجھے ان سے بہت محبت ہے، ایسی محبت جس طرح لوگ اپنے مذاہب کے ائمہ سے کرتے ہیں۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص) مولانا عبیداللہ سندھیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفکر اسلام مولانا محمد حنیف ندوی کے قلم سے

مُقدمہ

اسلامی ہندوستان میں تحریک احیائے اسلام کی نشاط آفرینیوں کو اگر کسی مرکز و سرچشمہ کا کرشمہ قرار دیا جاسکتا ہے، تو اس کا دوسرا نام خاندان ولی اللّٰہی ہے۔ اس خاندان کا ہر فرد اصلاح و تجدید کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا ہے۔ علم و بصیرت ــــ اور ذوق و اجتہاد سے سرشار یہی وہ گھرانہ ہے جس کے فیوض و برکات سے آج بھی اذہان و قلوب تابندہ و روشن ہیں اور آئندہ بھی جب کوئی قدم فکری و عملی نوعیت کا اسلام کی سربلندی کے لیے اٹھے گا، تو ضرور ہے کہ وہ انہی خطوط کی روشنی میں اٹھے، جنکی نشاندہی ان بزرگوں نے اپنے علم و کردار سے کی ہے۔

عزیزم مولانا محمد خالد سیف ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس قافلۂ عشق و وفا کی تمام سرگرمیوں کو ایک سلک میں پرو دیا ہے اور خاص سلیقے اور سلجھاؤ سے اس تمام مواد کو اپنی تصنیف "تذکرۂ شہیدؒ" کے دامن میں سمیٹ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے، جو مختلف متون و کتب میں بکھرا پڑا تھا، بلکہ اس کے ساتھ اس یگانۂ روزگار اور اس نابغۂ عصر کے سوانح و حالات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جن کو تاریخ کے اوراق میں مولانا شہیدؒ کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے اور یہی دراصل اس کتاب کا موضوع بھی ہے کہ حضرت شہیدؒ کی عظمتِ فکر و عمل کو قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جائے اور بتایا جائے کہ جس شخص کے خلاف عناد و مخالفت کے طوفان اٹھائے گئے، جس کو کفر و الحاد کا ہدف قرار دیا گیا جس کے عقائد و افکار پر بحث و مناظرہ کی مجالس آراستہ کی گئیں اور جس سے متعلق عوام میں ناحق یہ تاثر پھیلایا گیا کہ اس نے اپنی تصنیفات میں ملحدانہ

شوخیوں کا اظہار کیا ہے۔ تاریخ کی نظر میں اس گرامی قدر شخصیت کا مقام کتنا اونچا ہے، اسلام سے اس کی وابستگی کس درجہ استوار ہے۔ اللہ کا عشق کس طرح اس کی رگ رگ میں جاری و ساری ہے۔ توحید کے انوار و تجلیات اس پر کس درجہ واضح ہیں۔ علم و ادراک کے دریچے اس کے سامنے کس طرح وا ہیں، اور اس کے جذبۂ عشق و وفا اور حمیّت و غیرت۔ دین نے کیونکر "بخاک و خون غلطیدن" کی روایتِ پارینہ کو زندہ رکھا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ فاضل مصنّف نے حضرت شہیدؒ کی شخصیت کے بارے میں ان تمام گوشوں کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، جو ایک عرصے سے استخوانِ نزاع بنے ہوئے تھے۔

"فرزندانِ توحید" یا "فرزندِ توحید" کی ترکیب ہمیشہ ہمارے ذہن و فکر کے لیے اُلجھن کا باعث رہی۔ ہم نے جب بھی اس پر غور کیا، اس میں اور نظریۂ توحید میں ایک طرح کا تضاد محسوس کیا، کیونکہ جو ذات صمدیت صفات خود شان "لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ" سے اتّصاف پذیر ہے، وہ بھلا صفتِ توحید میں فرزند کے تصور کو کب برداشت کر سکے گی؟ لیکن حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے سیاق میں جب اس ترکیب پر غور کیا، تو یہ عقدہ کھُلا کہ اگر ہم ایک لفظ سے حضرت الامامؒ کی بھرپور شخصیت کی شگفتہ اور رواں دواں انداز میں تصویر کھینچ سکتے ہیں، تو وہ یہی لفظ "فرزندِ توحید" ہے۔ ترکیب کے ظاہری اور لفظی اطلاق سے قطع نظر اگر معاملہ مجاز و تشبیہ کا ہے اور ادب و محاورہ کی دنیا میں اس کی پوری پوری گنجائش پائی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مولانا شہیدؒ کے قلب و ذہن کی نگرانی میں اپنے کردار و عمل کی تابانیوں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی والہانہ محبت و سرمستی میں براہِ راست نظریۂ توحید کی فیض رسانی کا دخل ہے، گویا خود توحید نے ان کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ توحید نے ہی ان کی تربیت کی اور توحید ہی نے ان کے ذہن و فکر اور کردار و عمل کے سانچوں کو ڈھالا ہے۔

اس مجاز میں توحید کا یہ پہلو نکھر کر سامنے آیا کہ یہ عقیدہ کہ خدا تعالیٰ ایک ہے صرف ریاضیاتی سچائی نہیں، بلکہ بجائے خود ایسی روشنی، ایسا نور، ایسی قوت، اور قوتِ محرکہ ہے جو انسانی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

توحید اور "فرزندِ توحید" کی اس وضاحت کے بعد حضرت شہیدؒ کی تمام علمی و عملی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ آپ کو ان سب میں یہی روح، یہی جذبہ اور یہی روشنی کارفرما نظر آئے گی اور آپ دیکھیں گے کہ "تقویۃ الایمان" "ردّ الاشراک" "صراطِ مستقیم" اور بالاکوٹ کی معرکہ آرائیوں کے ڈانڈے اسی اصول سے ملے ہوتے ہیں۔ یہی جذبہ توحید تھا جس نے آپ کو مجبور کیا کہ لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر شرک و بدعات کے قلعوں پر حملہ آور ہوں۔ یہ بھی توحید ہی کی کارفرمائی تھی کہ ان کو سکھوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔ یوں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے توحید ہی اصلاح و تجدید کی وہ پہلی اینٹ ہے جس پر اصلاح و تجدید کے غرفے تعمیر کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے اگر انہوں نے اس مسئلہ پر خصوصیت سے توجہ فرمائی ہے تو ان کا یہ اندازِ فکر عین اس خواب کی تعمیر کے مطابق ہے، جو شاہ ولی اللہؒ کی چشمِ بصیرت نے اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں دیکھا تھا۔

قارئین کرام اور اصل کتاب کے درمیان ہم زیادہ دیر تک حائل رہنا نہیں چاہتے، بس صرف دو باتیں کہہ کر مقدمہ نگاری کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جانا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق مسئلہ امکانِ نظیر سے ہے، جس کا ایک عرصہ تک علم و فن کے حلقوں میں چرچا رہا۔ مولانا خیرآبادی نے خصوصیت سے جس کو ہوا دی اور پورے زور کے ساتھ اس کی تردید میں عقل و خرد کے خزف ریزوں کو بنا سنوار کر پیش کیا۔ آخر آخر ان کو اپنے اس طرزِ عمل پر افسوس بھی ہوا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور وہ جن مغالطات کو پھیلا چکے تھے، اہلِ بدعت کے دائروں میں سند کی حیثیت سے مقبول ہو چکے تھے۔ دوسری چیز جس کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں، وہ ان کی مشہور کتاب "عبقات" کی اہمیت ہے۔

جہاں تک امکانِ نظیر کے مسئلہ کا تعلق ہے، یہ صرف اتنی سی بات تھی کہ مولانا ، جو توحید کی سرمستیوں سے سرشار تھے اور امکان کے کسی گوشہ میں بھی اللہ تعالیٰ کو عاجز ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، غیر منطقی اسلوب میں اللہ تعالیٰ کے دائرۂ قدرت کی بے پناہیوں کو بیان کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی صرف تکوین و آفرینش کی حد تک۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ سراسر حدودِ عشق میں شمار ہونے کے لائق تھا، منطق یا فلسفہ کی موشگافیوں سے نہ صرف

اسے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اس کو اگر منطق کی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا، تو یہ ایمان وذوق کی اس لطافت کو کھو بیٹھے گا جو اظہار کے اس پیرایۂ بیان سے جھلک رہی ہے۔ مولانا خیرآبادی چونکہ ذوقِ توحید کی فراوانیوں سے ناآشنا تھے، اس لیے خواہ مخواہ اس کو گھسیٹ کر منطق و کلام کے دائرہ میں لے آئے۔

دوسری زیادتی اس بارے میں یہ ہوئی کہ اس کے ڈانڈے اس سوال سے ملا دیئے گئے کہ کیا اللہ تعالیٰ محالات پر قادر ہے یا نہیں؟ حالانکہ یہاں استحالہ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ سوال ایک امر تکوینی کے بارے میں تھا جس میں امکان پہلے سے مقدر تھا۔

تیسری غلطی جس کا جان بوجھ کر ارتکاب کیا گیا، وہ اس تاثر کو پھیلانا تھا کہ گویا مولانا شہیدؒ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دائروں کو محالات تک وسعت پذیر مانتے ہیں، حالانکہ معمولی ذہن کا انسان بھی جانتا ہے کہ قدرت محالات سے متعرض ہی نہیں ہوتی، چہ جائیکہ اس کے بعد امکان کذب وغیرہ کی لغو بحثوں کو چھیڑا اور طول دیا جائے۔

"عبقات" مولانا شہیدؒ کا وہ علمی و فکری شاہکار ہے جس کے متعلق نہایت اعتنا کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہمیں علم و معرفت کے ایسے انمول موتی اور خزائنِ مخفی نظر آتے ہیں کہ جن کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے، تو کلام، تصوّف اور کائنات سے متعلق متعدد غوامض کا حل نکل آئے۔ اس میں خصوصیت سے تجلّی کی بحث ایسی ہے کہ جس سے نہ صرف خالق و مخلوق کے مابین استوار رشتوں کی تشریح ہوتی ہے، بلکہ ایک خاص انداز میں سیماطلوجیا (SEMATOLAGY) کی بنیادوں کا بھی پتہ چلتا ہے، جس کا موضوعِ بحث فلسفہ لسانیات میں یہ اہم سوال ہے کہ لفظ و معنی میں ربط و تعلق کا اسلوب کیا ہے؟ یعنی الفاظ کس حد تک معانی کے حقائق کی تجلیات کا تحمل رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ اہلِ حدیث کے نوجوان علماء خدارا خصوصیت سے ادھر متوجہ ہوں اور مولانا شہیدؒ کی علمی و فکری عظمتوں کو منظرِ عام پر لائیں اور دنیا کو بتائیں کہ وہ شخص جس نے اپنے خون سے اسلام کے دبستان کو سینچنے کی سعادت حاصل کی۔ اس نے اپنے کمالِ علم سے فکر و ادراک کی بلندیوں کو بھی چھونے میں کسی دون ہمتی کا ثبوت نہیں دیا۔

ادارۂ اسلامیہ ثقافت لاہور

محمد حنیف ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلف

میری یہ خواہش تھی کہ "تذکرۂ شہید" کی یہ ابتدائی سطور دریائے کنہار کے کسی ایسے کنارے پر بیٹھ کر رقم کرتا، جہاں مجاہدین نے اپنے گھوڑوں کو پانی پلایا تھا یا سرزمین بالاکوٹ میں کسی ایسے پتھر پر بیٹھ کر سپردِ قلم کرتا جس کے ساتھ کسی مجاہد نے اپنے گھوڑے کو باندھا تھا لیکن یہ گناہگار شاید ابھی تک اس وادیٔ مقدس میں حاضری کے قابل نہیں، جسے پاکباز مجاہدین نے اپنے گرم گرم خون سے لالہ زار بنا دیا تھا۔

اب جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، دل و دماغ کی کچھ عجب سی کیفیت ہے، جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں بس یوں سمجھئے کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے صفحات ذہن کے پردۂ سکرین پر الٹتے پلٹتے جا رہے ہیں صفحات کیا بلکہ خود عظیم بادشاہوں، بہترین مفکروں، دانشوروں، بہادروں، دین کے عالموں، دنیا کے زاہدوں اور جرنیلوں کو ان کے اہلِ قافلہ سمیت برصغیر پاک و ہند کے وسیع و عریض سٹیج پر ابھرتے اور ڈوبتے دیکھ رہا ہوں اور ——— دیکھتا ہوں کہ اس مردم خیز خطۂ سرزمین میں جنم لینے والے سید احمد شہیدؒ اور عارف باللہ، مجاہد فی سبیل اللہ حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے جیالے غازیوں اور بہادر شہیدوں کا قافلہ ہی ایک ایسا مقدس قافلہ ہے جو ایمان، اخلاص، علم، عمل، جہاد، ایثار، شجاعت، تحمل آلام و مصائب اور اتباع

سنت میں حضرات صحابہ کرام ـــــ رضوان اللہ علیھم اجمعین ـــ سے حد درجہ مشابہت رکھتا ہے ۔ جیسے حضرات صحابہ کرام رض اپنے قدوسی نفوس، پاک ارواح اور آئینہ سے بڑھ کر شفاف دلوں کی بدولت یوں محسوس ہوتے تھے کہ یہ تو فرشتے تھے جو انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوگئے ہیں یا سرورِ دنیا و دیں رحمۃ للعالمین، مولائے کل، دانائے سبل ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صحبت و انقلاب آفریں رفاقت کی برکت سے یہ انسان فرشتوں کے روپ میں ڈھل گئے ہیں، اسی طرح بالاکوٹ کے سرفروش مجاہدوں کو دیکھ کر بھی محسوس یوں ہوتا ہے کہ شاید اس پاکباز قافلے سے کچھ لوگ کہیں بچھڑ گئے تھے جنہیں ربِ کائنات نے دنیا کو ایک بار پھر ـــ انی اعلم مالا تعلمون ـــ کا منظر دکھانے کے لیے سیدین شہیدینؒ کی قیادت میں جمع فرما دیا تھا۔

اللہ اللہ! یہ کیا گوہر شب چراغ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تڑپ احیائے دین، اعلاءِ کلمۃ اللہ، احیائے سنت سید المرسلین اور امحاتِ بدعت ہی کے لیے پیدا فرمایا تھا اور پھر باطل کی تردید کے لیے انہیں شمشیرِ براں سے بڑھ کر تیز زبان، حق کی حمایت کے لیے پہاڑوں جیسا مضبوط دل، برقِ تپاں سے بڑھ کر تیز قوتِ فراست، سیلِ جرار جیسے پیہم عمل اور عزمِ صمیم کی سرفرازیوں سے شادکام کیا تھا۔ دشمن کے مقابلہ میں انتہائی سخت تھے تو آپس میں انتہائی رحمدل اور اقبالؒ کے اس شعر ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا!

کی مکمل تصویر۔

"تذکرۂ شہیدؒ" اسی مقدس قافلہ کے سیرت و کردار کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے جس میں بالخصوص اس قافلہ کے سرخیل و جرنیل حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی حیاتِ مبارکہ، تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف، جہاد فی سبیل اللہ، معاندینِ اہلِ بدعت کے اعتراضات و افتراآت اور ان کے جوابات

اور سیرت و سوانح سے متعلق دیگر امور کو موضوع سخن بنایا گیا ہے ، اس تذکرہ کے مطالعہ سے کسی کے دل میں زندگی کی کوئی رمق پیدا ہوگئی ، کسی کی آنکھ میں بینائی کی کوئی چمک پیدا ہوگئی ، کسی کی رگوں میں وہ خون جوش مارنے لگ گیا جو راہِ خدا میں بہنے کے لیے بیقرار ہوتا ہے ، کسی کا سینہ جوشِ جہاد سے سرشار ہوگیا ، کوئی قدم اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور کوئی کارواں منزلِ عشق کی طرف رواں دواں ہوگیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ ورنہ ؎

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلہ کی پرواہ

کیونکہ علمی و تحقیقی کام جدوجہد سے تعبیر ہے ، تو یہ بجائے خود ستائش و صلہ بھی ہے ، محنت ہے تو اعزاز بھی ، تشنگی ہے تو تسکین بھی ، بھوک ہے تو غذا بھی!

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی شخصیت اور آپ کے افکار و آراء اگرچہ متنازعہ فیہ ہیں ، تاہم بندہ عاجز نے "تذکرۂ شہیدؒ" میں حتی المقدور علمی —— SCIENTIFIC اور خالص اکیڈیمک ACADEMIC انداز اپنانے کی سعی کی ہے ، اس میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے ، اس کا فیصلہ قارئین کرام کریں گے!

"تذکرۂ شہیدؒ" کے معزز قارئین میں سے کوئی صاحب اگر مصنف کو اس کی کسی فروگذاشت یا تسامح سے مطلع فرمائیں تو اسے بصد شکریہ قبول کرکے اگلے ایڈیشن میں اصلاح کردی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز! کیونکہ ناچیز مصنف نے اس تذکرہ کو حیاتِ مستعار کی صرف بیسویں منزل میں قدم رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے، جبکہ اسے تصنیف و تالیف کا سلیقہ تھا اور نہ علم و تحقیق کے اعتبار سے وہ مقام حاصل تھا جس پر ہماری تاریخ کے اس باب پر خامہ فرسائی فرمانے والے حضراتِ مصنفین مثلاً مولانا غلام رسول مہر مرحوم یا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فائز ہیں ، لہذا اصلاح کسی قسم کی بھی ہو اسے تسلیم کرنے سے قطعاً انکار نہ ہوگا۔

"تذکرۂ شہیدؒ" کی ترتیب و تالیف کے سلسلہ میں جن جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے ، ان کی حواشی و تعلیقات میں صراحت کردی گئی ہے نیز مراجع و مآخذ کی آخر میں

مفصل فہرست بھی دے دی گئی ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ تذکرۂ شہید کی طباعت کا اہتمام مکتبۂ غزنویہ لاہور نے کیا ہے۔
آج اگر حضرت سیّد ابو بکر غزنویؒ بقیدِ حیات ہوتے، تو آپ اس کتاب کی اشاعت پر یقیناً مسرت کا اظہار فرماتے۔ احباب جانتے ہیں کہ دیگر اوصافِ حسنہ کے ساتھ ساتھ آپ کے قلبِ اطہر میں ولولۂ جہاد نہایت شدّت سے موجزن تھا۔ تحریک احیائے دین کی تنظیم کے لیے بے پناہ تڑپ رکھتے تھے اور تحریکِ مجاہدین کے سلسلہ میں مثبت اور ٹھوس لٹریچر کی طباعت و اشاعت کو نہایت ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کے ذمہ بھی آپ نے اس سلسلہ میں دو عنوانات پر کام کرنا لگایا تھا، جسے انشاء اللہ ضرور کیا جائے گا۔
آخر میں برادرِ مکرم حضرت مولانا عاتش محمد صاحب نائب رئیس جامعہ ابو بکر کراچی کا شکریہ ادا کرنا بھی ازبس ضروری سمجھتا ہوں، جن کی مخلصانہ دعاؤں اور مؤثر تعاون کی بدولت طباعت و اشاعت کے مرحلے بحسن و خوبی طے ہوئے۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

محمد خالد سیف
فیصل آباد

۲ ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ
یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء

باب اوّل

خاندان

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہید رح، حجۃ اللہ، عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے عظیم الشان اور جلیل القدر خاندان کے ایک نامور اور ممتاز فرد تھے کہ پھر سے ایسا صاحبِ کمالات اور جامع صفات کسی دوسرے میں تو کیا اس خاندان میں بھی کوئی نہ ہوا ؎

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

یاد رہے اس عالی مرتبت خاندان کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی جناب سیدنا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ناموری و بلند اقبالی میں یہ خاندان اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ علمی تبحر اور فضل و کمال کے اعتبار سے جو شرف اس خاندان کو حاصل ہے کوئی دوسرا اس کا سہیم و شریک نہیں۔ اس مبارک و مقدس خاندان کا ایک ایک فرد فلکِ رشد و ہدایت پر آفتابِ نصف النہار بن کر جگمگایا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ تمام اوصافِ حمیدہ جن سے قدرت نے اس خاندان کے ممتاز افراد کو متصف فرمایا تھا، تمتہ دودمانِ عالی ولی اللّٰہی حضرت

امام محمد اسمٰعیل کو مجموعی طور پر ان تمام سے سرفراز فرمایا۔

اس سے قبل کہ ہم آپ کی سیرت و کردار، مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل، اصلاحی تحریک، آپ کے عقائد و نظریات اور سوانح حیات سے متعلق دیگر امور پر روشنی ڈالیں، آپ کے آباؤ اجداد کا کچھ تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

شیخ شمس الدین مفتیؒ

آپ کے خاندان کے اکابر میں سب سے پہلے جس شخصیت نے برِّ صغیر پاک و ہند میں قدم رنجہ فرمایا، وہ شیخ شمس الدین مفتیؒ تھے۔ انہوں نے اس وقت کے ایک بارونق اور مشہور شہر رُہتک میں سکونت اختیار فرمائی۔ پرہیز گاری اور شب زندہ داری و تہجد گزاری کے باعث آپ کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی لکھا ہے کہ یہ بات یقینی ہے کہ ہمارے اجدادِ عظام میں سے سب سے پیشتر حضرت شمس الدین مفتیؒ ہندوستان تشریف لائے اور رُہتک میں سکونت اختیار کی! نیز آپ نے یہ بھی لکھا ہے :-

"وایں بزرگ مرعالم و عابد بودہ است و اوّل کسیکہ نشر از او قریش در آں بلدہ دُ آمد و بسببِ وے شعائرِ اسلام ظہور نمودہ و طغیان رکفر منطقی شد۔"[2]

شیخ شمس الدین جس زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے اس کے متعلق کوئی حتمی بات کہنا ناممکن ہے کیونکہ قدیم تذکرے اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں البتہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ برِّصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کا ابتدائی دور تھا اگرچہ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے تاہم زمانۂ جاہلیت کے کچھ اثرات ان میں ہنوز باقی تھے۔ اس لیے شیخ شمس الدین نے عقائد و نظریات کی اصلاح اور دینی تعلیمات کے فروغ کے لیے یہاں ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا آپ انتہائی عابد و زاہد تھے۔ آپ کے متعلق بہت سے عجیب و غریب واقعات کتب تاریخ میں موجود ہیں "مشتے نمونہ از خروارے" ایک حیرت انگیز واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

"جناب شیخ شمس الدین مفتی کی حیاتِ مستعار کا وسیع پیمانہ جب لبریز ہو کر چھلکنے کے قریب ہوا تو آپ نے اپنی اولاد و احفاد کو جمع کر کے وصیت کی کہ جب میری رُوح اس عنصری جسد سے مفارقت کر کے عالمِ بالا

میں پرواز کرجائے تو میری نعش کی تجہیز و تکفین بالکل اسی طریقے اور طرز پر ہونا چاہئے جو سنت سے ثابت ہے۔ تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ کی نماز نہایت خشوع اور منتہائے عجز و نیاز سے ادا کی جائے۔ اس کے بعد میرا جنازہ مسجد میں جو میری خاص عبادت گاہ اور مقام اعتکاف ہے رکھا جائے حاضرین کو چاہیئے کہ تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے ہٹ جائیں اور مسجد بالکل خالی کر دیں۔ بعدازاں اگر میری نعش پائی جائے تو دفن کریں ورنہ اپنے اپنے گھر واپس چلے جائیں اور کسی طرح کا تذبذب و تردد نہ کریں! چنانچہ آپ کے انتقال کے بعد لوگوں نے ایسا ہی کیا اور آپ کی وصیت کی بڑی سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ تعمیل کی گئی۔ مسجد کے ایک مختصر گوشہ میں جنازہ رکھا گیا اور تھوڑی دیر کے لیے ساری مسجد خالی کر دی گئی پھر جو دیکھا تو جنازے کا نام و نشان تک نہ پایا۔ حاضرین اس ندرت انگیز واقعہ سے سخت متعجب ہوئے اور تعجب و حیرت کا عالم لیے ہوئے واپس آئے۔

شیخ کمال الدین مفتی رح

شیخ شمس الدین مفتی رح کے انتقال کے بعد ان کے نامور فرزند شیخ کمال الدین مفتی رح جانشین بنے اگرچہ شیخ شمس الدین رح کے اور بھی صاحب علم و فضل صاحبزادے تھے مگر شیخ کمال الدین رح ان میں سب سے زیادہ باکمال اور اپنے والد مرحوم کی سچی تصویر تھے۔ حوصلہ مندی، بلند خیالی، روشن دماغی، دقیق النظری اور خداداد فہم و فراست میں اپنی مثال آپ تھے۔ عبادت و ریاضت یا مطالعۂ کتب میں ہر وقت مصروف رہتے۔ مرہٹوں کے قضا، احتساب اور افتاء وغیرہ کئی ممتاز عہدوں پر بھی آپ فائز رہے۔

شیخ قطب الدین رح

شیخ کمال الدین مفتی رح کے بعد ان کے ہونہار صاحبزادے شیخ قطب الدین رح ان کے جانشین ہوئے افسوس کہ آپ کے تفصیلی حالات کے بارے کتب تاریخ خاموش ہیں

آپ کے بعد آپ کے فرزند شیخ عبدالملک رح جانشین ہوئے۔ آپ نے اپنے دور کے بڑے بڑے اساتذہ سے کسب فیض کیا اور ابتدائی عمر میں علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا۔ لوگ بڑے شوق سے آپ کے وعظ و ارشاد کی مجلسوں میں حاضر ہوتے تھے۔ قدرتی طور پر خوش الحان

تھے اور سوز و گداز اس پر مستزاد ۔ اس لیے سامعین ایک خاص تاثیر لے کر رخصت ہوتے ۔
مگر افسوس کہ عالمِ شباب میں ہی علم و عرفان کی ان محفلوں کو سُونی چھوڑ کر راہیٔ مُلکِ عدم ہوئے ۔

قاضی بدھا رح

شیخ عبدالملک رح کی وفات پر آپ کے فرزند قاضی بدھا رح آپ کی مسند پر متمکن ہوئے ۔ قاضی بدھا رح اگرچہ خاندان کے دیگر افراد کی طرح علوم و فنون میں کمال مہارت نہ رکھتے تھے ۔ تاہم کثرتِ مطالعہ اور خداداد صلاحیتوں کے پیشِ نظر آپ نے بھی قضاء کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا ۔ قاضی بدھا رح کے بعد قاضی قاسم رح اور ان کے بعد قاضی قادن رح مسند پر جلوہ افروز ہوئے ۔

شیخ محمود رح

قاضی قادن رح نے بوقتِ وفات دو بچے یادگار چھوڑے ان میں سے ایک شیخ محمود رح اور دوسرے شیخ آدم رح تھے ۔ شیخ محمود رح نے علم و فضل میں کمال حاصل کیا اور بہت جلد آپ کی شہرت رُہتک اور اس کے گرد و نواح میں پھیل گئی ۔

آپ کے دَور میں کچھ ایسے خارجی اسباب پیدا ہو گئے تھے جن کے پیشِ نظر آپ نے منصبِ قضاء کو خیر باد کہہ دیا اور اعمالِ سلطانیہ میں مشغول ہو کر سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی ۔ اس راہ میں اگرچہ آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ان تمام کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور قطعاً سپر انداز نہ ہوئے ۔ گویا شیخ محمود رح وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اُس روایت کی ابتداء کی جسے انتہاء تک پہنچا دینے کی سعادت حضرت امام محمد اسماعیل شہید رح کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی ۔

شیخ محمود رح نے آفریدہ نامی ایک نہایت عفت مآب اور شریف خاتون سے نکاح کیا جو کہ سونی پت کے سادات و اشراف میں سے ایک بڑے شریف اور نجیب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ۔ اس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام احمد رکھا گیا ۔

شیخ احمد رح

شیخ احمد رح نے بچپن ہی میں وطنِ مالوف کو خیر باد کہا اور رُہتک سے نکل کر حضرت شیخ عبدالغنی رح بن شیخ عبدالحکیم رح کی خدمت میں پہنچ گئے ۔ چونکہ آپ کی جبین سے ہونہاری و اقبال مندی اور رُشد و ہدایت کے آثار نمایاں تھے اس لیے شیخ عبدالغنی رح نے آپ کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی حتیٰ کہ اپنی ایک صاحبزادی بھی ان

کے حبالۂ عقد میں دے دی۔

کافی عرصہ تک شیخ کی خدمت میں رہنے کے بعد آپ دوبارہ رُہتک واپس آگئے اور آتے ہی یہاں قلعہ سے باہر ایک نہایت عالی شان عمارت تعمیر کرائی اور اپنے خاندان کے تمام قبائل کو یہاں جمع کر دیا۔

شیخ احمدؒ نے دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ ایک شیخ منصورؒ اور دوسرے شیخ حسینؒ۔ شیخ منصور نہایت متواضع اور خلیق تھے۔ آپ شجاعت و بہادری اور تحمل و وقار میں بھی بے مثل تھے۔ آپ نے اوّلاً اپنے ماموں شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنیؒ کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ ان کے بطن سے معظم اور اعظم دو بچے پیدا ہوئے تھے کہ راہی ملکِ عدم ہو گئیں۔ پھر آپ نے ثانیاً ایک اور عورت سے نکاح کیا اور اس کے بطن سے بھی عبدالغفور اور اسمٰعیل نامی دو بچے پیدا ہوئے۔

شیخ معظّم

شیخ منصورؒ کے چار صاحبزادوں میں سے شیخ معظّم نے بڑی ناموری حاصل کی۔ علم و فضل میں کمال کے علاوہ فنونِ حرب میں بھی آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی اور بقول مصنف "حیات ولی" شیخ معظمؒ کی تاریخی زندگی میں جو بات سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہے اور جس کی مثال ایشیائی دنیا میں بمشکل مل سکتی ہے یہ ہے کہ آپ شجاعت و بہادری میں عدیم المثال اور لاجواب تھے۔ آپ کی شجاعت و بہادری کے بہت سے واقعات کتبِ تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ اور نشاط انگیز واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا عبدالرحیم صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ معظّم کے والد شیخ منصورؒ کی ایک راجہ کے ساتھ معرکہ آرائی ہو گئی جس میں شیخ معظّم بھی شریک تھے۔ شیخ منصور نے اپنی فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا ایک حصّہ کی کمان تو آپ خود کر رہے تھے اور دوسرے کی قیادت کے فرائض شیخ معظمؒ کے سپرد تھے شیخ کی عمر اس وقت صرف بارہ برس تھی لیکن اس صغر سنی کے باوصف آپ نے جو شجاعت کے جوہر دکھائے وہ اپنی مثال آپ تھے۔

دورانِ جنگ دشمن نے چال چلی اور مشہور کر دیا کہ شیخ منصورؒ جامِ شہادت نوش کر گئے ہیں؛ چنانچہ دشمن کا تیر نشانہ مراد کو لگا اور مسلمانوں کی فوج منتشر ہونے لگ گئی مگر شیخ معظم

اس وحشتناک خبر کے سنتے ہی سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپنے لگے - ابراہیمی غیرت وحمیت کا مصفّٰی خون بے اختیار جوش میں آیا اور فاروقی غیظ و غضب کا جوش خون کی طرح رگوں میں دوڑ گیا - آپ نے اپنی بے دھڑک شجاعت اور بے خوف دلیری سے اسی وقت لشکرِ اسلام کے ساتھ بڑی خوفناکی کے ساتھ ایسا زبردست اور بیباکانہ حملہ کیا جسے عنادید کفار کی مجموعی طاقت بھی نہ روک سکی - ہزاروں کافر قتل ہوئے اور صدہا زخمی و گھائل تڑپتے رہے ۔

شیخ کا مصمّم ارادہ تھا کہ میں جب تک کافروں کے سپہ سالار کو تہہ تیغ نہ کرلوں گا اور لشکرِ کفار کے کُشتوں کے پُشتے نہ لگا دوں گا اپنی تلوار کو نیام میں نہیں کروں گا ؛ چنانچہ آپ نے اپنے ارادہ کی تکمیل کے لیے انتہائی شجاعت و سرفروشی کے ساتھ راجہ کے ہاتھی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی - ادھر سے راجہ کا وزیر جو کہ بڑا بہادر اور جنگجو تھا نیزہ لہراتا ہوا آگے بڑھا تاکہ راجہ کی طرف سے مدافعت کر کے منہ مانگا انعام حاصل کرے - وزیر نے بڑی چابکدستی سے شیخ پر نیزہ کا وار کرنا چاہا مگر شیخ نے پینترا بدل کر زہر میں بجھا ہوا تیر اس پھرتی سے وزیر کے پیوست کر دیا کہ وہ اس کے لیے پیامِ اجل ثابت ہوا بس پھر کیا تھا دشمن کے تمام لشکر نے مجتمع ہو کر شیخ کا محاصرہ کرلیا ادھر سے دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے اس شیرِ خدا نے بھی شجاعت و جوانمردی کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن بھی عش عش کر اٹھا حتّٰی کہ جب راجہ نے یہ منظر دیکھا تو اس نے بڑے زور سے پکار کر اپنے لشکر سے کہا کہ خبردار اس نوجوان کو کوئی آنچ نہ آنے پائے - اس کے بعد ہاتھی سے اُتر کر خود شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا پہلے تو اس نے آپ کی شجاعت و بسالت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے اور پھر اس نے استفسار کیا کہ اتنے زیادہ غیظ و غضب کا سبب کیا ہے ؟

آپ نے جواب دیا کہ میں نے سُنا ہے کہ میرے والد محترم تمہاری فوج کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر گئے ہیں تو میں نے عزم کرلیا ہے کہ یا تو میں بھی ان کے ساتھ جاملوں یا تمہارے لشکر میں سے کسی متنفس کو دنیا میں باقی نہ رہنے دوں - راجہ نے کہا کہ تمہارے والد کی شہادت کی خبر غلط ہے وہ دیکھو ان کا پرچم لہراتا ہوا نظر آ رہا ہے آپ نے جب دیکھا تو بڑی برق رفتاری کے ساتھ اپنے والد سے جا لپٹے ۔

آپ کے جانے کے بعد راجہ نے آپ کے والد کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ میں تمہارے

جانباز لختِ جگر کی شجاعت سے بہت متاثر ہوا ہوں لہٰذا اب میں آپ سے مزید جنگ نہیں چاہتا آپ صلح کی جو شرائط لکھ بھیجیں میں انہیں تسلیم کر لوں گا ؛ چنانچہ آپ کے والد نے جو شرائط لکھ بھیجیں اگرچہ وہ راجہ کے لیے ناقابلِ قبول تھیں مگر طوعاً و کرہاً اس نے انہیں تسلیم کر لیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ جس لشکر میں شیخ معظم ایسا عظیم المرتبت بہادر سپہ سالار ہو اسے شکست دینا ممکن نہیں۔

شیخ وجیہہ الدینؒ

شیخ معظمؒ کے تین صاحبزادے تھے شیخ جمال الدین، شیخ فیروز اور شیخ وجیہہ الدین۔ ان میں سے مؤخر الذکر جناب شیخ عبدالرحیمؒ کے والد ماجد اور شاہ ولی اللہ کے جدِ امجد ہیں۔ آپ بڑے تقویٰ شعار اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ ابتدائی زمانہ میں سلطنتِ مغلیہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے اور کسی بڑے معزز فوجی عہدہ پر فائز تھے۔ تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جب اسلامی فوجیں مخالفینِ اسلام کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتیں تو آپ پہلی صفوں میں نظر آتے مگر دورانِ سفر جب لشکر کے گھوڑے غریب کسانوں کی کھیتیوں کو روندتے اور پامال کرتے تو آپ کمال احتیاط کے پیشِ نظر لشکر سے الگ ہو جاتے اور اپنے گھوڑے کی باگ کھیتوں کی بجائے کسی اور طرف موڑ دیتے تھے۔

پورے خاندان میں کوئی شخص آپ سے زیادہ پُرمغز، عالی دماغ، حوصلہ مند، دقیق النظر، بردبار، خوش اخلاق، صائب الرائے، شجاع، فصیح و بلیغ اور عقیل و فیاض نہ تھا۔ امیرانہ شان و شوکت کے باوجود آپ انتہائی زیادہ منکسر المزاج تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ والد مرحوم خدام و ملازمین سے جس رحیمانہ برتاؤ اور نرمی و انصاف سے پیش آتے تھے اس کی مثال کہیں نہیں پائی جاتی۔ آپ میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ جب کبھی کسی معاملہ میں تقاضائے بشریت کے مطابق آپ سے غلطی ہو جاتی اور کوئی متنبہ کر دیتا تو آپ اسے فوراً تسلیم کر لیتے۔ لیکن آپ کے حالات میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات ہمیں یہ ملتی ہے کہ آپ کلامِ ربّانی کے ساتھ انتہاء سے زیادہ عشق رکھتے تھے سفر و حضر میں کلامِ الٰہی کو ہمیشہ پاس رکھتے بقول شاہ عبدالرحیمؒ دو پارے روزانہ تلاوت کرنا معمول تھا اور پھر تلاوت بھی بڑے تدبّر و تفکر کے ساتھ کرتے۔

آپ نے شاہجہان اور اورنگ زیب دونوں مغل بادشاہوں کا زمانہ پایا تھا اور ان کے دورِ حکومت میں لڑی جانے والی بہت سی جنگوں میں حصہ لیا۔ مالوہ کے نزدیک کے ایک ہندو

راجہ نے جب سرکشی کی اور شاہجہان نے اس کی سرکوبی کے لیے سید حسین کو متعین کیا تو آپ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ راجہ نے سید حسین کو دعوتِ مبارزت دی وہ فوراً تیار ہو گئے اور دونوں طرف سے نیزوں کے تابڑ توڑ وار ہونے لگے اور اس میں جب کسی کو کامیابی نہ ہوئی تو دونوں نے تلواروں سے مقابلہ شروع کر دیا۔ سید حسین کے حریف نے کچھ ایسی چابکدستی کا مظاہرہ کیا کہ چشم زدن میں اُس کی تلوار سید کے سر پہ پہنچ گئی انہوں نے اگرچہ بڑے استقلال اور تحمل سے تلوار کو سپر پہ لیا لیکن پھر بھی ضرب کاری تھی، سپر کو کاٹتی ہوئی دستہ تک جا پہنچی۔ حریف نے جب تلوار کو زور سے کھینچا تو سید گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ دشمن نے موقع کو غنیمت سمجھا اور دوڑ کر اس کے سینہ پر چڑھ دوڑا اور خنجر نکال کر ان کا کام تمام کرنا ہی چاہتا تھا کہ شیخ وجیہ الدین بجلی کی سی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے اور دشمن کو واصلِ جہنم کر دیا۔

اسی طرح اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بھائیوں کے درمیان جتنی معرکہ آرائیاں ہوئیں ان تمام میں شیخ وجیہ الدین نے عالمگیر کی طرف سے حصہ لیا۔[۵] ایک لڑائی میں شاہ شجاع نے ہاتھیوں کے ساتھ حملہ کیا۔ شاہ وجیہ الدین گھوڑے پر سوار تھے انہوں نے ہاتھیوں پر تلواروں کے پے در پے وار کیے حتیٰ کہ ایک ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی۔ اس نے درد و کرب کی وجہ سے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنی فوج کو ہی کچل ڈالا۔

آپ نے شیخ رفیع الدین محمد بن قطب العالم بن شیخ عبدالعزیز کی ایک دُختر نیک اختر سے نکاح کیا تھا اور اس کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے۔ شیخ ابوالرضا محمدؒ، شیخ عبدالحکیمؒ اور شیخ عبدالرحیمؒ۔ آپ کو شیخ عبدالرحیم سے بہت زیادہ محبت تھی۔ سفر و حضر میں اکثر انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے شاید اس کمالِ محبت کا نتیجہ ہے کہ شیخ عبدالرحیم کو وہ عالمگیر شہرت نصیب ہوئی، جس سے ان کے دوسرے دونوں بھائی محروم رہے۔ الغرض شیخ وجیہ الدین کے فضل و کمال روشن دماغی، صائب رائی، تدبیر و شجاعت، شوکت و ہیبت کی جہاں تک سچی تعریف مُشیّن اور وزنی الفاظ میں کی جائے کم ہے۔

شاہ عبدالرحیمؒ

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا شیخ وجیہ الدینؒ نے شیخ عبدالحکیمؒ، شیخ عبدالرحیمؒ اور شیخ ابوالرضا محمدؒ تین فرزند یادگار چھوڑے

شیخ عبدالکریمؒ کے سوانح حیات سے کتبِ تاریخ بالکل خاموش ہیں۔ شیخ عبدالرحیمؒ عمر میں اگرچہ شیخ ابوالرضا محمدؒ سے چھوٹے تھے تاہم زہد و اتقاء اور علم و فضل کے اعتبار سے ان سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ شیخ عبدالرحیمؒ وہی بزرگ ہیں جن کے لختِ جگر شاہ ولی اللہ نے آفتاب جہاں تاب بن کر اپنے علم و فضل کی ضیا پاشیوں سے دنیا کو بقعۂ نور بنا دیا۔

شاہ عبدالرحیم کی تاریخ ولادت کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۰۵۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اور یہ وہ دور تھا جس میں اورنگ زیب عالمگیر سریر آرائے سلطنت تھا اگرچہ آپ کے والد شیخ وجیہ الدین ایک ممتاز فوجی عہدے پر فائز تھے اور گھر میں ناز و نعمت کے تمام ساماں موجود تھے مگر یہ ناز برداریاں شیخ عبدالرحیمؒ کی طبیعت پر قطعاً اثر انداز نہ ہوئیں۔ آپ ہمیشہ درویش صفت ہی رہے۔

چار سال کی عمر میں آپ کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔ شیخ وجیہ الدین نے اپنے نونہال کو قرآن مجید کی تعلیم خود ہی دی۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ نے صرف و نحو اور ادب کی کتابیں پڑھ لیں نو، دس سال کی عمر میں 'شرح عقائد' اور 'حاشیہ خیالی' وغیرہ کا درس اپنے برادرِ اکبر شیخ ابوالرضا محمد سے لیا۔ آپ نے مرزا محمد زاہد ہرویؒ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ طے کیے اور ان سے 'شرح مواقف' اور تمام کلامی و اصولی کتابوں کا درس لیا۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ 'شرح مواقف' ایسی مشکل کتاب کے بھی کئی کئی صفحات ایک ہی نشست میں پڑھ لیتے تھے۔ غرضیکہ دس سال کی عمر میں آپ نے صرف، نحو، ادب، کلام، اصول، معقول وغیرہ تمام علوم کی تکمیل کر لی اور پھر گیارھویں سال فقہ و حدیث کی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ اور ان میں بھی کمال مہارت حاصل کر لی۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"میں اپنے والد بزرگوار کے علم کے آگے دنیا بھر کے علماء کے علوم کو بالکل ایسا دیکھتا ہوں جیسے دریا کے مقابلہ میں قطرہ"۔

شاہ عبدالرحیمؒ کی تصنیفات اور کتب فقہ و حدیث پر ان کے حواشی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے اس قول میں قطعاً مبالغہ نہیں۔

علومِ ظاہری میں تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی طرف توجہ دینی شروع کی اور اس غرض سے

حضرت خواجہ محمد باقی رح کے صاحبزادے حضرت خواجہ خرد رح کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر ان کے مشورہ سے سادات بارہہ کے خاندان کے چشم و چراغ اور بہت بڑے بزرگ سیّد عبداللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ ان کے علاوہ آپ نے خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی رح اور سیّد عظمت اللہ جیسے سلاطینِ علم و فضل سے اکتساب کیا اور ان سے بھی بیعت کی اجازت حاصل کی اور اسی اثنا میں آپ نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا سفر اختیار کر کے بہت سے اہل اللہ اور مجذوبوں سے ملاقات کا شرف حاصل کر کے روحانی مدارج طے کیے اور اس طرح شاہ عبدالرحیم رح کی شخصیت علومِ ظاہری و باطنی کا سنگم بن گئی۔ آپ کے کمالِ علم و فضل کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب اورنگ زیب رح نے 'فتاویٰ' کی ترتیب کا کام وقت کے بڑے بڑے علماء و فضلاء کے ذمہ لگایا تو آپ کو بھی مدعو کیا گیا اور معقول مشاہرہ کے علاوہ جاگیر کی بھی پیشکش کی گئی تو آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں والدہ کے اصرار کے پیشِ نظر اسے قبول کر لیا اور 'فتاویٰ' پر نظرِ ثانی کر کے اس کی بعض فقہی غلطیوں کی اصلاح کی۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جس طرح آپ نے شرک و بدعت کے خلاف تصنیف و تالیف اور وعظ و ارشاد سے جہاد کیا اسی طرح اس مقصد کے حصول کے لیے ایک عظیم الشان مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی جسے 'مدرسہ رحیمیہ' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس چشمۂ ہدایت سے بہت سے لوگوں نے کسبِ فیض کیا اور دُور دراز سے آ کر تشنگانِ علوم نے اپنی تشنگی کو تسکین بخشی۔

شیخ عبدالرحیم رح نے دو نکاح کیے۔ پہلا نکاح تو غالباً اس وقت کیا جب شیخ وجیہ الدین رح بقیدِ حیات تھے مگر افسوس کہ اس کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں اور آپ نے دوسرا نکاح شیخ محمد رح کی صاحبزادی سے کیا تھا۔ پہلی بیوی کے بطن سے ایک صاحبزادہ صلاح الدین رح پیدا ہوا تھا جو کہ عالمِ شباب میں فوت ہو گیا اور دوسری بیوی کے بطن سے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ دو قابلِ فخر فرزند تولد ہوئے۔ بالآخر ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ میں علم و عمل کا یہ آفتاب ستر سال تک ضیا پاشیوں کے بعد پوری دنیا کو سوگوار چھوڑتے ہوئے عہدِ فرخ سیر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دہلی کے افق پر غروب ہو گیا۔ نوراللہ مرقدہٗ۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

شاہ عبدالرحیمؒ نے ولی اللہ اور اہل اللہؒ دو صاحبزادے یادگار چھوڑے اوّل الذکر وہی شخصیت ہے جو دنیا میں عارف باللہ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اسم گرامی سے مشہور و معروف ہے اور جس کے علمی تبحر اور فضل و کمال کے پیشِ نظر اس خاندان کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔

ولادت

شاہ صاحبؒ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ چہارشنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت شیخ محمدؒ کی دختر فرخندہ اخترؒ کے بطن اطہر سے متولد ہوئے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے والد گرامی کو خواب میں بشارتیں دی گئی تھیں کہ تمہارے ہاں ایک ایسا فرزند جنم لے گا جو اپنے علم و فضل کی بدولت دنیا کے لیے سرچشمۂ ہدایت ثابت ہو گا۔

تعلیم و تربیت

شاہ عبدالرحیمؒ نے اپنے نونہال کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا یہی وجہ ہے کہ عہدِ طفولیت میں بھی آپ کی حالت بالکل غیر معمولی اور نرالی طرز کی تھی۔ تعلیم کے مراحل آپ نے بڑی سرعت کے ساتھ طے کر لیے تھے پانچویں سال میں مکتب میں بٹھایا گیا۔ ساتویں سال تک آپ نے قرآن مجید ختم کر لیا اور اس کے بعد فارسی کی درسی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا اور ایک سال سے قبل ہی اس نصاب کی تکمیل کر لی پھر آپ نے صرف و نحو کی کتابیں شروع کیں اور اس فن میں بھی بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔ بعد ازاں آپ کو معقول کی کتابیں شروع کرائی گئیں اور ان میں بھی آپ نے مہارت تامہ حاصل کر لی خصوصاً منطق میں تو آپ کا جواب ہی نہ تھا اسی دَور میں والد گرامی نے آپ کی شادی خانہ آبادی بھی کر دی۔

اب ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو تفسیر و حدیث کے علوم میں ترقی کرنا اور انہیں باقاعدہ حاصل کرنا چاہیئے کیونکہ حدیث میں کمال کے بغیر علوم کی تکمیل ناممکن ہے۔ چنانچہ پندرھویں سال میں دیگر کتابوں کے ساتھ آپ نے "تفسیر بیضاوی" کا بڑا حصہ اپنے والد بزرگوار سے پڑھ لیا۔ "تفسیر مدارک" کا کچھ حصہ بھی اپنے والد کو سنایا اور باقی کا خود مطالعہ کر لیا۔ اسی طرح کتب حدیث میں سے "مشکوٰۃ المصابیح" (باستثنائے کتاب البیوع و کتاب الآداب یہ حصے علالت کی وجہ سے نہ پڑھ سکے) "صحیح بخاری" (کتاب الطہارۃ تک۔ باقی کا خود مطالعہ کیا) اور "شمائل ترمذی" کو پڑھا۔ اپنے والد گرامی کے علاوہ آپ نے شیخ محمد افضل سیالکوٹیؒ، شیخ وفداللہ مکی بن شیخ محمد سلیمان مغربیؒ،

یشیخ ابوطاہر الکردی بن شیخ ابراہیم الکردی المدنی رحؒ جیسے علماء و فضلاء سے بھی "مؤطا امام مالک"، "صحیح بخاری"، "مؤطا امام محمد"، "کتاب الآثار" اور "مسند دارمی" وغیرہ کتبِ حدیث پڑھیں۔ یاد رہے کہ عربی مشائخ سے آپ نے حرمین شریفین کے قیام کے زمانہ میں استفادہ کیا تھا۔

سندِ فراغت

چودہ سال کی عمر میں جب آپ نے تمام مروّجہ علوم کی تکمیل کر لی۔ شاہ عبدالرحیم رحؒ نے آپ کو سندِ فراغت سے نوازنے کے موقع پر ایک خاص جلسہ منعقد کیا جس میں شہر کے تمام بڑے بڑے علماء، مشائخ، قضاۃ اور فقہاء کو مدعو کیا اور سب کی موجودگی میں اپنے بلند اقبال صاحبزادے کی دستار بندی کی اور آپ کے علم و عمر کی ترقی کے لیے دعا مانگی۔ مجلس میں موجود تمام علماء و فضلاء نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ شیخ کی خدمت میں مبارکباد پیش کی۔

تصوّف

پندرھویں سال میں قدم رکھا تو آپ کے والد ماجد نے علم باطن کے شرف سے بھی آپ کو معزز و ممتاز کرنا چاہا؛ چنانچہ آپ نے ان سے بعیت کی اور اشغال صوفیہ خصوصاً طریقہ نقشبندیہ میں اپنا زیادہ وقت صرف کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ والد صاحب کی زندگی ہی میں سلوک و عرفان کے اعلیٰ مدارج طے کر لیے اور اس علم کو بھی عروجِ کمال تک پہنچا دیا؛ چنانچہ انھوں نے آپ کو بعیت و ارشاد کی بھی اجازت دے دی۔ اور باطنی علوم کے متعلق مزید جو کچھ تلقین کرنا چاہا وہ بھی کر دیا۔

خداداد قابلیت

معاملہ فہمی اور رادق مسائل کے حل کرنے کے ملکۂ خصوصی سے بھی اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحبؒ کو نواز رکھا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی جگہ سے شاہ عبدالرحیمؒ کی خدمت میں ایک استفتاء آیا جس کا جواب دینے سے ہندوستان اور کئی دیگر ممالک کے بڑے بڑے علماء قاصر تھے کیونکہ بہت زیادہ الجھاؤ اور پیچیدگی کے سبب کوئی اس کا مفہوم ہی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ شاہ عبدالرحیمؒ کے ایک شاگرد نہایت ذہین و فطین اور حدیث و فقہ کے ماہر تھے شاہ صاحب نے فتویٰ ان کے سپرد کیا اور فرمایا کہ خوب سوچ سمجھ کر اس کا جواب لکھ دو۔ اسؔ نے مسلسل ایک مہینہ تک اس فتویٰ کا نہایت غور و فکر سے مطالعہ کیا لیکن وہ بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہی رہا اور جواب لکھنے سے معذرت کر دی۔

شاہ ولی اللہ کی عمر اس وقت کوئی سولہ برس ہوگی شاہ عبد الرحیمؒ نے فتویٰ ان کے سپرد کیا اور فرمایا امید ہے کہ تم اس کا جواب لکھ سکو گے۔ شاہ صاحبؒ نے فتویٰ لے لیا اور گھر آکر اس کا جواب لکھ دیا۔

. . . . جواب اس قدر صواب اور شافی تھا کہ شاہ عبد الرحیمؒ اور تمام طلبہ نے تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیئے اور امید ظاہر کی کہ اگر شاہ ولی اللہؒ چند روز اور علمی مشق اور تعلیمی مشاغل جاری رکھیں تو تمام ائمہ وقت اور فقہائے عصر پر فوقیت لے جائیں گے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تدریس شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد صاحب کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کیا اور پورے بارہ سال تک استغراق و محویت کے ساتھ مشغول رہے۔ آپ کی خداداد قابلیت اور علم و فضل میں کمال کے پیش نظر تشنگان علوم دُور دراز کی مسافت کو طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضری دیتے اور اسے اپنے لیے سرمایہ عز و افتخار سمجھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ بھی تمام طلبہ کے ساتھ حسنِ اخلاق اور فیاضی سے پیش آتے اور تمام کے ساتھ رحیمانہ و شفیقانہ برتاؤ کرتے تھے۔

حج بیت اللہ ۱۱۴۳ھ کے آخر میں آپ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور مکمل ایک سال حرمین شریفین میں بسر کیا۔ اسی اثناء میں آپ نے نامور مشائخ عرب سے روایتِ حدیث کی۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء سے ملے اور ہر طبقہ کے مشائخ سے استفادہ کیا۔ ان میں سے شیخ محمد وفد اللہ بن شیخ محمد سلیمان المغربیؒ، شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردیؒ مدنی، شیخ تاج الدین قلعی حنفی، شیخ شناویؒ، شیخ احمد قشاشیؒ، سید عبد الرحمٰن ادریسیؒ، شیخ شمس الدین محمد بن علاء بابلیؒ، شیخ عیسیٰ جعفری مغربیؒ، شیخ ابراہیم کردی مدنیؒ، شیخ حسن عجمیؒ، شیخ احمد نخلیؒ اور شیخ عبد اللہ بن سالم البصریؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[۱]

۱۱۴۵ھ میں آپ کو دوبارہ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور پھر دہلی کے مدرسہ رحیمیہ کی مسندِ تدریس پر جلوہ افروز ہو گئے اسی طرح عمر کی باقی اکتیس بہاریں بھی نشر و اشاعتِ دین، مسلمانوں کی اصلاح اور انکی خدمات کی نذر کر دیں۔

مذہب آپ مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے والدِ ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی طرح آپ کا معمول بھی یہ تھا کہ اس مسئلہ پر عمل کرتے جو تمام اہلِ مذاہب کے نزدیک متفقہ طور پر صحیح ہوتا اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو پھر اس مذہب پر عمل پیرا ہوتے جو دلیل کی رو سے زیادہ قوی اور صریح حدیث کے موافق ہوتا۔ خواجہ محمد امین نے آپ سے سوال کیا تھا مسائل فقہیہ میں آپ کس مذہب کے مطابق عمل کرتے ہیں تو شاہ صاحبؒ نے درجِ ذیل جواب تحریر کیا تھا:۔

"سوال سوم آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ بر کدام مذہب است گفتم بقدر امکان جمع میکنم در مذاہب مشہورہ مثلاً صوم و صلوٰۃ و وضو و غسل و حج بوضع واقع میشود کہ ہمہ اہلِ مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل مے نمائم وخدائے تعالیٰ ایں قدر علم دادہ است کہ فرق درمیان ضعیف و قوی کردہ شود و در فتویٰ بحالِ مستفتی کار می کنم مقلد ہر مذہبے کہ باشد او را از ہماں مذہب جواب میگویم خدا تعالیٰ بھر مذہبے از مذاہبِ مشہورہ معرفت دادہ است الحمد للہ تعالیٰ۔"

تمہارا تیسرا سوال کہ مسائل فقہیہ میں کس مذہب پر عمل کرتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ممکن حد تک مذاہبِ مشہورہ میں جمع کرتا ہوں مثلاً روزہ، نماز، وضو، غسل اور حج کے وہ مسائل جنہیں تمام اہلِ مذاہب صحیح سمجھتے ہیں، ان پر عمل کرتا ہوں لیکن جب یہ جمع و تطبیق مشکل ہو تو میں اس مذہب پر عمل کرتا ہوں جو دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی اور حدیثِ صریح کے موافق ہو کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس قدر علم سے نوازا ہے کہ ضعیف و قوی میں بخوبی فرق اور فتویٰ کے متعلق مستفتی کے حال کی اچھی طرح رعایت کر سکتا ہوں اور ہر مقلد مذہب کو اسی کے مذہب سے جواب دیتا ہوں مجھے خدا تعالیٰ نے مذاہبِ مشہورہ میں سے ہر مذہب کی معرفت عنایت فرمائی ہے الحمد للہ تعالیٰ

اسی طرح "تقلید اور عمل بالحدیث" کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے اپنے جن افکار و نظریات کا اظہار "حجۃ اللہ البالغہ" کے مبحث سابع، "عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید"، "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اور اپنی دیگر تصانیف میں کیا ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔

ترجمہ قرآن

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دینی خدمات میں سب سے زیادہ وزنی شاید یہ ہے کہ آپ نے دَورِ جدید میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہ ترجمہ وقت کے تقاضا کے مطابق فارسی زبان میں تھا۔ اگرچہ مولانا دولت آبادی نے بھی شیر شاہ سوری[۱] کے عہد میں قرآن مجید کا بزبانِ فارسی ترجمہ کیا تھا بلکہ اس سے قبل بھی کئی ہندی اور فارسی ترجموں کا سراغ ملتا ہے مثلاً ۸۸۳ھ میں ایک ہندو راجہ مہروک نے جو کہ کشمیر اور پنجاب پر حکمران تھا منصورہ (سندھ) کے مسلمان حاکم عبداللہ بن عمر سے درخواست کی تھی کہ وہ قرآن پاک کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے لہذا اس کے لیے قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کر دیا جائے۔ عبداللہ بن عمر نے یہ ذمہ داری ایک عراقی نوجوان کو سپرد کی لیکن افسوس کہ وہ سورہ یٰسین سے آگے نہ بڑھ سکا البتہ ہندو راجہ اتنے حصّہ کے مطالعہ سے ہی مشرف بہ اسلام ہو گیا بقول مولانا سید محمد علی مونگیری مصنف "ارشادِ رحمانی" سولھویں صدی میں بھی قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ ہوا۔ اسی طرح چوتھی یا پانچویں صدی میں بھی ایک فارسی ترجمہ کا سراغ ملتا ہے لیکن یہ تمام ترجمے ناپید تھے۔ لہذا اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ قرآن مجید کا ملکی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ محض بلا سوچے سمجھے عربی متن تلاوت کرنے والے عربی سے ناواقف عوام قرآن حکیم کے مفہوم کو بھی سمجھ سکیں۔ اس سلسلہ میں آپ کو جن مشکلات اور خطرات سے دوچار ہونا پڑا مرزا حیرت کی زبانی اس کی تفصیل سنیئے۔

> "قرآن عموماً رمضان میں یا یوں ہی معمولی طور پر مسلمان پڑھتے تھے لیکن بے چارے معنی نہ جاننے کی وجہ سے خدا کے احکام سے محض نابلد تھے۔ کٹ ملانوں نے یہ سمجھا دیا تھا کہ قرآن شریف کے معنی پڑھنے گناہ مول لینا ہے جب ولی اللہ صاحبؒ نے فارسی میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت ہوئی تو ایک تہلکہ عظیم کٹ ملانوں کے گروہ میں پایا گیا اور علاوہ کفر کے فتوے دینے کے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جانی دشمن ہو گئے اور اب ان میں مشورے ہونے لگے کہ شاہ صاحب کو کیوں کر قتل کیا جائے؛ چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ عصر کی نماز فتحپوری میں پڑھ رہے تھے اور آپ گویا محمدیوں کی

"جماعت کے امام تھے ابھی آپ نے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازوں پر غل وشور کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور لوگ کچھ غیر معمولی طور پر غیر شیر کرتے ہوئے معلوم ہوئے۔ جب شاہ صاحب کو بہ تحقیق معلوم ہوگیا کہ یہ میرے قتل کے لیے نرغہ کرکے آئے ہیں تو انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا تم جان بچاکر چلے جاؤ اور مجھے ان مفسدوں کے ہاتھوں شہید ہونے دو۔"[۱۳]

لیکن شاہ صاحبؒ کے رفقاء اور عقیدت مندوں نے آپ کو بالکل علیحدہ نہ چھوڑا اور وہ سب تلواریں لے کر مقابلہ کرنے پر تیار ہوگئے ان کے جوش وخروش کو دیکھ کر کٹ ملانوں اور ان کے ساتھی بدمعاشوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ شاہ صاحبؒ نے بھی فاروقی جلال کا مظاہرہ کیا اور جوشِ ایمانی کے ساتھ بآواز بلند نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے مسجد سے نکلے اور کسی مفسد کو آپ کی طرف نظر بد اٹھاکر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

اس ترجمہ میں آپ نے کن امور کو ملحوظِ خاطر رکھا اور ترجمہ سے مقصود کیا تھا۔ یہ آپ نے مقدمہ قرآن میں خود ہی بیان فرمایا ہے ذیل میں ہم اس کی اردو میں تلخیص پیش کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کتاب فن ترجمہ قرآن کے متعلق ہے۔ ہم نے عربی کے منظم اور مدلل مضمون کو بزبانِ فارسی ادا کیا ہے اس طریقہ سے کہ نحوی رعایت بھی ہو اور بلحاظِ تقدیم بھی (جہاں تک مناسب ہو) حذف کیے گئے مضمون کا اظہار بھی ہو اور ترتیبِ الفاظ میں ترجمہ کی زبان عبارتِ قرآن سے موافقت بھی رکھتی ہو البتہ وہ مقامات مستثنیٰ ہیں جہاں دونوں زبانوں کے اختلافِ مزاج کے باعث لفظی رکاکت یا تعقید کا پیدا ہونا لازم آتا ہو۔ ضروری حد تک اسبابِ نزول کو بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح مشکل مقامات کی وضاحت بھی صرف ضروری حد تک کی گئی ہے۔

ترجمہ قرآن کی تیاری متنِ قرآن اور مختصر فارسی رسائل کے مطالعہ کے بعد کی گئی ہے تاکہ فارسی زبان کی عبارت دستکاروں اور سپاہیوں کے بچوں تک کی سمجھ میں آجائے کیونکہ ان کے متعلق امید نہیں کہ وہ علومِ عربیہ کی تکمیل کریں گے۔ اور سنِ شعور سنبھالنے کے بعد ان لوگوں کو اس کتاب کی تعلیم دینی چاہیئے تاکہ پہلی چیز جو ان کے سینوں میں راسخ ہو وہ کتاب اللہ کے

مضامین ہوں تاکہ ان کی سلامتِ فطری ضائع نہ ہو اور دہریوں اور ملحدوں کی باتیں ان کو فریفتہ نہ کر سکیں جو کہ اکثر تصوف کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کتاب میں ان امور کے متعلق جن کا تعلق "نقل" سے ہے صرف صحیح ترین تفاسیر محدثین بخاری و ترمذی سے مدد لی گئی ہے اور حتی الامکان ضعیف روایات یا موضوع قصوں سے اجتناب کیا گیا ہے اور ان "اسرائیلیات" سے بھی پرہیز کیا گیا ہے جو صرف اہلِ کتاب سے منقول ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں کوئی روایت نہیں۔

دیگر تصانیف :-

"فتح الرحمان" یعنی ترجمہ قرآن کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے اور بھی بہت سے علوم و فنون پر عربی و فارسی میں بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ یہ کتابیں کیا ہیں علم و ادب کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بحرِ ناپیداکنار ہیں۔ ان پر تفصیلی تبصرہ کا تو یہ موقع نہیں مختصر سی کیفیت کے ساتھ ان میں سے مطبوع کے اسماء ذکر کر دینے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے :-

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	فن	مختصر کیفیت
۱	الفوز الکبیر	عربی	اصول تفسیر	اصول تفسیر میں مختصر مگر جامع رسالہ ہے
۲	فتح الخبیر		"	یہ الفوز الکبیر کا دوسرا حصہ ہے مگر مصنف نے اس کا نام علیحدہ تجویز کیا
۳	المصفّٰی فی شرح الموطا	فارسی	حدیث	مؤطا امام مالکؒ کی بہترین شرح ہے جس کے مطالعہ سے حدیث و فقہ میں کمال اور استخراجِ مسائل میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔
۴	المسوّی فی احادیث الموطا	عربی		یہ بھی مؤطا کی ایک بے نظیر اور قابلِ قدر شرح ہے۔ ابتداءً المصفّٰی کے حاشیہ پر چھپی لیکن بعد میں علیحدہ بھی شائع ہو گئی ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	فن	مختصر کیفیت
۵	حجۃ اللہ البالغہ	عربی	اسرارِ شریعت	اسرارِ حدیث اور مصالحِ احکام ایسے دلنشیں انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ اس کی مثال متقدمین کے ہاں ملنی بھی مشکل ہے حکمت، حدیث، فقہ، تصوف، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ بہت سے علوم اس کتاب میں ہیں۔
۶	تراجم البخاری	عربی	حدیث	یہ صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی شرح ہے۔
۷	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف	عربی	فقہ الحدیث	اس کتاب میں وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے اقوالِ فقہاء کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ کتاب و سنت کے مقابلہ میں امام کی تقلید حرام ہے۔
۸	عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید	عربی	فقہ الحدیث	اس مختصر رسالہ کا موضوع بھی اجتہاد و تقلید ہے۔
۹	ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	عربی	خلافت صحابہ	اس میں خلفاء اربعہ کی خلافت کے متعلق محققانہ بحث ہے۔
۱۰	قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین	”	”	اس میں نقلی و عقلی دلائل سے حضرات شیخین جناب ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی افضلیت ثابت کی گئی ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	فن	مختصر کیفیت
۱۱	فیوض الحرمین	عربی	تصوف	اس رسالہ میں حرمین کے واقعات کے علاوہ تصوف کے بہت سے مبحث آ گئے ہیں۔
۱۲	الطاف القدس	فارسی	تصوف	اس میں شاہ صاحبؒ نے اپنے الہامات کو ذکر کیا ہے۔
۱۳	الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم	عربی	تصوف	اس میں شاہ صاحبؒ نے اپنے والد بزرگوار اور عم محترم شیخ ابو الرضا محمد کے وہ واقعات لکھے ہیں جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح مبارک سے حاصل کیے۔
۱۴	تأویل الاحادیث	عربی	تاریخ انبیاءؑ	اس میں حضرت آدم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ان انبیاء کرام کے حالات بیان کیے گئے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے
۱۵	انفاس العارفین	فارسی	تاریخ	اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے اپنے والد صاحب، عم بزرگوار شیخ ابو الرضا محمد اور دیگر اجدادِ عظام کے حالات شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔
۱۶	شرح رباعیتین	〃	تصوف	یہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی دو رباعیوں کی نہایت عمدہ شرح ہے۔
۱۷	المجیب المنعم فی مدح سید العرب والعجم			جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ ایک بڑا قصیدہ ہے

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	فن	مختصر کیفیت
۱۸	الجیب المنعم فی مدح سید العرب والعجم	فارسی	تصوّف	جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ ایک
۱۹	سطعات	"	"	اس رسالہ میں اسم الٰہی، اصطلاحات صوفیہ اور تصوّف کے بہت سے موز وارشادات کی تشریح ہے
۲۰	انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ	"	"	اس میں اولیاء اللہ کے حالات و واقعات مذکور ہیں۔
۲۱	چہل حدیث	عربی	حدیث	جامع قسم کی چالیس حدیث کا مجموعہ ہے۔
۲۲	ہوامع شرح حزب البحر	فارسی	ادعیہ	دعاء حزب البحر کی نہایت عمدہ شرح ہے۔
۲۳	حسن العقیدہ	عربی	عقائد	
۲۴	سرور المحزون	فارسی	"	
۲۵	القول الجمیل	عربی	تصوف	
۲۶	الارشاد الی مہمات الاسناد	"	علم اسناد	
۲۷	فیما یجب حفظہ للناظر	"	علم حدیث	
۲۸	انسان العین فی مشائخ الحرمین	فارسی	تاریخ	
۲۹	الامداد فی مآثر الاجداد	"	"	اپنے خاندان کے حالات
۳۰	نبذۃ الابریزیہ فی اللجنۃ العزیزیہ	"	"	" " " "
۳۱	العطیۃ الصمدۃ فی الانفاس المحمدیۃ	عربی	تصوف	
۳۲	مکتوبات مع فضائل ابی عبداللہ البخاریؒ وفضائل شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ	فارسی	سیرت	بعض ایڈیشنوں سے فضائل ابن تیمیہؒ کا حصہ نکال دیا گیا ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	فن	مختصر کیفیت
۳۳	وصیت نامہ	"	وصیت	
۳۴	فیضِ عام	"	متفرقات	
۳۵	مکتوبات	"	تصوف	
۳۶	مکتوب مدنی	"	"	
۳۷	ہمعات	"	"	
۳۸	لمعات	"	"	
۳۹	خیرِ کثیر	"	"	
۴۰	شفاء القلوب	"	"	
۴۱	البدور البازغہ	"	"	
۴۲	زہراوین	"	"	
۴۳	تفہیمات			
۴۴	انتباہ فی اسناد حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	عربی	علمِ حدیث	
۴۵	المقدمہ السنیۃ	"	عقائد	
۴۶	المقالۃ الوضیۃ	"	وصیت	
۴۷	فتح الودود و معرفۃ الجنود	"	علم الخلائق	
۴۸	مسلسلات	"	علم اسناد	
۴۹	عوارف	"	تصوف	
۵۰	مکاتیب	"	علم الانشاء	

سیاسی خدمات

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رح ایک بہت بڑے عالمِ دین، نامور مفکرؒ، عظیم روحانی پیشوا، بلند پایہ محقق و مصنف اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ پوری زندگی تدریس تحریر اور تبلیغ کے ذریعہ خدمتِ دین میں بسر کر دی ان اوصاف کے ساتھ ساتھ آپ ایک بلند پایہ سیاسی مدبر بھی تھے۔

آپ کے دَور میں ہندوستان پر انحطاط و ادبار کی نحوستیں چھائی ہوئی تھیں ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا اور دہلی میں خون کی ندیاں بہا دیں اس خوں ریزی میں مرنے والوں کا اندازہ آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ کے درمیان ہے۔ خزانہ شاہی سے بائیس کروڑ روپیہ، نوّے کروڑ کے جواہرات اور تختِ طاؤس وغیرہ کو لوٹ لیا گیا اور عوام سے لوٹی گئی دولت کا اندازہ بھی ستر اسّی کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں اس حملہ کی وجہ سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ملک کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور یاد رہے کہ شیرازہ ملک کے انتشار کی ابتداء تو اس سے بھی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی ارکانِ سلطنت ایرانی و تورانی اور شیعہ و سنی کش مکش میں مبتلا ہو کر خانہ جنگی کا شکار ہو گئے تھے۔ غرضیکہ حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشیوں، اپنوں کی غداریوں اور غیروں کی سازشوں کی وجہ سے ملک و ملت کی حالت نہایت ابتر تھی اندریں صورتِ حال شاہ ولی اللہ رح نے جو سیاسی خدمات سرانجام دیں وہ نہایت قابلِ قدر ہیں۔

ایک طرف تو آپ نے سیاسیات اور نظامِ حکومت کے اصول و قواعد کتاب و سنت کی روشنی میں اپنی تصنیفات خصوصاً "حجۃ اللہ البالغہ" میں بیان فرماتے اور ساتھ ہی اقتصادی تباہ حالیوں اور دیگر بربادیوں سے نجات کے طریقے بتاتے اور دوسری طرف یہ آپ کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے جب سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے خطرناک عزائم کا اندازہ لگا لیا تو آپ نے نواب نجیب الدولہ، نواب نظام الملک آصف جاہ، حافظ رحمت خاں اور احمد شاہ ابدالی وغیرہ مسلمان حکمرانوں کو انتہائی پُر از تاثیر مکتوبات لکھ کر اس

صورتِ حال سے مطلع کیا۔ شاہ صاحبؒ کے ان مکتوبات کو پروفیسر خلیق نظامی نے "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" کے نام سے شائع کردیا ہے۔

وفات

اسلام کے اس بطلِ جلیل، عظیم مفکر، نامور روحانی پیشوا اور مجددِ علوم و فنون نے ساری زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں بسر کرنے کے بعد تریسٹھ برس کی عمر میں خفیف سے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی اور شاہجہان آباد کے جنوبی جانب پرانی دلی میں اپنے والدِ مرحوم کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ تاریخ وفات اس مصرعے سے نکلتی ہے ؎

امامِ عہد بود امامِ اعظمِ دیں

آپ نے شاہ محمدؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ، چار فرزندانِ گرامی یادگار چھوڑے۔ اب ہم آخر میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اس خراجِ تحسین کو ذکر کر کے آپ کے ذکرِ خیر کو ختم کرتے ہیں جو انہوں نے آپ کے حضور پیش کیا ہے، فرماتے ہیں :-

"........ پھر بارہویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہورِ علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چکی تھی، پھر بھی کھیتوں کی سبزی اور چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ ۱۲ ویں صدی کے تمام کاروبارِ علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں سر برآوردہ ہوئے بعض بڑے بڑے سلاسلِ درس و تدریس کی بنیادیں اسی عہد میں استوار ہوئیں جیسے خاندانِ مشہورِ فرنگی محل اور ہندوستان سے باہر بلادِ عربیہ و عثمانیہ میں اکثر مشاہیرِ علم و ارشاد جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی نجدی، سید عبدالقادر کوکبانی شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، شیخ عبدالخالق زبیدی، علامہ فانی صاحب "ایقاظ"، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہ کہ شاہراہِ عام سے اپنی الگ راہ رکھتے تھے اور حقیقتِ مستورہ کے شناسا و حق آگاہ

تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورِ آخر کے "فاتح" اور "سلطانِ عصر" ہونے کا مقام تھا اور "قطبیتِ وقت" کا وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کے لیے تھا اور لوگ بھی بیکار نہ تھے کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لیے تھا ؎

فیضیؔ احسنت ازیں عشق کہ دوران امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را!

"تفہیمات" میں اسی معاملہ کے معارف لکھتے ہوئے کہیں تو اپنی طرف بیگانہ وار اشارہ کرجاتے ہیں، کہیں کہیں جوشش قلبی کی بے اختیاریوں میں صاف صاف لکھ گئے ہیں چنانچہ اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"برسرم در دادند کہ ایں حقیقت بمردم برساں کہ امروز وقتِ تست و زماں زمانِ تو وائے بر کسے کہ زیر لوائے تو نہ باشد"

ایک اور تفہیم میں یہ کیفیت زیادہ سرمستی کے ساتھ کھلی ہے:۔

"فھمنی ربی انا جعلنٰك امام ھذہ الطریقۃ وسددنا طرق الوصول الیٰ حقیقۃ القرب کلھا الیوم غیر الطریقۃ الواحدۃ وھو محبتك والانقیاد لك والسمأ لیس علیٰ من عاداك بسمأ ولیست الأرض علیہ بارض فاھل الشرق والغرب کلھم رعیتك وانت سلطانھم علموا اولو یعلموا فان علموا فازوا وان جھلوا خابوا".........

اس باب میں ان کے اشارات بے شمار ہیں علی الخصوص تفہیمات میں کہ متعدد رسائل ومقامات اسی مقام کی شرح وتحقیق میں لکھے ہیں اور ان سب کے آخر میں ذوقِ باطن کے التہاب واضطراب سے بے خود ہو کر اپنے معاملات کی طرف بھی اشارہ کرجاتے ہیں گویا ابوالعلاّ ی کا یہ شعر جابجا نئے نئے پیرایوں میں ان کی زبانِ مترنم اور کلکِ تحدیث تک آ آکر رہ جاتا ہے ؎

وانی ان کنت الاخیر زمانۂ

لآت بمالم تستطعہ الاوائل

شاہ محمد بن ولی اللہؒ

حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب کے حالات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے رحلت فرمائی تو پانچ صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ ان میں سب سے بڑے حضرت شاہ محمدؒ تھے۔ آپ اپنے دیگر بھائیوں کی طرح مشہور و معروف نہیں ہیں شاید اسی وجہ سے اکثر و بیشتر تذکرہ نگاروں نے آپ کا ذکر خیر ہی نہیں کیا۔ آپ بہت زیادہ صاحبِ علم اور صوفی صافی بزرگ تھے۔ ولادت ونشأت دہلی میں ہوئی۔ تمام علم اپنے والد گرامی سے پڑھا۔ جب تک وہ بقید حیات تھے آپ ان کے پاس رہے۔ ان کی وفات کے بعد بڑھانہ منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ ۱۲۰۸ھ میں دنیا فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ بڑھانہ کی جامع کبیر میں آپ کا مدفن[۱۵] ہے۔

شاہ عبد العزیزؒ

آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے نامور صاحبزادے ہیں۔ ۱۱۵۹ھ میں ولادت باسعادت ہوئی۔ تاریخی نام "غلام حلیم" تھا۔ خاندانی روایت کے مطابق نہایت ذہین فطین، سلیم الطبع خوش فہم اور طباع تھے۔ پانچ سال کی عمر میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا پھر فارسی کی ابتدائی درسی کتابوں کو پڑھا اور صرف و نحو کی کچھ کتابیں بھی پڑھ لیں۔ قدرت کی طرف سے ذہن رسا پایا۔ سرسید نے لکھا ہے کہ :-

"بارہا اتفاق ہوا کہ کتب غیر مشہورہ کی اکثر عبارات طویل اپنی یاد کے اعتماد پر طلباء کو لکھوا دیں، اور جب اتفاقاً وہ کتابیں دستیاب ہوئیں تو دیکھا گیا کہ جو عبارت آپ نے لکھوا دی تھی اس میں من وعن کا فرق نہ تھا"[۱۶]

گیارہ سال کی عمر میں آپ کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا اور تیرہ سال کی عمر تک آپ نے فقہ، اصول، صرف، نحو، منطق، عقائد، کلام، ہندسہ، ہیئت اور ریاضی وغیرہ بہت سے علوم میں کامل مہارت حاصل کر لی اور ساتھ ہی کتب تفسیر و حدیث کو بھی پڑھا

جب حضرت شاہ ولی اللہ رح کا انتقال ہوا اس وقت آپ سولہ برس کے تھے اگرچہ ان مذکورہ علوم میں مہارت حاصل کر کے اس وقت تک فارغ ہو چکے تھے تاہم علمی تشنگی کی مزید تسکین کے لیے آپ نے اپنے والد کی وفات کے بعد شیخ نور اللہ بڑھانوی رح شیخ محمد امین کشمیری رح اور شیخ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی رح سے بھی کسب فیض کیا۔ یاد رہے یہ تینوں بزرگ شاہ ولی اللہ رح کے جلیل القدر رفقاء میں سے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کا ایک مستقل رسالہ بھی ہے جس میں آپ نے جو اپنے والد گرامی سے پڑھا اور جو دیگر علماء سے پڑھا ہر ایک کی تفصیل بیان کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

"میں نے "مؤطا"، "مشکوٰۃ المصابیح" اور دیگر کتب حدیث کو مکمل طور پر اپنے والد صاحب سے پڑھا۔ "حصن حصین" اور "شمائل ترمذی" کی قرأت برادرم شیخ محمد نے کی اور میں نے سماع کیا۔ "جامع ترمذی"، "سنن ابی داؤد"، کی قرأت مولوی ظہور اللہ مراد آبادی نے اور سماعت میں نے کی۔ "مقدمہ صحیح مسلم" اور کچھ احادیث "اور سنن ابن ماجہ" کے کچھ حصوں کی قرأت محمد جواد پھلتی نے اور سماعت میں نے کی "مسلسلات" "جامع الاصول" کے کچھ اجزاء "اور سنن نسائی" کے کچھ حصوں کی قرأت مولوی حاد اللہ نے اور سماعت میں نے کی۔ "اور سنن نسائی" کا بقیہ اور دیگر کتب صحاح میں نے شیخ نور اللہ اور خواجہ محمد امین سے پڑھیں اور ان کے علاوہ دیگر کتب کی سند اجازت میں نے اپنے والد کے افضل ترین خلیفہ شیخ محمد عاشق پھلتی سے حاصل کی۔ اور ان تینوں بزرگوں نے میرے والد صاحب سے پڑھا تھا۔ یاد رہے کہ شیخ محمد عاشق تو شیخ ابو طاہر مدنی سے پڑھنے میں میرے والد مرحوم کے شریک بھی رہے تھے جیسا کہ آپ کی اسانید "الارشاد فی مہمات الاسناد" اور دیگر کتابوں میں مذکور ہیں۔"

والد مرحوم کی وفات کے بعد آپ ان کی مسند پر فائز ہوتے اور اسے چار چاند

لگا دیئے ۔ نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ حدیث اور دیگر مروجہ علوم کا درس دیتے کہ تشنگانِ علوم دیوانہ وار دور دراز سے کھنچے چلے آتے اور آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کو باعثِ فخر سمجھتے تھے ۔ آپ بھی طلبہ کے ساتھ شفقت اور حسنِ اخلاق سے پیش آتے تھے ۔ غرضیکہ وہ عظیم درسگاہ ، شاہ عبدالرحیمؒ نے جس کا سنگ بنیاد رکھا اور شاہ ولی اللہؒ نے جسے عروج پر پہنچا دیا تھا آپ نے اس کے وقار میں سرِ مو فرق نہ آنے دیا ؛ چنانچہ صاحبِ اتحاف فرماتے ہیں :-

جناب شاہ عبدالعزیزؒ صاحب اپنے وقت کے نہایت زبردست عالم تھے ۔ اس زمانہ کے تمام علماء و مشائخ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے اور بڑے بڑے فضلاء آپ کی خدمتِ تلمذ پر بے حد فخر کیا کرتے تھے ۔ آپ کا علوم متداولہ وغیرہ میں وہ پایہ تھا جو بیان میں نہیں آسکتا ۔ کثرتِ حفظ ، علم تعبیر رؤیا ، سلیقۂ وعظ ، انشاء پردازی ، تحقیق نفاست علوم میں تمام ہمعصروں میں امتیازی نگاہوں سے دیکھے جاتے اور مخالفین اسلام کو ایسی سنجیدگی و متانت سے دندان شکن جواب دیتے تھے کہ وہ ہونٹ چاٹتے رہ جاتے تھے آپ کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا جس کا مخالف و موافق پر برابر اور یکساں اثر پڑتا تھا ۔ آپ کی شیوا بیانی اور سلجھی ہوئی تقریر کی تمام ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی اور یہ بات تمام لوگوں میں مشہور تھی کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے وہ طرزِ بیان اختیار کی ہے کہ ان کی مجلسِ وعظ سے ہر مذہب و ملت کا شخص خوش ہو کر اٹھتا ہے متعصب اور ہٹ دھرم لوگ بھی آپ کی بات بلا تردد تسلیم کرتے اور حسنِ تقریر کے آگے فوراً اطاعت کی گردنیں جھکا دیتے ہیں موافق تو موافق مخالف کے دل میں بھی آپ کا بے انتہا وقار و احترام تھا آپ نے اپنی عمر کا سارا حصہ طلبا کی تدریس ، مریدوں کی ارشاد و تلقین ، طالب العلموں کی تکمیل ، وعظ و نصیحت اور فصلِ خصومات میں صرف کیا ۔ آپ ظاہری جاہ و عزت ، صوری احترام و تمکنت ، باطنی کمالات کے ساتھ فراہم رکھتے تھے ۔ غرضیکہ تقدس مذہبی کے علاوہ دنیاوی اعزاز میں کوئی مرتبہ ایسا نہ تھا جو فیاضِ ازل نے آپ سے

دریغ رکھا ہو۔ آپ کی شاگردی پر بڑے بڑے فضلاء کو فخر ہے اور آپ کی ترتیب دی ہوئی کتابوں پر علمائے فحول کو بہت کچھ اعتماد و بھروسہ ہے۔ الحاصل جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کا واجب الاحترام خاندان علوم حدیث اور فقہ کا مخزن اور رسمی فنون کا سرچشمہ ہے۔ اس مقدس و شریف علم کی خدمت جس قدر اس اہل بیت سے وجود پذیر ہوئی ہے ہندوستان میں کیا دوسری ولایتوں میں بھی کسی خاندان کی نسبت نہیں سنی گئی۔

درحقیقت عمل بالحدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور ناقابل زمین میں آپ کے والد بزرگوار جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے بویا اور آپ نے اسے پانی دیتے دیتے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ اس سے ایک نہایت خوشنما اور نونہال پودا پھوٹا جو چند روز میں سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگا اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں دور دور کے لوگ اس کے پھل و پھول سے گودیاں لبریز کر کے جانے لگے[۱]"

شاہ صاحب سرو قد، چھریرے بدن، گندمی رنگ، چمکیلی آنکھوں اور گھنی داڑھی والے مرنجان مرنج طبیعت کے بزرگ تھے۔ خط نسخ میں کمال حاصل تھا نیز نیزہ بازی اور شہسواری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

تلامذہ

بہت لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا اور بے شمار لوگوں نے آپ سے اکتساب علوم و فنون کیا چنانچہ آپ کے تلامذہ کی ایک مختصر سی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) شاہ عبدالقادر (۲) شاہ رفیع الدین (۳) شاہ عبدالغنی (۴) مولانا عبدالحی بڑھانوی (۵) مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۶) سید قمرالدین سونی پتی (۷) شاہ غلام علی بن عبداللطیف دہلوی (۸) سید قطب ہدی بن محمد واضح بریلوی (۹) شاہ محمد اسحٰق صاحب مہاجر (۱۰) مفتی صدرالدین خان صاحب دہلوی (۱۱) مولانا مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین (۱۲) مولانا رشید الدین خاں صاحب دہلوی (۱۳) مولانا کریم اللہ صاحب دہلوی (۱۴) مولانا میر محبوب علی صاحب (۱۵) مولانا محمد یعقوب صاحب (۱۶) مولانا عبدالخالق صاحب (۱۷) مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی (۱۸) مولانا حسن علی صاحب لکھنوی (۱۹) مولانا

حسین احمد صاحب ملیح آبادی (۲۰) مولانا محمد قاسم صاحب (۲۱) قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی (۲۲) مولانا سلامت اللہ بدایونی (۲۳) مولانا حکیم فیاض خاں (۲۴) مولانا شاہ ابوسعید (۲۵) شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادی (۲۶) مولانا خرم علی بلہوری (۲۷) شاہ احمد سعید مجددی (۲۹) مولانا محمد شکور مچھلی شہری (۳۰) مولانا سید حیدر علی (۳۱) مولانا شاہ ظہور الحق قادری پھلواری (۳۲) سید جیلانی فاروقی (۳۳) مولانا سید رمضان علی (۳۴) مولانا شیخ فضل حق کاکوروی (۳۵) شاہ رحمٰن بخش چشتی (۳۶) سید احمد شہید (۳۷) امام محمد اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

یہ شاہ صاحبؒ کے علم و فضل میں کمال کا نتیجہ ہی تھا کہ اطراف و اکنافِ عالم سے یہ تشنگانِ علوم آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ شاہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے ان علوم و فنون میں بھی یدِ طولیٰ عنایت فرمایا جن میں عام علماء کو قطعاً دلچسپی نہیں ہوتی؛ چنانچہ مولانا امیر شاہ خاں فرماتے ہیں کہ :۔

"شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس ایک جہاز راں انگریز آیا اور کہا کہ میں نے سنا ہے آپ کو ہر فن میں دخل ہے۔ جہاز رانی میں بھی آپ کو کچھ آتا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے جو بعض پرزوں کے حالات بیان کیے تو وہ اس کو بھی یاد نہ تھے۔ اس کو حیرت ہوئی۔ پوچھا۔ تو فرمایا کہ بچپن میں اس فن کی ایک کتاب دیکھی تھی۔ اس میں سے ہی کچھ یاد ہو گیا تھا۔"

تفسیر و حدیث، منطق و فلسفہ، صرف و نحو، معانی و بیان اور دیگر علوم میں تبحر کے ساتھ علمِ فتاویٰ میں بھی آپ کو مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔ آپ کے فتاویٰ اس قدر جامع، مدلل اور محقق ہوا کرتے تھے کہ بڑے بڑے مفتیانِ کرام اور علمائے عظام انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے اسی وجہ سے ملا رشیدی نے اپنے ایک مکتوب میں آپ کو لکھا :۔

"شاہ صاحب! آپ کا کچھ ایسا اثر بلادِ اسلامیہ میں ہوا ہے کہ جب کوئی فتویٰ دیا جاتا ہے اور علماء اس پر اپنی مہریں کرتے ہیں تو ہر شخص فتویٰ

میں آپ کی مہر کا متلاشی رہتا ہے اور وہ فتویٰ جب تک اس پر آپ کی مہر نہ ہو زیادہ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر آپ یہاں تشریف لے آویں تو ہم لوگوں کے لیے بڑے افتخار کی بات ہے اور سلطان ٹرکی بھی آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں[۵۴]۔"

تصنیفات

اگرچہ آپ نے اپنے والد مرحوم کی طرح کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں فرمائیں تاہم وقتاً فوقتاً جو کچھ آپ کے قلم سے نکلا علم و تحقیق کی منہ بولتی تصویر ہے اور تب سے لے کر اب تک ایک دنیا اس سے استفادہ کر رہی ہے، چنانچہ آپ کی تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) تفسیر عزیزی (۲) تحفہ اثنا عشریہ (۳) بستان المحدثین (۴) شرح میزان المنطق (۵) حواشی بدیع المیزان (۶) حواشی شرح عقائد (۷) عجالہ نافعہ (۸) سر الشہادتین (۹) الفتاوی فی المسائل المشکلۃ (۱۰) میزان البلاغہ (۱۱) میزان الکلام (۱۲) السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل۔ (۱۳) رسالۃ فی الانساب (۱۴) رسالۃ فی الرؤیا (۱۵) حاشیہ میر زاہد (۱۶) حاشیہ میر زاہد ملا جلال (۱۷) حاشیہ میر زاہد شرح مواقف (۱۸) حاشیہ ملا کوسج (۱۹) حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ۔

قومی احساس

شاہ صاحبؒ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے قادر الکلام اور صاحبِ طرز شاعر و انشاء پرداز بھی تھے آپ کے کلام کے نمونے "حیاتِ عزیزی" "حیاتِ ولی"، "نزہۃ الخواطر" اور دیگر تذکروں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ آپ کے مکتوبات اور منظومات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلو میں ایک دلِ دردمند رکھتے تھے جو مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور زبوں حالی پر کڑھتا رہتا تھا۔

آپ نے اپنی بعض نظموں میں اسلام کی غربت، مسلمانوں کی ابتری حالت،

دلی کی تباہی و بربادی اور سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار اور غارت گری کا اس قدر درد انگیز پیرایہ بیان میں نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے سے رقت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی بے کسی و بے بسی کے متعلق اپنے منظومات و مکتوبات میں جذبات و احساسات اور تاثرات کے اظہار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے عملی طور پر بھی اقدام کیا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تعلیم و تربیت کے بعد انہیں نواب امیر خاں کے پاس بھیج دیا تاکہ اس کے لشکر میں رہ کر عسکری تربیت حاصل کر کے جہاد کریں اور مسلمانوں کو آلام و مصائب کے جنگل سے باہر نکال لائیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا اور انگریزوں اور دیگر طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے فتویٰ صادر فرمایا آپ کے فتویٰ کی اصل عبارت ہم آگے نقل کریں گے۔

شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس سے لگا ئیے کہ بہ روایت مولانا امیر شاہ خاںؒ :-

"مولوی عبدالقیوم کے صاحبزادے مولوی محمد یوسف صاحب فرماتے تھے کہ جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ اب ہندوستان کی سلطنت حکماء کے ہاتھ میں آگئی ہے ان کے ہاتھ سے نکلنا بہت مشکل ہے یہ روایت میں نے مولوی یوسف صاحب سے بلا واسطہ بھی سنی ہے اور بواسطہ مولوی محی الدین خاں مراد آبادی بھی سنی ہے۔ انتہیٰ"

غور فرمائیے کہ شاہ صاحبؒ کہ یہ پیش گوئی کس قدر سچی ثابت ہوئی اور فرنگیوں نے کتنی شان و شوکت سے دو سو سال تک ہندوستان میں حکومت کی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس حکایت پر حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس پیشین گوئی کا مبنیٰ کرامت و فراست دونوں ہو سکتے ہیں انفراداً یا اجتماعاً۔

سفرِ آخرت

شاہ عبدالعزیزؒ نے عمر شریف کی ابھی تک صرف پچیس بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ مہلک قسم کے امراض کا آپ پر حملہ ہونا شروع ہو گیا،

مراق، جذام، برص اور نابینا پن وغیرہ چودہ امراض میں وقتاً فوقتاً مبتلا رہے۔ بیماریوں کی شدت کے پیش نظر کبھی کبھی نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ آپ کا معدہ کام چھوڑ دیتا اور آپ مسلسل کئی کئی دن تک کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ان امراض مؤلمہ اور اسقام مفجعہ کے باوجود آپ نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں، ان پر یقیناً حیرت ہوتی ہے۔

آخر عمر میں تبخیر کی شکایت بھی تھی ساتھ بخار بھی شروع ہوگیا، جو کہ آہستہ آہستہ تیز ہوتا گیا اور بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ مرض الموت میں اوراد و وظائف میں تو معمولی سا فرق آیا لیکن فرائض وسنن میں قطعاً کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ چونکہ خلق خدا کی بھلائی ہر وقت پیش نظر رہتی تھی اس لیے شدتِ مرض کے زمانہ میں بھی جب وعظ کا دن آیا تو فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو اور دو آدمی میرے کندھے پکڑے رہیں البتہ جب میں بیان کرنے لگوں تو پھر چھوڑ دیں؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اگرچہ آپ کے لہجہ میں کچھ ضعف کے آثار تھے لیکن استقلال ویسا ہی تھا۔ اختتام وعظ کے بعد اعزہ و اقارب سے فرمایا میری ملکیت میں جس قدر مال و اسباب ہے سب ایک جگہ جمع کر دو۔ جب تعمیل ارشاد کی گئی تو آپ نے اپنا تمام مال و اسباب جائز وارثوں میں شریعت کے مطابق تقسیم کر دیا۔

اس کے بعد آپ نے عربی و فارسی کے چند اشعار جو معرفتِ الٰہی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ایسے دردناک لہجہ میں پڑھے کہ سامعین پر رقت کا عالم طاری ہوگیا۔ بعد ازیں آپ نے وصیت فرمائی کہ میری تجہیز و تکفین مسنون طریقہ کے مطابق کی جائے کفن کے لیے سادہ کپڑا جیسا کہ میں پہنتا رہا ہوں استعمال کیا جائے۔

——— پھر آپ اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ زبان پر آیت شریفہ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ کا ورد جاری تھا کہ ۷ ر شوال بروز یک شنبہ بوقت صبح ۱۲۳۹ھ کو آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور اسی وقت اعزہ و اقارب کی زبان سے غلغلہ بلند ہوا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

شاہ رفیع الدینؒ

شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد العزیزؒ سے چھوٹے اور انہیں کی طرح یگانۂ روزگار محدث، متکلم اور اصولی تھے ۱۱۶۳ھ

میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم حاصل کی اپنے والدِ ماجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علاوہ دیگر بڑے بڑے علمائِ کرام سے بھی علم حاصل کیا صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ادب و انشا اور تفسیر و حدیث بہت سے علوم میں دسترس رکھتے تھے تفسیر و حدیث کی سند تو اپنے برادرِ اکبر شاہ عبد العزیزؒ سے حاصل کی۔

شاہ عبد العزیزؒ جب مختلف امراض میں مبتلا ہو کر نہایت ضعیف ہو گئے تو انہوں نے تدریس کے فرائض آپ کے سپرد کر دیئے۔ آپ ہر فن میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ حافظہ اور ذہانت خداداد پایا۔ ایک ہی وقت میں مختلف انواع و اقسام کے کئی علوم و فنون کا درس دیتے اور ایک فن سے دوسرے میں منتقل ہوتے وقت طبیعت میں قطعاً انقباض محسوس نہ کرتے۔

سخاوت و خدمتِ خلق

علم و فضل میں تبحر کے ساتھ ساتھ متانت و سنجیدگی عاجزی و انکساری، حلم و بُردباری اور جود و سخا کے اوصافِ حمیدہ سے متصف تھے۔ سیرت کی ان بلندیوں میں شاہ عبد الغنیؒ کے علاوہ کوئی آپ کا سہیم و شریک نہیں تھا۔ سخاوت و خدمتِ خلق میں تو آپ خاص طور پر مشہور تھے ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ امیر شاہ خاں فرماتے ہیں کہ :-

> "چار اشخاص شاہ صاحبؒ کے خاندان میں بہت سخی تھے ایک شاہ رفیع الدین صاحب۔ ان کی نسبت سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ ان کا کیسۂ زر ہمیشہ خالی رہتا تھا یہ مکان کے باہر چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے اور اس پر فرش نہ ہوتا تھا بلکہ صرف چٹائی ہوتی تھی اور کبھی چٹائی بھی دے دیتے تھے اور خالی زمین پر بیٹھتے تھے سارے محلے کی عورتوں کا کام کیا کرتے تھے میرے اُستاد میاں جی محمدی صاحب فرماتے تھے کہ ایک روز شاہ صاحب عورتوں کا سودا خریدنے گئے چونکہ سودے مختلف اور متعدد تھے اس لیے اوّل انہوں نے سودے رومال میں باندھے۔ جب رومال میں گنجائش نہ رہی تو کُرتے میں رکھے۔ جب اس میں بھی گنجائش نہ رہی اور ایک سودا باقی رہ گیا تو اسے ٹوپی میں لے

لیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت دال مجھے دے دیجئے اور ٹوپی خالی کر کے یا اوڑھ لیجئے تو آپ نے فرمایا نہیں مسلمان کی ہر چیز کام میں آنی چاہیے[۲۱]۔"

تصانیف شاہ عبدالعزیزؒ کے مبتلائے امراض ہونے کے بعد چونکہ تدریس کی ذمہ داری سے آپ کو عہدہ برآ ہونا پڑا۔ بنابریں آپ کو تصنیف کے لیے زیادہ وقت میسر نہ آسکا تاہم آپ نے بھی کچھ نہایت مفید علمی یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں سرفہرست آپ کا سب سے پہلا اُردو ترجمۂ قرآن ہے جو تب سے لے کر اب تک بدستور مقبول ہے اس کے علاوہ آپ کی تصنیفات درج ذیل ہیں۔

(۱) تکمیل الاذہان (۲) مقدمۃ العلم (۳) دمغ الباطل (۴) اسرار المحبۃ (۵) قیامت نامہ (۶) تفسیر آیت نور (۷) حملۃ العرش کی تحقیق میں ایک رسالہ (۸) کتاب التکمیل (۹) رسالہ عروض (۱۰) تاریخ میں ایک رسالہ (۱۱) اثباتِ شق قمر میں ایک رسالہ (۱۲) تحقیق الوان میں ایک رسالہ (۱۳) پردہ کے متعلق ایک رسالہ (۱۴) برہان التمانع میں ایک رسالہ (۱۵) عقدِ انامل میں ایک رسالہ (۱۶) منطق میں ایک رسالہ (۱۷) حاشیہ میر زاہد

علاوہ ازیں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض عقائد کو مخمس کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے متعلق بھی آپ کا ایک قصیدہ ہے۔ یہ اور آپ کے دیگر قصائد آپ کی کتاب" اسرار المحبۃ "کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا فقیر محمد جہلمی نے" حدائق الحنفیہ" میں آپ کی ایک اردو تصنیف" راہِ نجات" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے ایک مقالہ" اُردو ترجموں کی نوعیت واہمیت" میں شاہ صاحب کی دو اور کتابوں (۱) سورۂ بقرہ کی تفسیر اور (۲) تنبیہ الغافلین کا بھی ذکر کیا ہے آپ کی مذکورہ تفسیر ۱۲۷۲ھ میں طبع بھی ہوئی اور اس کے حاشیہ پر مولانا یعقوب چرخی کی تفسیر بھی تھی۔ غرضیکہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا دامنِ کمال بھی تصنیف کے موتیوں سے خالی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں آپ کا مقام نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ کا یہ تمام ذخیرہ خاص اہلِ علم کے لیے ہے، عوام اس سے بہت کم استفادہ کر سکتے ہیں تاہم شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور افکار و نظریات کے سمجھنے

ہیں یہ کتابیں بہت ممد و معاون ہیں۔

وفات

شاہ عبدالعزیزؒ بقید حیات تھے کہ آپ عمر شریف کی ستر بہاریں دیکھنے کے بعد ۱۹ شوال ۱۲۳۳ھ میں دہلی میں اللہ کو پیارے ہو گئے[۲۳]۔ شاہ عبدالعزیزؒ کو آپ کی وفات سے بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ نابینا ہونے کے باوجود جنازہ کو کندھا دینے کی کوشش کر رہے تھے اور فرما رہے تھے :۔

"چہ گویم من طاقتے ندارم"[۲۴]

شاہ عبدالقادرؒ

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند رشید اور شاہ عبدالعزیزؒ و شاہ رفیع الدینؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ علم و فضل اور ورع و تقویٰ میں اپنے خاندان کی روایات کے امین تھے بلکہ سرسید نے تو لکھا ہے :۔

"آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے اور قلم کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے"[۲۵]

۱۱۶۷ھ میں ولادت باسعادت ہوئی۔ بچپن ہی سے بڑے باوقار اور سنجیدہ تھے تمام تعلیم اپنے والد ماجد ہی سے حاصل کی۔ علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ کسب فیضِ باطن بھی کیا اور اس سلسلہ میں دوسرے بزرگوں سے بھی استفادہ کیا پوری زندگی تعلیم و تدریس میں بسر کی علم و فضل، فہم و فراست۔ ورع و تقویٰ اور سیاسی تدبیر کے پیشِ نظر وقت کے تمام علماء، امراء سلاطین اور شہزادوں کی گردنیں آپ کے سامنے جھکی رہتی تھیں ایک تذکرہ نویس نے بالکل بجا کہا ہے :۔

"اگرچہ درویش صفت انسان تھے مگر رؤسائے شہر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بسبب ادب کے خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجالِ سخن نہ پاتے اور ایک یا دو بات سے زیادہ منہ سے نکلتی"

لیکن اس جاہ وجلال کے باوصف اپنے اسلاف کی طرح دل کے درویش اور مزاج سے منکسر تھے ہر ایک سے اخلاق اور تواضع سے پیش آتے جب کسی کو کسی خلافِ شریعت امر کا مرتکب پاتے تو اُسے بھی نہائیت احسن پیرایۂ بیان میں سمجھاتے چنانچہ اپنے وعظ کے دوران ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے تھا۔ آپ نے وعظ کے بعد اس سے فرمایا ذرا ٹھہر جائیے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے پھر اسے خلوت میں لے گئے اور فرمایا بھائی! مجھ میں ایک عیب ہے کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ڈھلک جاتا ہے اور حدیث میں یہ یہ وعیدیں آئی ہیں اور پھر آپ نے اسے اپنا پاجامہ دکھایا اور فرمایا خوب غور سے دیکھو کیا واقعی میرا خیال صحیح ہے یا محض وہم ہے۔ اس شخص نے شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ حضرت آپ کے اندر تو یہ عیب کیوں ہوتا البتہ میرے اندر ہے مگر اس طریقے سے آج تک مجھے کسی نے نہیں سمجھایا تھا اب میں توبہ کرتا ہوں اور انشاءاللہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔[۴۷]

جس طرح آپ کی طبیعت فخر، غرور اور تکبّر سے متنفّر تھی اسی طرح دوسروں میں بھی ان عیبوں کو آپ پسند نہیں فرماتے تھے؛ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آپ کے تلامذہ مولوی فضل حق اور مفتی صدرالدین جس دن خود کتابیں لے کر جاتے اس دن آپ بھی سبق پڑھا دیتے اور جس دن خادموں سے کتابیں اٹھوا کر لاتے آپ سبق ہی نہ پڑھاتے۔

آپ بہت زیادہ صاحبِ کرامت بزرگ تھے آپ کی بہت سی کرامات زبانِ زدِ عام وخاص تھیں مولوی فیض الحسن صاحب فرماتے تھے کہ شاہ عبدالقادرؒ صاحب سے کرامات کا اس زور شور سے صدور ہوتا تھا جیسے خزاں کے زمانہ میں پت جھڑ ہو یا بارش کے وقت بوندیں گرتی ہوں۔[۴۸]

تفسیر، حدیث، صرف ونحو اور ادب وانشاء کے ساتھ ساتھ منطق وفلسفہ میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ مولوی فضل حق اور مفتی صدرالدین ایک دفعہ آپ سے پڑھنے جارہے تھے کہ راستہ میں اس مفہوم کی گفتگو کی کہ اس خاندان (ولی اللہی) کے لوگ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ علوم دینیہ تو خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے؛ چنانچہ ابھی وہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ شاہ صاحب نے خدام کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر ڈال دو اور ایک مسجد کے اندر اور جب فضل حق

اور صدر الدین آئیں تو ان کو وہیں بٹھا دو۔ جب ان کے آنے کی آپ کو اطلاع ہوئی تو تشریف لائے اور اپنے بوریئے پر جلوہ افروز ہوگئے اور فرمایا کہ میاں فضل حق اور میاں صدر الدین آج سبق پڑھانے کو تو جی نہیں چاہتا۔ یوں جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات میں گفتگو ہو انہوں نے کہا جیسے حضرت کی خوشی ہو۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اچھا بتاؤ کہ متکلمین کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جو فلاسفہ کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت متکلمین کے تو اکثر مسائل کمزور ہی ہیں مگر فلاں مسئلہ تو بہت ہی کمزور ہے اس پر آپ نے فرمایا کہ اچھا تم فلاسفہ کا مسئلہ لو اور ہم متکلمین کا اور گفتگو کریں انہوں نے عرض کیا کہ بہت اچھا اس پر گفتگو ہوئی اور آپ نے دونوں کو عاجز کر دیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ فلاسفہ کا کون سا مسئلہ کمزور ہے اس پر انہوں نے عرض کیا کہ فلاں مسئلہ بہت کمزور ہے تو آپ نے فرمایا کہ اچھا اب تم متکلمین کا پہلو لو اور ہم فلاسفہ کا! چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آپ نے اب بھی ان کو چلنے نہ دیا جب ہر طرح ان کو مغلوب کر دیا تو فرمایا کہ میاں فضل حق اور میاں صدر الدین تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی بلکہ ہم نے ان کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا مگر انہوں نے ہمیں اب تک نہیں چھوڑا۔ وہ اب تک ہماری قدم بوسی کیے جاتے ہیں۔

تصنیف فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ اکبر آبادی مسجد میں فروکش ہوگئے اور تمام زندگی یہیں بسر کر دی۔ تدریس سے فارغ ہوتے تو اوراد و وظائف میں مصروف ہو جاتے۔ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کم مبذول فرمائی اس باب میں آپ کے صرف دو زندہ جاوید کارنامے ہیں ایک قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور دوسرا تفسیر موضح القرآن۔

آپ کا ترجمہ قرآن مجید عمدہ اسلوب اور حسن پیرایۂ بیان میں سلیس، شگفتہ اور بامحاورہ اُردو میں ہے جو دیکھنے میں نہایت سہل و مختصر لیکن حقیقت میں دقیق و باریک مطالب سے لبریز۔ تلفظ میں آسان مگر عمیق مضامین سے پُر۔ چھوٹے چھوٹے مگر فصاحت و بلاغت میں ڈوبے ہوئے جملوں سے وہ حیرت انگیز مضامین کا سمندر اُبل رہا ہے جو انسانی طاقت سے بالکل باہر نظر

آئی ہے۔ اس لیے ایک فاضل کا یہ قول بے شک بجا ہے کہ:

"اگر اُردو زبان میں قرآن مجید نازل ہوتا تو ان ہی محاورات کے لباس سے آراستہ ہوتا جن کی رعایت مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس ترجمے میں پیشِ نظر رکھی ہے۔"

اگرچہ آپ سے پہلے آپ کے برادرِ اکبر شاہ رفیع الدین بھی قرآن مجید کے اُردو ترجمہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے مگر دونوں بھائیوں کے ترجموں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ لفظی اور شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اُردو کی خوبیٔ قسمت کا اندازہ یہی لگائیے کہ مذہب نے اپنا دستِ مبارک اس کے سر پر عین اس وقت رکھا جب کہ یہ گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔

اسی طرح آپ کی تفسیر "موضح القرآن" بھی نہایت سلیس، عام فہم اور اپنے موضوع میں اُردو کی پہلی کتاب ہے اس مختصر ترین تفسیر یا حواشی کہہ لیجئے میں بھی شاہ صاحبؒ نے اپنا اعجاز دکھایا ہے اور قرآن مجید کے مشکل مسائل کو ایسے سہل انداز میں حل فرمایا ہے کہ عالم و عامی یکساں طور پر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ قرآنِ مجید کا یہ بے نظیر مترجم و مفسر ۱۲۳۰ھ میں دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھ کر فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ جا پہنچا۔

شاہ عبدالغنیؒ

آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنے اسلاف کی سچی تصویر تھے ساری زندگی عبادت و ریاضت اور تہجد گزاری و شب زندہ داری کے پیشِ نظر گوشۂ گمنامی میں بسر کی اور اسی وجہ سے آپ کی زیادہ شہرت نہ ہو سکی اور مفصل حالاتِ زندگی بھی پردۂ اخفا میں ہیں۔ تاہم مصنف "حیات ولی" نے آپ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آپ نے علوم خاص کر فقہ و حدیث کی تحصیل اپنے والد بزرگوار اور جناب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے کی۔ اتباعِ شریعت میں آپ کا قدم پیشروانِ مسلک سے آگے بڑھا ہوا تھا وضع و لباس میں اپنے والد بزرگوار کے اس درجہ مشابہ تھے کہ جس نے انہیں دیکھا تھا وہ آپ

کو دیکھ کر شاہ صاحب مرحوم کو یاد کرتا۔ علمی کمال کے علاوہ اخلاقِ
عامہ آپ میں ایسے تھے جو دوسروں میں بہت کم پائے جاتے تھے
توکل و قناعت میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے اور باوجود عیالداری اور
تاہل کے دنیا اور اہلِ دنیا کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے آپ
کے اکثر اوقات تدریس طلبہ میں مصروف اور عنانِ ہمت افادہ طالبین
کی طرف معطوف تھی۔"[۳۱]

آپ کے فقر، استغنا اور تقویٰ کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ خان امیر شاہؒ، مولانا گنگوہیؒ
سے روایت کرتے ہیں کہ "ایک مرتبہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے ہاں کئی وقت کا فاقہ تھا
اس کا تذکرہ ان کی ماما نے کہیں کر دیا۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے مفتی صدر الدین خانؒ کو بھی
ہو گئی۔ مفتی صاحب نے تین سو روپے شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیئے۔ شاہ صاحبؒ
نے واپس کر دیئے۔ اس پر مفتی صاحبؒ وہ روپے لے کر خود حاضر ہوئے اور تخلیہ میں روپے
پیش کیے اور فرمایا کہ شاید حضور کو خیال ہو کہ یہ صدر الصدور ہے رشوت لیتا ہوگا۔ اس لیے میں
عرض کرتا ہوں کہ میں رشوت نہیں لیتا بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں، آپ ان کو قبول فرمالیجیے۔
شاہ صاحبؒ نے فرمایا میں تمہاری نوکری کو بھی اچھا نہیں سمجھتا اور اس لیے میں ان کے لینے سے
معذور ہوں بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ نے خادمہ کو بلا کر فرمایا نیک بخت! اگر فاقہ
کی برداشت نہیں ہے تو اور گھر دیکھ لو مگر خدا کے لیے ہمارا راز افشا نہ کرو۔"[۳۲]

اسی طرح ایک مرتبہ مفتی صدر الدین خاں نے آپ کے ہاں سے کچھ کتابیں مستعار منگوائیں
آپ نے بھیج دیں۔ جلدیں شکستہ تھیں۔ مفتی صاحب نے واپسی کے وقت نئی جلدیں بنوا کر
واپس کر دیں۔ جب آپ کے پاس کتابیں پہنچیں تو آپ نے جلدیں توڑ کر مفتی صاحب کے پاس
واپس فرما دیں اور کہلا بھیجا ہمارے وہی پرانے پٹھے بھیج دو۔[۳۳]

مولانا علاؤ الدین صاحب پھلتیؒ کی دختر فرخندہ اختر فاطمہ آپ کے حبالۂ عقد میں تھیں، یہ
وہی سعادت مند خاتون ہیں جس کے بطنِ اطہر سے حضرت امام محمد اسمٰعیل نے جنم لیا جن کے غلغلۂ علم
و عمل سے چار دانگ عالم گونج اٹھا۔ جب آپ کی ولادتِ باسعادت ہوئی تو حضرت شاہ

عبدالغنی صاحبؒ کا خیال تھا کہ آپ کی رضاعت کے فرائض کسی نیک انّا کے سپرد کر دیئے جائیں مگر اس نیک بخت خاتون نے اسے تسلیم نہ کیا اور اپنے لاڈلے کو خود ہی دودھ پلایا۔ چشمِ تصوّر دیکھتی ہے کہ آپ ایّامِ رضاعت میں شاید اپنے بچّے کو اس طرح لوری دیا کرتی تھیں :

"اے ربِّ ذوالجلال ! میرا نونہال مجاہد بنے اور تیرے محبوب کے لگائے ہوئے درخت کو اپنی جوانی کے گرم گرم خون سے سیراب کر دے ۔"

اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ یہ بچّہ جوان ہو کر مجاھد بنا۔ اتنا بڑا مجاہد کہ اس کی شجاعتوں اور بسالتوں کی برِصغیر پاک و ہند میں مثال مشکل سے ملتی ہے ۔

آپ کو اپنے فرزندِ ارجمند کی معیت میں حجِ بیت اللہ کی بھی سعادت نصیب ہوئی اور آپ حضرت سیّد احمدؒ سے بیعت بھی تھیں ۔ حج کے موقع پر مکّہ معظمہ میں ہی قیام پذیر تھیں کہ سخت بیمار پڑ گئیں اور آخر کار پیامِ اجل آ پہنچا اور عازمِ ملکِ عدم ہو گئیں جنت المعلیٰ میں آپ محوِ استراحت ہیں غفر اللہ لہا ونوّر مرقدھا ۔

نواب وزیر الدولہ اور مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ بھی حضرت سیّد صاحب سے بیعت تھے یہ دُرست نہیں کیوں کہ صحیح روایت کے مطابق آپ کی وفات ۱۶ رجب ۱۲۰۳ھ میں ہوئی جب کہ سیّد احمدؒ نے عمر شریف کی ابھی صرف دو تین بہاریں ہی دیکھی تھیں کیونکہ آپ کی ولادت باسعادت ۶ صفر ۱۲۰۱ھ میں ہوئی لہٰذا حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے سیّد صاحبؒ کی بیعت کے کیا معنیٰ ؟

آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادوں میں سے سب سے چھوٹے تھے لیکن اپنے تمام بھائیوں کی نسبت سب سے پہلے یعنی ۱۶ رجب ۱۲۰۳ھ بمطابق ۱۲ اپریل ۱۷۸۹ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے جب کہ عمر شریف کی ابھی تک صرف ستاون بہاریں دیکھی تھیں ۔

آپ نے حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے علاوہ رقیہ نامی ایک دخترِ نیک اختر کو بھی یادگار چھوڑا جو کہ مولانا علاء الدین پھلتی کے پوتے شیخ کمال الدین کے حبالۂ عقد میں تھیں ۔

شجرۂ نسب حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ

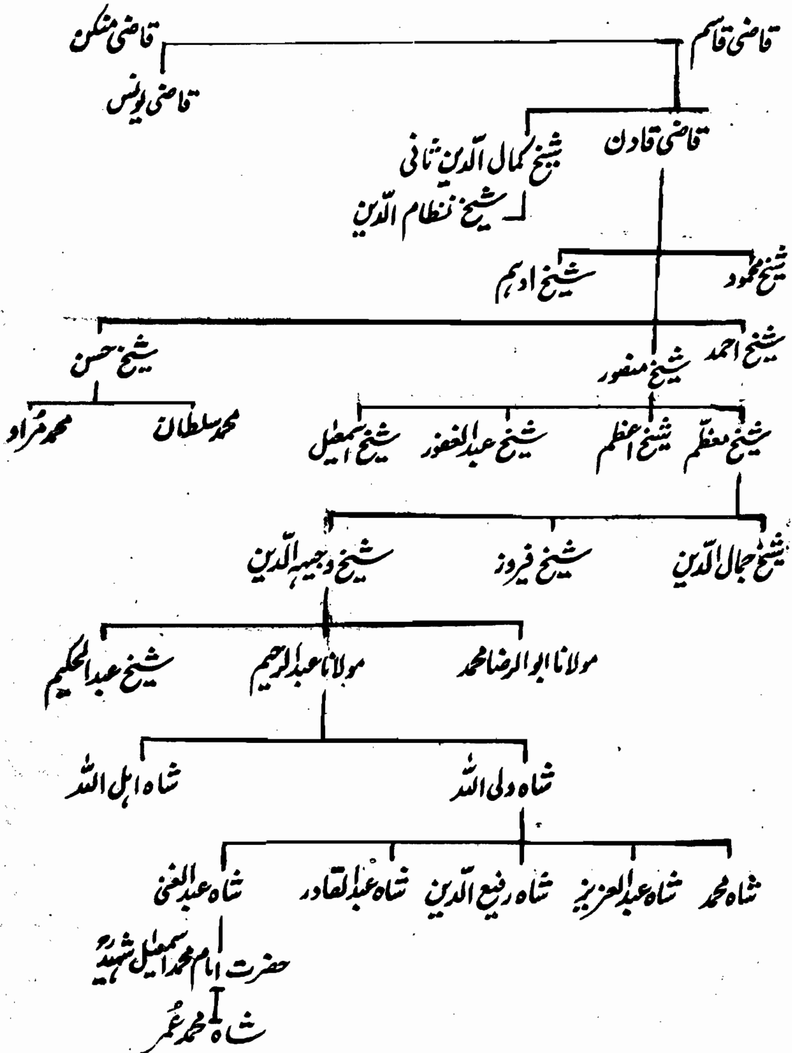
شیخ شمس الدین

شیخ کمال الدین

شیخ قطب الدین

شیخ عبدا

قاضی بدھا



باب دوم

امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ

دنیا کے عظیم المرتبت اور اولوالعزم اشخاص کی حیات ایک سرِ نہاں ہوتی ہے اور وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت جو کارہائے نمایاں سر انجام دیتے ہیں وہ آنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوتے ہیں ایسی ہی مقدس شخصیتوں میں سے ایک حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ بھی تھے جن کے سوانح حیات اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل آپ اس کتاب میں پڑھیں گے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے حبِ الٰہی، عشقِ رسولؐ، علم و عمل، ولولۂ جہاد، تڑپِ احیائے دین اور سوز و گداز سے ایک آمیختہ بنایا اور نام اس کا اسمٰعیل رکھ دیا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی حیاتِ کائنات کی تمام تصوری اور نظری خوبصورتیوں سے تعبیر ہے بقول مہر مرحومؒ ایک نیاز مند نے لکھا ہے کہ :-

"ایسا عالم باعمل، فاضل بے بدل، صاحبِ اخلاق، شہرہ آفاق
المعی زماں، لوذعی دوراں، واقفِ علوم معقول و منقول، کاشفِ
دقائق فروع و اصول، رافع اعلام توحید و سنت، قامع بنیان شرک
و بدعت، قوت کردار، شجاعت و دستار اس وقت میں ہم نے کہیں
نہ سنا دیکھا تو کیا ہے[۲]"

ولادت باسعادت

اس نابغۂ عصر اور عبقری زماں (GENIUS) محدث و مفسر، فقیہ و متکلم، مصنف و مبلغ اور غازی و مجاہد نے ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ بمطابق ۲۹ اپریل ۱۷۷۹ء کو اس عالمِ رنگ و بو کو قدوم میمنت لزوم سے نوازا اور یہی روایت مستند ہے۔ میر شہامت علی نے آپ کی تاریخ پیدائش ۱۸ شوال ۱۱۹۶ھ لکھی ہے مگر یہ روایت غلط ہے یہ سعادت پھلت ضلع مظفر نگر کے حصہ میں آئی کہ اس کے فلک پر یہ ماہِ شب چہار دہم نمودار ہوا۔

تعلیم و تربیت

والدین نے نہایت عمدہ طریق سے اپنے نونہال کی تربیت کی۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت شاہ عبدالغنیؒ صاحب اپنے لاڈلے کی رضاعت کے فرائض کسی انّا کے سپرد کرنا چاہتے تھے مگر آپ کی والدہ ماجدہ نے اسے تسلیم نہ کیا اور اپنی کمزوری و ناتوانی کے باوصف اپنے صاحبزادہ کو خود ہی دودھ پلایا۔ آپ بچپن ہی سے دبلے پتلے تھے حتیٰ کہ عہدِ شباب میں بھی دھان پان بلکہ مشتِ استخوان ہی رہے لیکن اس کے باوجود جسم توانا اور مضبوط تھا۔ لڑکپن ہی میں آپ حلیم بردبار، مجسّم اخلاق اور پیکرِ اخلاص تھے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب فرمایا کرتے تھے:۔

"میرے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ کچھ ایسا عجیب اور غریب ہے
کہ رونا مطلق نہیں جانتا[۴]"

لیکن یاد رہے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کا یہ ارشاد آپ کے زمانۂ شیر خوارگی سے متعلق ہے ورنہ لڑکپن میں آپ بھی شوخ و شنگ تھے کھیل کود میں بھی دلچسپی لیتے، میلوں ٹھیلوں میں بھی شرکت فرماتے مولانا امیر شاہ خاں صاحبؒ[۵] نے مولانا عبدالقیوم صاحبؒ سے روایت

کیا ہے کہ :۔

"مولانا شہیدؒ ابتداء میں نہایت آزاد تھے، کوئی میلہ خواہ ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس میں وہ شریک نہ ہوتے ہوں اور کھیل بھی ہر قسم کے کھیلتے تھے کنکوا بھی لڑاتے تھے شطرنج بھی کھیلتے تھے مگر باوجود اس آزادی کے بزرگوں کا ادب اور لحاظ اتنا تھا کہ پتنگ اڑا رہے ہیں اور پیچ لڑا رہے ہیں، مخالف کے پتنگ کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اتنے میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ حجرہ سے نکلے اور آواز دی اسمٰعیل! یہ آواز سنتے ہی فوراً جواب دیتے حضور! اور پتنگ کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے آتے تھے"

آپ کی یہ آزادی، زندہ دلی اور طبیعت کا منچانِ مرنج ہونا آپ کے زہد و تقویٰ اور تحصیلِ علم پر قطعاً اثر انداز نہ ہوا۔

آپ کے والدِ ماجد نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا بیڑا خود اٹھایا مگر افسوس کہ آپ نے عمر شریف کی ابھی صرف دس بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔ اسی وقت سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے برادر زادے کو اپنے دامنِ تربیت میں لے لیا اور حقیقی بیٹوں سے بھی زیادہ آپ کا خیال رکھا اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ بھی اپنے مرحوم بھائی کی اس یادگار سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں تو آپ نے اپنے والدِ مرحوم سے ہی پڑھ لی تھیں بلکہ ان کے وصال تک آپ کو صرف و نحو میں کامل دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ خاندانی رسم و رواج کے مطابق بچپن میں آپ کو ریاضی کی تعلیم بھی دی گئی اور ریاضی میں آپ نے اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ مشکل سے مشکل مسائل پل بھر میں حل کر لیتے تھے ابھی چھ برس کے ہی تھے کہ آپ نے اقلیدس کے تمام لازمی اصول نوکِ زبان کر لیے تاریخ سے بھی آپ کو بہت زیادہ دلچسپی تھی تاریخ کے لیے جغرافیہ سے واقفیت چونکہ ضروری ہے اس لیے آپ نے جغرافیہ کی

کتابوں کو بھی پڑھا اس وقت مختلف قسم کے جغرافیے نصابِ تعلیم میں داخل تھے اس لیے آپ نے جغرافیہ کی بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ آپ کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ طالب علمی کے زمانہ میں ہی ہندوستان خصوصاً پنجاب کے جغرافیہ کو زیادہ دیکھا کرتے تھے شاید اسی خطۂ ارض کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیئے بچپن ہی سے زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔

آٹھ برس کے ہوئے تو آپ کو حفظِ قرآن کی سعادت بھی نصیب ہوگئی اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ محض حفظِ متن ہی نہ تھا بلکہ ترجمہ و معانی قرآنِ پاک تک آپ کو رسائی حاصل ہو چکی تھی۔

والدِ مرحوم کے دُنیا فانی سے عالم جاودانی کی طرف رختِ سفر باندھ جانے کے بعد منطق فلسفہ اور دیگر فنون کی زیادہ تر کتابیں آپ نے شاہ عبدالقادر سے ہی پڑھی تھیں ان کے علاوہ شاہ رفیع الدینؒ۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور مولانا عبدالحیؒ سے بھی آپ نے کسبِ فیض کیا حدیث کی زیادہ تر کتابیں آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھیں اور اپنی خداداد استعداد سے بہت جلد حدیث میں مہارت حاصل کر لی بعض سوانح نگاروں کے بقول تیس ہزار احادیثِ مُبارکہ آپ نے حفظ کر لیں۔ مولانا کرامت علی حیدر آبادیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں حدیث میں مولانا شہیدؒ کا ہم سبق تھا مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کبھی مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ ساتھی آپ کو بے پرواہ کہتے اور شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس شکایت کرتے رہتے تھے۔ شاہ صاحب بھی شکایتیں سُنتے سُنتے مجبور ہو کر ایک دن جماعت میں تمام طلبہ کے سامنے فرمانے لگے اسمٰعیل! تم مطالعہ نہیں کرتے۔ اور کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لیتے ہو۔ سُن کر آپ نے جواب دیا، حضور! آپ مجھ سے، کچھ پڑھا ہوا دریافت فرمالیں، تو شاہ صاحبؒ نے اسی مجلس میں آپ سے کچھ سوالات دریافت فرمائے۔ آپ نے اس قدر حسن پیرایۂ بیان میں انہیں حل کیا کہ وہی ساتھی جو اسباق میں آپ کے دلچسپی نہ لینے کے پیشِ نظر اکثر نالاں رہتے تھے اب تحسین و آفرین کے پھول برسا رہے تھے اور استاد محترم حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مسرت کی بھی انتہا نہ تھی۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ عُمر کے بارھویں برس آپ اقلیدس کی نہایت مشکل کتاب "صدرا" پڑھ رہے تھے اور اس کے آٹھ آٹھ دس دس صفحات بغیر کسی مقام

پڑھے پڑھ جاتے تھے اور استاد سے کچھ دریافت نہ کرتے عبدالکریم بخاری ایک معمر طالبعلم آپ کے ہم درس تھے وہ آپ کی ذہانت و فطانت کی وجہ سے آپ سے حسد کرتے تھے ایک دن آپ نے کتاب کھولی مگر یاد نہ رہا کہ کل کہاں تک پڑھا تھا۔ ورق گردانی کرتے ہوئے عبدالکریم نے دیکھا تو جھلا کر کہنے لگے میاں! مکھی مار کر رکھ لیا کرو تاکہ سبق تلاش کرنے میں تمہیں کسی دِقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آپ نے اس کا تبسم سے جواب دیا اور خاموش ہو رہے ایک دن "صدرا" کا انتہائی مشکل مقام تھا مگر آپ حسبِ معمول وہاں سے بھی رواں دواں گزر گئے بخاری صاحب کا خیال تھا کہ آپ یہاں ضرور رکیں گے اس لیے ان کی جبین پر شکنیں پڑ گئیں اور غصہ سے تلملاتے ہوئے کہنے لگے "صاحبزادہ! تم کچھ سمجھے بھی یا یُوں ہی گھاس کاٹتے چلے جاتے ہو" آپ نے بغیر کسی ناراضی کے اظہار کے بڑی متانت سے فرمایا کہ اگر آپ کوئی بات نہ سمجھ سکے ہوں تو دریافت فرمالیجئے۔ انہوں نے فوراً کہا کہ اس عبارت کی وضاحت کردیجئے۔ آپ نے اس عبارت کو اس قدر عمدہ، سلیس اور شگفتہ انداز میں حل فرمایا کہ استاد محترمؒ اور طلبہ عش عش کر اٹھے۔ اس کے بعد آپ نے "صدرا" کے حاشیہ پر اعتراض کیا اور اپنے موقف کی تائید میں نہایت ٹھوس دلائل پیش کیے در اصل اقلیدس اور ریاضی سے تو آپ کو بچپن سے ہی نہایت دلچسپی تھی۔ بہت تھوڑی مدت میں آپ نے ان پر عبور حاصل کر لیا مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ ریاضی کے بڑے بڑے مسائل آپ چٹکیوں میں سلجھا دیتے تھے اور لاکھوں روپے کی رقموں کا جوڑ صرف دو چار منٹ کے تامل سے فوراً بتا دیتے تھے[۹] اور بقول حضرت نواب والاجاہ صدیق حسن خانؒ علم حساب آپ کی انگلیوں پر رہتا تھا[۱۰]۔ مبدأ فیاض نے بڑی عالی شان دماغ اور غیر معمولی ذہانتوں اور فطانتوں کی دولت سے آپ کو مالامال فرمایا ہوا تھا۔ حضرت نواب والاجاہؒ رقمطراز ہیں[۱۱]۔

"جوہرِ ذکاوت او بہ غایت عالی افتادہ بود و حکایاتِ ذہانت و فطانت وے ہنوز نقل ہر مجلس و زیب ہر محفل اہلِ علم است[۱۲]"

آپ کا جوہرِ ذکاوت بہت بلند تھا اور آپ کی ذہانت و فطانت کی حکایات اب تک اہلِ علم کی ہر مجلس کے لیے باعثِ زینت ہیں۔

سرسید[13] نے بھی لکھا ہے کہ ایسے فرد کامل کا پیدا ہونا خدائے ذوالجلال کی قدرت کاملہ کا ایک خاص کرشمہ تھا۔ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ طبیعت میں استغنا بھی بہت تھا مطالعے پر چنداں توجہ نہ تھی۔ مقام سبق اکثر محفوظ نہ رہتا کبھی اصل مقام چھوڑ کر آگے سے شروع کر دیتے شاہ عبدالقادرؒ ٹوکتے تو کہہ دیتے کہ بیچ کا حصّہ آسان سمجھ کر چھوڑ دیا کبھی پڑھا ہوا حصّہ دوبارہ پڑھنے لگتے جب حضرت اس سے متنبہ فرماتے تو آپ اس میں کچھ شبہ فرما دیتے اور یہ شبہ ایسا ہوتا کہ حضرت استاد کو اس کے دفع میں بہت متوجہ ہونے کی حاجت ہوتی[14]

پندرہ سولہ سال کی عمر میں رسمی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ دستارِ فضیلت اور سندِ فراغت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے خود اپنے دستِ مبارک سے عنایت فرمائی آپ کی ذہانت وطباعی اور فہم و فراست کی دھوم دھام تمام شہر میں بہت جلد پھیل گئی۔ اس لیے بڑے بڑے عالم جب آپ سے ملتے تو امتحان کی غرض سے سرراہے ایسے مسائل پوچھ لیتے جن کا جواب کتابوں اور شرحوں کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔ لیکن آپ کتابوں کی اعانت کے بغیر فوراً ایسے تسلی بخش جواب دیتے کہ علماء محو حیرت رہ جاتے۔ سعادت یار خاں رنگین[15] کا قول بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ جب انہوں نے آپ کی ذہانت و ذکاوت کو دیکھا تو کہا کہ :-

"اس خاندان سے جو اٹھتا ہے باون گزا اٹھتا ہے"[16]

ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیزؒ نے کسی اہم استفتاء کا جواب لکھا اور اسے اپنی مسند پر چھوڑ کر کسی کام کی غرض سے اندر مکان میں تشریف لے گئے اتنے میں آپ بھی وہاں تشریف لے آئے فتویٰ کو ملاحظہ فرمایا تو اس میں چند فروگزاشتیں نظر آئیں تو آپ نے اپنے قلم سے تصحیح کر دی اور فتویٰ وہیں رکھ دیا اور چلے گئے۔ جب شاہ عبدالعزیز واپس تشریف لائے اور اسے ملاحظہ فرمایا تو بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ علم ابھی ہمارے خاندان میں باقی ہے[17]"

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا رشید الدین صاحب[18] ایک دفعہ درس دیتے ہوئے طلبہ سے فرمانے لگے کہ مولانا اسمٰعیل کو دینیات کے ساتھ شغف ہے۔ باقی معقولات کی

طرف توجہ نہیں ہے اتفاقاً مولانا شہیدؒ کو ایک دن بخار آ گیا اور مولانا رشید الدین صاحب عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا شہیدؒ فرمانے لگے کہ مولانا آج بخار میں دماغ پریشان تھا اور اس پریشانی اور انتشار کی حالت میں فلاسفہ کے فلاں فلاں مسئلہ کی طرف ذہن منتقل ہو گیا اور ان مسائل پر میرے دل میں یہ یہ اعتراضات پیدا ہوئے مولانا رشید الدین خاں صاحبؒ بالکل ساکت رہے۔ واپس ہوتے پر ان کے تلامذہ نے کہا کہ آپ تو فرماتے تھے کہ مولانا اسمٰعیلؒ کو معقولات کی طرف کوئی توجہ نہیں، فرمایا کہ بے شک میں نے یہ کہا تھا مگر اب میری رائے یہ ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون بھی قبر سے نکل کر آ جائیں تو مولانا کے بیان کردہ اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے[19]۔ اس واقعہ کو شاہ عبدالقادرؒ کے اس واقعہ سے ملا کر پڑھیئے جو ان کے اور مولوی فضل حق خیر آبادی و مفتی صدر الدینؒ کے مابین رونما ہوا جس کا تذکرہ ہم شاہ عبدالقادرؒ کے حالات میں کر آئے ہیں تو اس کا لطف دوچند ہو جائے گا۔

اس سے سر سید کے اس قول کی بھی تائید ہو جاتی ہے جو انہوں نے آپ کے رسالۂ منطق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ نے اس میں شکل اول کے لعبید الطبائع اور شکل رابع کے ابدہ البدیہات ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے دلائل اس قوت و استحکام کے ساتھ مذکور فرمائے کہ اگر معلم اول موجود ہوتا تو اپنی براہین کو تارِ عنکبوت سے سست تر سمجھتا[20]۔"

مولانا فضل حق صاحبؒ خیر آبادیؒ[21] نے آپ کی شہادت کی خبر سن کر کہا تھا:

"وہ امتِ محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شیئی نہ تھی جس کی انیت اور لمیت اس کے ذہن میں نہ ہو[22]۔"

اسی وجہ سے تو حضرت والاجاہ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے لکھا ہے:۔

"در علوم معقول و منقول یاد پیشینیاں از خاطر می برد۔ در علم فروع و اصول آئمہ آں را دور تر می نشاندہ۔ در ہر علم کہ با او سخن رانی دانی کہ وے امام ایں فن است و در ہر فن کہ باوے مناظرہ کنی، شناسی کہ وے

معقول و منقول میں اگلے لوگوں کی یاد بھلا دیتے تھے فروع و اصول میں ائمہ کو پرے پرے بٹھا دیتے تھے۔ جس علم میں ان سے بات کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ اس فن کے امام ہیں اور جس فن میں ان سے مناظرہ کی نوبت آئے

حافظ ایں علم است ..... تمام عمر خود را در
اعلائے کلمۃ اللہ و احیاء سنن رسول اللہ و
جہاد فی سبیل اللہ و ہدایت خلق اللہ گزرانید
و لے بآرام در جائے از بلاد اسلام نیاسود۔

گی تو جان لوگے کہ وہ اس کے حافظ ہیں....
ساری عمر خدا کے کلمہ کی سربلندی، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن کے احیاء، راہ خدا میں
جہاد اور خلق خدا کی ہدایت میں گزار دی اور کسی اسلامی
مقام پر ایک لمحے کیلئے بھی آرام نہ فرمایا۔

یہ تو برسبیل تذکرہ چند اقوال آگئے ورنہ جہابذہ علماء کرام اور اساطین علم وفضل نے تحسین و آفرین کے پھولوں کے جو گلدستے آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں ان کا تذکرہ ہم آئندہ ایک مستقل باب میں کریں گے۔ یہاں تو یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام صاحبؒ کو بے شمار علوم و فنون میں درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا عبدالحیؒ تفسیر میں، رشید الدینؒ تحریر میں، مرزا حسن علیؒ حدیث میں اور شاہ اسحاقؒ فقہ میں میرا نمونہ ہیں لوگوں کو تعجب ہوا کہ آپ نے اس سلسلہ میں حضرت امام صاحبؒ کا اسم گرامی نہیں لیا؛ چنانچہ آپ سے استفسار کیا گیا تو فرمانے لگے۔ ان کا علم کسی خاص شعبہ میں محدود نہیں، جنہوں نے میرے عہد شباب کا علم دیکھا ہے، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کو دیکھ لو، الغرض علم و فضل میں آپ کا مقام بہت ہی زیادہ بلند تھا اسی وجہ سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ آپ کو "حجۃ الاسلام" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

غیر مستند روایات

بعض لوگوں نے حضرت امام صاحبؒ کی طرف ورزشوں وغیرہ کے متعلق بعض ایسی روایات کا انتساب کیا ہے جو صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہیں مثلاً مرزا حیرت دہلوی نے "حیات طیبہ" کے باب دوم میں شمشیر زنی، نیزہ بازی، پٹے بازی، تیراکی، سواری اور ربنوٹ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ آپ تیز دھوپ میں مسجد فتح پوری کے تپتے ہوئے فرش پر گھنٹوں برہنہ پاؤں چلتے رہتے تھے، کئی کئی روز بھوکے پیاسے رہتے۔ کڑکتے جاڑوں میں برہنہ رہنے کا عادی بنالیا۔ کم سونے کی اتنی عادت پیدا کرلی کہ آٹھ آٹھ دس دس دن تک نہ سوتے تھے یہ سب روایات فرضی معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے بھی جو کہ تحریک مجاہدین کے سلسلہ میں متخصص

(SPECIALIST) کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس باب میں تین عظیم الشان کتابوں کے مصنف ہیں، ان روایات کو غیر مستند قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"شاہ صاحب لاریب ایک غیر معمولی انسان تھے اور ورزشوں یا دوڑنے کے بغیر بھی ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔"[۲۵]

مگر افسوس کہ مولانا مہر مرحوم نے ان روایات کے غیر مستند ہونے کے دلائل ذکر نہیں فرمائے واللہ اعلم بالصواب۔

نکاح

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھی جس کا نام زینبؒ تھا شاہ صاحبؒ نے اسے شاہ رفیع الدینؒ کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؒ عرف مصطفٰی کے نکاح میں دے دیا تھا ان کے ہاں بھی صرف ایک بچی تولد ہوئی جس کا نام کلثومؒ رکھا گیا۔ شاہ عبدالقادرؒ نے کلثوم حضرت امامؒ کے حبالۂ عقد میں دے دی تھی اس طرح ان کو حضرت امام سے کئی نسبتیں پیدا ہو گئی تھیں، اوّلاً یہ کہ وہ آپ کے حقیقی تایا تھے، ثانیاً انہوں نے آپ کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ ثالثاً اپنی نواسی سے آپ کا نکاح کر دیا۔

"حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی زندگی میں کل جائیداد حصص شرعیہ کے مطابق اپنی صاحبزادی اور بھائیوں کے نام کر دی تھی اور ان کی اجازت سے ایک حصّہ حضرت امام کو بھی دے دیا تھا۔"[۲۶]

اولاد

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے ہاں صرف ایک صاحبزادہ گرامی شاہ محمد عمر صاحبؒ نے جنم لیا۔ آپ کی ولادت و نشأت دہلی میں ہوئی تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد مسندِ تدریس پہ رونق افروز ہوئے انتہائی عابد و زاہد اور تہجّد گزار و شب زندہ دار تھے ساری زندگی قناعت، عفاف، توکل، استغناء، تبتل الی اللہ اور دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ گزار دی۔ حتیٰ کہ ابو ظفر تیموریؒ[۲۷] بادشاہ نے اکثر آپ کی ملاقات کی تمنا کی اور اراکینِ سلطنت کے ہاتھ پیغامِ ملاقات بھیج کر قلعہ کو قدوم میمنت لزوم سے نوازنے کی استدعا کی مگر آپ نے جواب میں یہی فرمایا کہ جس باپ کی نسبت سے بادشاہ مجھ سے ملاقات چاہتے ہیں ان کی زندگی اور تقدّس مجھ میں نہیں ہے اسی عذر کے پیشِ نظر آپ کبھی ملاقات کے لیے نہ گئے۔

حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی فرمایا کرتے تھے کہ[28]:۔

"مولانا محمد عمر نہایت عابد و زاہد آدمی تھے نماز نہایت ہی خشوع و خضوع سے ادا کرتے، رکوع و سجود میں اتنا مکث طویل کرتے کہ آدمی سبحان ربی العظیم، سبحان ربی الاعلیٰ ۲۷-۲۸ بار پڑھ لیتا۔[29]"

خاں امیر شاہ صاحبؒ نے مفتی صدر الدین صاحبؒ کی زبانی یہ بیان فرمایا ہے مشہور تھا کہ مولوی محمد عمر صاحبؒ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیارت ہوتی ہے اس پر میں اور امام صاحبؒ جامع مسجد اور دو دوسرے اشخاص نے اصرار کیا کہ ہم کو بھی زیارت کرا دیجئے مگر مولوی محمد عمر صاحب نے منظور نہ کیا لیکن ہم نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا۔ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد کے منبر پر تشریف فرما ہیں اور مولوی محمد عمرؒ آپؐ کو مورچھل جھل رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر الدین آؤ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرلو اور بعینہٖ یہی خواب امام صاحبؒ نے دیکھا اور اسی طرح ان دوسرے اشخاص نے دیکھا۔ جب صبح ہوئی تو میں امام صاحب کی طرف چلا تاکہ ان سے یہ خواب بیان کروں اور وہ اپنا خواب بیان کرنے کے لیے میری طرف چلے اور وہ دوسرے اشخاص بھی جاری طرف چلے۔ اتفاق سے راستہ میں ایک مقام پر ہم سب مل گئے اور میں نے کہا کہ میں تمہارے پاس جا رہا تھا۔ رات میں نے یہ خواب دیکھا ہے انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے پاس آرہے تھے ہم نے بھی بعینہٖ یہی خواب دیکھا ہے اب ہم سب مل کر مولوی محمد عمر صاحبؒ کے مکان پہ آئے تو اس وقت مولوی صاحبؒ اپنے مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے ہم نے ان سے یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں ایسا نہیں ہوں اور یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے۔[30]

آپ کے اساتذہ کرام میں سے صرف حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کا اسم گرامی معلوم ہو سکا ہے آخرکار اس مجسم اخلاص و للہیت اور پیکر زہد و اتقاء نے ۱۲۶۸ھ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور اس طرح خاندان شہیدؒ کا خاتمہ ہو گیا۔ اگرچہ روحانی اعتبار سے تمام برصغیر پاک و ہند اسی دودمان عالی سے منسلک ہے مگر آہ! جسمانی طور پر اس گنج گراں مایہ کا نایاب ہو جانا کس قدر افسوس ناک ہے۔[31]

اے فلک یوں بھی مٹاتے ہیں کسی عاشق کو
قیس کا نقشِ قدم تک نہ بیاباں میں رہا

حضرت سیّد احمد کا آغازِ بیعت

حضرت سیّد[۳۱] احمدؒ کو دہلی میں تشریف لائے ہوئے ابھی تھوڑی مدت ہی ہوئی تھی کہ آپ نے بیعتِ طریقت لینے کا سلسلہ شروع فرما دیا اور یہ ۱۲۳۴ھ بمطابق ۱۸۱۸ء کی بات ہے آپ کے دستِ حق پرست پر سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت مولانا محمد یوسف[۳۲] صاحب پھلتی تھے۔ آپ نے حضرتِ امام صاحبؒ اور حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ[۳۳] سے پہلے بیعت کی اور ترقی درجات و بلندی مراتب میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ یہ دونوں مقدس شخصیتیں بھی آپ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں آپ کے بعد یہ دونوں بزرگ بھی بیعت ہوگئے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ایک روز مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اسرارِ نماز اور حضورِ قلب کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے گفتگو کی۔ انہوں نے فرمایا کہ تصوف و اخلاق کی کتابوں میں ان امور کی تشریح موجود ہے مثلاً "احیاء علوم الدین" وغیرہ لیکن مرشد کامل کے بغیر حصولِ مقصد مشکل ہے اور اس کے لیے انہوں نے حضرت سید صاحبؒ کی طرف رجوع کا مشورہ دیا[۳۴]۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کے مشورہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فوراً حضرت سید صاحبؒ کی طرف رجوع کیا اور خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو حضرت سید صاحبؒ فرمانے لگے:۔

نماز کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ربِ ذوالجلال والاکرام نے حضرتِ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کے سر پر تاجِ خلافت رکھا ہے لہٰذا اسے حکم دیا کہ اس کے دربارِ عالی میں روزانہ حاضری دے ورنہ غیر حاضری کی صورت میں سخت باز پرس کی جائے گی۔ پس نماز اس شہنشاہِ عالی کے بلند مرتبت دربار میں حاضری سے تعبیر ہے۔ لہٰذا نماز پڑھتے وقت یہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے کہ میں کس ذاتِ اقدس کے دربار میں حاضری دے رہا ہوں اس دربار کے تقدس کا تقاضا ہے کہ انسان پاک اور طیب لباس زیب تن کرے اور ہر طرح کی صفائی، پاکیزگی، نظافت

اور طہارت کا خیال رکھے اسی لیے قبل از نماز وضو ضروری قرار دیا گیا اور اگر ضرورت ہو تو غسل بھی۔ پھر نماز میں خشوع و خضوع کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر رکن کے مضمون پر غور کیا جائے اور جس سورہ کی تلاوت کی جارہی ہو اس کے مضامین پر بھی تدبر کیا جائے۔

دربارِ الٰہی میں انتہائی عقیدت، احترام تعظیم اور اخلاصِ نیت سے کھڑا ہونا چاہیئے اور تصور یہ ہو کہ میں ہر طرف سے اپنے رُخ کو پھیر کر صرف اور صرف اسی کی طرف مڑ رہا ہوں اور جس طرح چہرہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے ایسے ہی رُوح کی توجہ بھی ذاتِ اقدس کی طرف ہونی چاہیئے یعنی نماز پڑھنے والے کو ظاہری و باطنی ہر طرح سے خدا سے لو لگا لینی چاہیئے۔

جب قبلہ رو ہو کر دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور اللہ اکبر کہے تو تصور میں یہ ہو کہ اے اللہ! میں دنیا و مافیہا سے دستبردار ہو کر تیری طرف متوجہ ہو رہا ہوں اور دونوں ہاتھ سینہ پہ باندھ کر نہایت خشوع و خضوع اور ادب سے کھڑا ہو اور تصور یہ ہو کہ اس شہنشاہِ عالی کے دربار میں کھڑا ہوں جو کہ میری تمام حرکات و سکنات کا مشاہدہ فرما رہا ہے۔

پھر دعائے استفتاح پڑھے چونکہ شیطانِ لعین انسان کا ازلی و ابدی دشمن ہے جو ہر وقت اسے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے دُور کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے لہٰذا اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ وہ کہیں بہکا نہ دے تعوذ پڑھنا ضروری قرار دے دیا گیا اور اس کے بعد سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورۃ تلاوت کرے اور پھر ارادۂ پابوسی کرتے ہوئے اللہ اکبر کہہ کر دربارِ الٰہی میں جُھک جائے اور خیال میں ہو کہ اے اللہ! تیری عظمت و جلال کے پیشِ نظر میری کمر جھک گئی اور زبان نے "سبحان ربی العظیم" کا نغمہ الاپ رہا ہو۔ جب رکوع میں حضوری کی سی کیفیت پیدا ہو جائے تو "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتا ہوا سیدھا کھڑا ہو جائے اور دل میں خیال یہ کرے کہ اے اللہ! میں تیری اطاعت و فرمانبرداری پر مستقیم ہو گیا ہوں۔ اب پھر ارادۂ پابوسی سے "اللہ اکبر" کہتا ہُوا سجدہ ریز ہو جائے اور "سبحان ربی الاعلیٰ" کا بار بار اس تصور سے ورد کرے کہ اے اللہ! میں نے اپنے اعضاء میں سب سے افضل یعنی سر کو تیرے آستانۂ عالیہ پر رکھ دیا ہے ؎

زندگی کی اب یہی سب سے بڑی ہے آرزو
ہو جبینِ شوق میری اور تیرا آستاں

سجدہ چونکہ تقرب الٰہی اور انوار و تجلیات کے نزول کا محل ہے اس لیے بندہ ہیبت خداوندی کے سبب تمام مضمون ایک مرتبہ عرض کرنے سے قاصر ہے اس لیے حکم ہوا کہ کچھ دیر ٹھہر کر دوسری بار پھر عرض کرے اسی وجہ سے سجدہ سے سر اٹھا کر کچھ دیر بیٹھنا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے "اللّٰھم اغفرلی وارحمنی واھدنی وارزقنی وارفعنی واجبرنی"[36] پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ ریز ہو جائے۔ اسی طرح دوسری رکعت پڑھے اور خیال میں ہو کہ اب میں دربار الٰہی میں بیٹھنے کے قابل ہو گیا ہوں اور قعدہ میں بیٹھ جائے چونکہ ایسے عظیم الشان اور جلیل القدر دربار میں خاموش بیٹھنا سو ادب ہے لہذا قعدہ میں بیٹھے بیٹھے ذکر الٰہی میں رطب اللسان رہنے کا حکم ہوا "التحیات للّٰہ" الخ پھر خیال کرے کہ اب دربار خداوندی سے رخصت کا وقت آ گیا لہذا سرور دنیا و دین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف اور اپنے لیے دعا کے بعد دائیں بائیں کے نمازی بھائیوں اور فرشتوں کو سلام کہتا ہوا رخصت ہو جائے۔ یہ کیفیت بیان کرتے ہوئے آخر میں سید صاحب نے فرمایا:۔

مولانا صاحب! حصولِ ایں مقصد بہ گفتگو راست نمی آید۔ ہمیں نماز است کہ در بدو نبوت سید الانبیاء را صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل امین بحکم رب العالمین برائے تعلیم آں امامت فرمودہ اند۔ بیا برخیزد تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدا یم بہ بند مولانا علیہ الرحمۃ حسب المأمور بہ عمل آوردہ تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدائے آں عالی جناب بربستند۔ دریں مقام اکثر آں عالی مقام، (مولانا عبدالحی) بیان مے فرمودند کہ آنچہ درآں دو رکعت یافتہ ام ہیچ گاہ در عمر خود نیافتہ ام[37]۔

مولانا صاحب! یہ مقصد گفتگو سے حاصل نہیں ہو سکتا یہی نماز ہے جو حضرت جبرئیل امین نے بحکم رب العالمین امام بن کر حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء نبوت میں پڑھائی تھی۔ اٹھیے اور دو رکعت نماز میری اقتداء میں پڑھیے۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے حسب حکم سید صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی اقتداء میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی۔ اور آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں جو کچھ حاصل ہوا وہ ساری زندگی حاصل نہ ہو سکا۔

مولانا کرامت علی صاحب جون پوری[۳۸] نے اس بارے میں مولانا عبدالحی صاحبؒ کا جو بیان اپنی کتاب "نورٌ علیٰ نور" میں نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحی نے سلوک الی اللہ کے متعلق شاہ عبدالعزیزؒ سے استفسار کیا تو انہوں نے حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ[۳۹] کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا ہر چند کہ تصوف و سلوک میں حضرت شاہ صاحب موصوف کا مقام بہت بلند تھا لیکن مولانا محترم کی تسلی نہ ہوئی تو شاہ عبدالعزیزؒ نے سید صاحب کی طرف مراجعت کے لیے کہا۔ چند روز بعد سید صاحبؒ، مولانا عبدالحی اور حضرت امام صاحبؒ رات کو مدرسہ میں سوئے ہوئے تھے کہ آدھی رات سے کچھ قبل حضرت سید صاحبؒ نے مولانا کو آواز دی اور فرمایا اٹھیے اور اس وقت اللہ کے لیے وضو کیجیے، دو تین قدم چلنے کے بعد روک کر بار بار فرمایا اور پھر فرمایا کہ اللہ کے لیے نماز پڑھیے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ سن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں مشاہدہ جلال میں اس طرح غرق ہوا کہ کچھ ہوش باقی نہ رہا۔ اور روتے روتے آنسوؤں سے داڑھی تر ہو گئی۔ جب دو رکعت نماز پڑھ چکا تو خیال آیا کہ فاتحہ نہیں پڑھی پھر نیت باندھ لی غرض اسی طرح بار بار کسی فرض کے ترک کا خیال آتا اور میں از سر نو نیت باندھ لیتا اس طرح کم و بیش سو رکعت پڑھ لیں پھر استغفار پڑھنے لگا حتیٰ کہ صبح ہو گئی[۴۰]۔

سید صاحبؒ سے بیعت

حضرت مولانا عبدالحیؒ نے صبح اپنا تمام ماجرا حضرت امام صاحبؒ سے کہہ سنایا حضرت نے سماعت فرماتے ہی مولانا کو ساتھ لیا اور حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں جا پہنچے۔ آپ نے حضرت امام صاحبؒ کو بھی مولانا صاحبؒ کی طرح دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی دن سے ان دونوں مقدس شخصیتوں نے حضرت سید صاحبؒ کے دامن کو اس طرح تھاما کہ تازیست جدا نہ ہوئے صاحب "انوار العارفین" نے بھی لکھا ہے۔

> "شاہ اسمٰعیلؒ اور مولانا عبدالحی اکٹھے امتحان کی غرض سے سید صاحبؒ کے پاس پہنچے اور نماز میں حضورِ قلب کے متعلق سوال کیا تھا سید صاحبؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا آج رات میرے حجرے میں آ کر میرے پیچھے دو رکعت نماز ادا کیجیے؛ چنانچہ دو رکعت نماز سید صاحبؒ کے ساتھ

پڑھ چکنے کے بعد دو رکعتوں کی نیت باندھ لی۔ سید صاحبؒ کی صحبت اور حقانی توجہ کی برکت سے ساری رات استغراق میں گزار دی بس اس وقت سے ایسے معتقد ہوئے کہ پھر ساتھ نہ چھوڑا۔[۱]"

ہنٹر صاحب نے بھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"سید احمد صاحبؒ کے پہلے دو مرید وہ شخص تھے جو اپنے لاثانی ضمیری جوہروں اور اعلیٰ قابلیتوں میں اپنے وقت کے فرد اکمل تھے یہ دونوں فرد اکمل دہلی کے سب سے بڑے حکیم یا فاضل اجل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے کنبے سے تعلق رکھتے تھے۔[۲]"

لیکن یاد رہے کہ یہ دونوں بزرگ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ پھلتی کے بعد حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ حضرت امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے بیعت کیے ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت والا درجت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ میاں! سید کے فیضِ صحبت سے جو نعمتیں حاصل ہوئیں ان کی کیفیت بیان کرو۔ میں نے عرض کیا کہ سیدِ عالی تبار کے رتبے کا اندازہ میرے لیے مشکل ہے، البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے آپ پر خاص احسان فرمایا جس کا شکر واجب ہے۔ آپ کو دو علم عطا فرمائے تھے علمِ ظاہر کے حامل شاہ عبدالقادرؒ تھے علمِ باطن کی وراثت سنبھالنے کے لیے خدا نے سید صاحبؒ کو کھڑا کر دیا یہ سن کر شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے بارے میں کلماتِ عجز کہے، پھر فرمایا :۔

میاں! یہ بات سمجھنے کے لائق ہے۔ بارگاہِ احدیت کے محب بہت ہیں محبوب کمیاب ہیں۔
میں نے عرض کیا کہ جناب رسالت مآبؐ حبیب ربُّ العالمین تھے۔

فرمایا : مرتبۂ محبوبیت مرتبۂ رسالت کی طرح نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہو۔
میں نے عرض کیا : مثلاً محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانیؒ

فرمایا : محبوبیت کا مرتبہ سید عبدالقادر جیلانیؒ پر بھی ختم نہیں ہوا۔ محب ہمیشہ بلا و محنت اور رنج و الفت میں مبتلا رہتے ہیں اس کے برعکس محبوبوں کو کوئی تکلیف نہیں دیتا بلکہ ان کے راحت و آرام کو دل و جان سے پسند کیا جاتا ہے۔ رب العالمین کے محبوبوں کو اکثر سرگردانی و پریشانی لاحق

رہتی ہے، لیکن محبوبانِ بارگاہِ اقدس دنیا میں البنئہ فاخرہ، اطعمہ لذیذہ اور خدم و حشم سے ممتاز رہتے ہیں اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ انعام پاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے سید صاحبؒ کا نام تو نہ لیا لیکن تمام اشارے بداہتہً آپ ہی کی طرف تھے۔[۴۲]

تدریس

انہی دنوں یعنی ۱۲۳۰ھ میں آپ کے مربی، مشفق استاد اور عم محترم حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے اب حضرت امام صاحبؒ نے علوم و فنون کی تدریس کا بیڑا اٹھایا اور خاندانی روایات کے مطابق مسندِ تدریس کی زینت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے چار چاند لگا دیئے۔

چنانچہ مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہرویؒ رقمطراز ہیں :-

> "آپ نے اپنے آبائی دارالتعلیم "مدرسہ رحیمیہ" کی مسند پر تمکین کے ساتھ ہی قرآن و حدیث کی تدریس شروع فرما دی۔ نصاب میں منجملہ کتب مروجہ علوم و فنون کے ایک جامع النصاب کتاب (کہ اس وقت کے مکاتب میں اس کا وجود نہ تھا) یعنی قرآنِ مجید گلے میں آویزاں شہر کا ہر کوچہ و بازار مدرسۂ رحیمیہ کے ملحقہ مدارس ہیں۔ موسم برسات میں یہ مدرسہ دریائے جمن پر منتقل ہو جاتا ہے کہ سیدنا اسمٰعیل دریا میں پیراکی کی مشق بھی فرما رہے ہیں اور طلباء کو بھی پڑھا رہے ہیں۔ آخر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر شاہ محمد اسمٰعیل صاحبؒ کا یہ درس، درس خارجی (جسے آج کل لیکچر کہا جاتا ہے) کی شکل میں ہونے لگا۔ اس کی گونج ادھر بہار، بنگال و دکن تک اور ادھر پنجاب کی وادیوں سے گونجتی ہوئی کوہستانِ ہمالہ کے اس حصہ سے جا ٹکرائی جو کشمیر اور کابل کے درمیان پھیل رہا ہے۔"[۴۳]

لیکن افسوس کہ آپ کو تدریس کے لیے بہت کم وقت میسر آیا کیوں کہ آپ سید صاحبؒ اور دیگر احباب و رفقاء کی معیت میں شوال ۱۲۳۶ھ بمطابق ۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء کو فریضہ

حج ادا کرنے کے لیے رائے بریلی سے سوئے حجازِ مقدس روانہ ہو گئے اور دو سال، دس مہینے کے بعد ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ بمطابق ۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو وطن واپس تشریف لائے اور مراجعت کے بعد ہمہ تن جہاد کے انتظام میں مصروف ہو گئے اور صراحت اور تفصیل کے ساتھ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے دورانِ تدریس کن کن کتابوں کا درس دیا اور کن کن حضرات نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ تاہم ان لوگوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے جنہوں نے آپ کے لیکچرز اور وعظ و ارشاد کی محفلوں میں شرکت کر کے آپ کے علم و فضل سے استفادہ کیا۔ اسی طرح بقول مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان لوگوں کی تعداد بھی دو اڑھائی لاکھ سے متجاوز ہے جو "تقویۃ الایمان" کا مطالعہ کر کے آپ کی حیاتِ طیبہ میں ہی درست ہو گئے۔ اور آپ کے بعد اس سے خلقِ خدا کو جو نفع ہوا اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

تلامذہ

جیسا کہ ذکر کیا گیا صراحت اور تفصیل کے ساتھ آپ کے تلامذہ کے متعلق علم نہیں ہو سکا۔ تاہم جستجو اور تلاش کے بعد آپ کے جن تلامذہ کا سراغ مل سکا ہے ان کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔

(۱) حضرت سید احمد شہید (۲) مولانا سخاوت علی جونپوری (۳) مولانا عبدالحق بنارسی، (۴) مولانا عبداللہ علوی (۵) مولانا عبدالہادی جھوکوی (۶) سید محمد بن اعلیٰ نصیر آبادی (۷) مولانا معین الدین سہسوانی (۸) مولانا وحید الدین پھلتی (۹) مولانا ولایت علی صادقپوری (۱۰) مولانا کرامت علی دہلوی (۱۱) مولانا جعفر علی بستوی (۱۲) مولانا جلال الدین بنارسی۔

اب ان حضراتِ گرامی کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے، وبیدہ التوفیق

حضرت سید احمد شہیدؒ

حضرت امام ہمام مجاہد کبیر شہید سعید سید احمد بن عرفان بن نور حسنی بریلویؒ، شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد مدنیؒ کی اولاد میں سے تھے اور آپ کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے سیدنا امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک جا پہنچتا ہے آپ ۶ صفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیر کے دن رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں آپ کو مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ لیکن کوششوں کے باوجود آپ کی طبیعت تحصیلِ علم کی طرف مائل نہ ہوئی

لیکن اس کی وجوہ معلوم نہیں ہو سکیں اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ تمام عمر ناخواندہ ہی رہے جیسا کہ بعض لوگوں نے امیت کا افسانہ مشہور کر رکھا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ عربی فارسی بخوبی جانتے تھے۔ جب ۱۲۲۲ھ میں دہلی گئے اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے آپ کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ کو خوش آمدید کہا اور اپنے بھائی عبد القادرؒ کے پاس اکبر آبادی مسجد میں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا وہاں آپ نے شاہ عبد القادرؒ سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں پھر شاہ عبد العزیزؒ سے بیعت کی حتیٰ کہ علم و معرفت میں آپ کو بہرہ وافر نصیب ہو گیا۔ اس وقت آپ کے مفصل حالات بیان کرنا مقصود ہے اور نہ اس کی گنجائش آپ کے سوانح حیات میں کئی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔

اس وقت یہ بیان کرنا مطلوب ہے کہ حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن بہت سی سعادتوں سے نوازا ان میں سے ایک قابل فخر یہ بھی ہے کہ آپ کے پیر و مرشد حضرت امیر المومنین سید احمد شہیدؒ نے بھی آپ سے کسب فیض کیا، تعلیم حاصل کی،/ اور آپ کے تلامذہ میں شامل رہے چنانچہ امیر شاہ خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ :۔

> "میرے استاد میاں جی محمدی صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں نے مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ سے "کافیہ" شروع کیا تھا۔ اور سید صاحبؒ جب تشریف لائے تو انہوں نے شاہ اسحٰق صاحبؒ سے "میزان" شروع کی تھی اور اتنی جلدی ترقی کی کہ نصف سے آگے مجھے "کافیہ" میں پکڑ لیا اور "کافیہ" ہی پڑھتے ہوئے انہوں نے "مشکوٰۃ" بھی شاہ صاحبؒ سے شروع کر دی اور کوئی کتاب مولوی اسمٰعیل صاحبؒ سے بھی پڑھتے تھے"[۱]

مولانا سخاوت علی جونپوریؒ

مولانا سخاوت علی بن رعایت علی بن درویش علی بن نذر علی عمری جونپوریؒ مشہور علماء میں سے ہیں۔ آپ ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے چھوٹی کتابیں مولانا قدرت علی ردولویؒ سے اور متوسط مولانا احمد اللہ انامیؒ اور مولانا احمد علی چڑیا کوٹیؒ سے پڑھیں۔

جب کہ معقولات کی تعلیم آپ نے حضرت امام محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڑھانوی رح سے حاصل کی۔ حضرت سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور کچھ مدت تک ان کے ساتھ رہے پھر جونپور واپس آگئے اور شیعہ سے جامع مسجد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور وہاں جمعہ، جماعت اور قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مدرسہ کا انتظام کیا۔ پھر آپ باندا چلے گئے اور دو سال تک درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد جونپور واپس تشریف لے آئے ۱۲۶۴ھ میں اپنے خالو مفتی محمد غوث جونپوریؒ کے ساتھ حرمین شریفین چلے گئے اور حج و زیارت کے بعد واپس وطن تشریف لے آئے اور سات آٹھ سال تک درس و تدریس کی محفلوں کو گرم رکھنے کے بعد ۱۲۷۲ھ میں اپنے اہل و عیال سمیت مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور وہیں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

آپ بہت بڑے عالم، محدث، فقیہہ اور زاہد تھے گوناگوں اوصاف حمیدہ کے مالک تھے، خلق خدا نے آپ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ آپ کی تصنیفات میں سے "القویم فی احادیث النبیؐ الکریم" اور منطق کی ایک کتاب "الأسلم" کے نام ملتے ہیں نیز آپ نے ناسخ و منسوخ معرفت اوقات نماز، ہیئت اور فقہ و سلوک کے متعلق بھی چند رسائل تصنیف فرمائے ۶ر شوال ۱۲۷۴ھ میں مکہ معظمہ میں آپ کا انتقال ہوا۔

شیخ عبدالحق محدث بنارسی

حضرت شیخ عبدالحقؒ بن فضل اللہ عثمانی بنارسیؒ قصبہ نیوتن ضلع اناؤ میں ۱۲۰۶ھ میں متولد ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار نیوتن سے ترک سکونت کر کے بنارس میں قیام پذیر ہوگئے آپ نے پہلے اپنے والد صاحب اور دیگر علماء سے پڑھا اور پھر علمی تشنگی کو تسکین بخشنے کے لیے دہلی روانہ ہوگئے اور وہاں آپ نے شیخ عبدالقادر محدث دہلویؒ، مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور حضرت امام صاحبؒ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں فراغت کے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے۔ پھر دوبارہ سید صاحبؒ، حضرت امام صاحبؒ اور دیگر رفقاء کے ساتھ حج کے لیے گئے، ان دنوں ارباب حکومت نجدیوں سے بہت زیادہ بگڑے ہوئے تھے ان کے ساتھ جنگ کو ختم ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا، اگر کوئی شخص موحدانہ عقائد کی اشاعت

میں سرگرم نظر آتا اور بدعات کی تردید میں سختی سے کام لیتا تو اسے "وہابی" سمجھ کر فوراً انتقام کے شکنجہ میں کس دیا جاتا۔ مولانا عبدالحق صاحبؒ بہت تیز مزاج تھے آپ غیر شرعی رسوم کی تردید بہت سختی سے کرتے تھے بعض حنفی دوستوں نے شکایت کر دی کہ یہ وہابی ہیں ! چنانچہ آپ پر مقدمہ قائم کر دیا گیا لیکن مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے ضمانت دے کر چھڑا لیا، جواب دہی کے موقع پر بھی مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے ہی عدالت میں بات کی۔ جدہ میں آپ رفقاء سے جدا ہو گئے اور صنعاء یمن چلے گئے وہاں سے آپ امام قاضی محمد بن علی شوکانیؒ قاضی عبدالرحمٰن بن حسن بھکلیؒ، شیخ عبداللہ بن محمد بن اسمٰعیل امیر یمانیؒ اور شیخ محمد بن عابد احمد علی سندیؒ سے ۱۲۳۸ھ میں حدیث کی سندیں حاصل کر کے ہندوستان آئے، آپ نے سات مرتبہ حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا، آخری سفر دنیا سے بھی سفر ثابت ہوا۔

آپ نے اپنے سفرِ یمن کے حالات کو ایک رسالہ میں لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ طیبہ سے جب یمن کی طرف امام شوکانیؒ کی زیارت کے لیے رختِ سفر باندھا تو راستہ میں بے پناہ مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرتے ہوئے صنعا پہنچ گئے جب امام موصوفؒ سے ملاقات ہوئی تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور فرمانے لگے عمر کیا ہے؟ پڑھا کیا کچھ ہے؟ جب میں نے جواب دیا تو انہوں نے اپنی تصنیفات کا ایک ایک نسخہ عنایت فرمایا اور ان کے مطالعہ کے لیے کہا۔ میں ہفتہ میں سوموار اور جمعرات دو دن آپ کی خدمت میں حاضری دیتا اور سماعت کرتا حتیٰ کہ اس اثناء میں بیمار پڑ گیا جب اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عنایت فرمائی تو امام شوکانیؒ کسی سفر کے لیے تیاری کر رہے تھے میں الوداع کہنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ بڑی شفقت سے پیش آئے، میں نے کچھ کتابوں کے بعض حصے آپ کے پاس پڑھے تو آپؒ نے اپنے دستِ مبارک سے سندِ اجازت لکھ کر مجھے عنایت فرمائی نیز آپ نے مجھے اپنی سند "اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر" دی اور فرمایا اسے نقل کر لو چنانچہ میں نے اسے نقل کر لیا۔ یہ جمعۃ المبارک ۱۰ جمادی الآخرہ ۱۲۳۸ھ کا واقعہ ہے۔

مولانا عبدالحق صاحبؒ نے ایک رسالہ میں شیخ محمد عابد سندھیؒ کی اسانید اور ایک دوسرے رسالہ میں سید عبداللہ بن محمد امیر سماقیؒ سے ملاقات کے واقعات وغیرہ کو بھی ذکر کیا ہے۔ سید امیر سماقیؒ نے بھی آپ کو سند عطا فرمائی۔

اسی طرح آپ نے ایک رسالہ میں قاضی عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن بھکلیؒ سے ملاقات کے واقعات کو قلم بند کیا ہے قاضی موصوف نے آپ کو منظوم سند مرحمت فرمائی۔

مولانا عبدالحق صاحبؒ مقلد نہ تھے بلکہ مجتہد تھے اور نصوصِ کتاب وسنت پر عمل پیرا تھے اسی وجہ سے علماء احناف سے مسئلہ اجتہاد و تقلید کے متعلق آپ کے مباحثے ہوتے رہتے تھے اس موضوع پر آپ نے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جس کا نام " الدر الفرید فی المنع عن التقلید " ہے۔

جمعرات کی شب مؤرخہ ۲ ذوالحجہ ۱۲۷۶ھ کو منیٰ میں حالتِ احرام میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور جمعہ کی رات مسجدِ خیف کے دروازہ کے پاس دفن کیے گئے اللھم اغفرلہٗ وارحمہٗ۔

مولانا عبداللہ علوی

مولانا عبداللہ بن قاسم علی خاںؒ جہابذہ علماء کرام میں سے تھے۔ آپ کا اصلی وطن مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد تھا۔ چونکہ بچپن سے ہی بود و باش دہلی میں رہی اس لیے یہی وطن ملو گیا آپ نے دیگر علماء کے علاوہ حضرت امام صاحبؒ سے بھی علم کی تحصیل کی، ادب، شعر، انشأ، طب اور دیگر فنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے، سرسید لکھتے ہیں :-

" بسبب استعداد خداداد کے ہر فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے خصوصاً نظم و نثر تازی و دری میں اور چونکہ فن فارسی میں خواہ باعتبار انشاء نظم و نثر کے خواہ اعتبار درس و تدریس کے مزاولت بکمال اور مشغولی اوقات بہت رہتی تھی۔ اسی فن کی نسبت سے شہرت پائی تھی اگر اعتساف و کجی سے دور اور حسد و رشک سے خالی ہو کر اس زبدۂ ارباب کمال کا حال دیکھا جائے اور رتبۂ سخن پر نظر کی جائے تو

معلوم ہو کہ ذاتِ تقدس آیات اس صاحبِ استعداد کی کیا جوہر قدسی تھی کہ یہ کار دورِ فلکی بعد ہزار گردش کے بھی ایسا نقش پیدا نہیں کر سکتی اگر نظم ہے رنگین تر از گل ہے اور اگر نثر ہے مطبوع تر از مل ہے۔ کاغذ ان کی بیاض کا بسببِ شگفتگیِ معنی کے گل سے خنداں تر اور قلم بسبب رفتار دل کش کے سرو سے خراماں تر، سطور تازگیِ مضامین سے موجِ سبزہ سیراب اور نقاط بسبب کیفیت معنی کے قطرات شراب زبان قلم ترانہ ہائے شیریں سے بلبل اور اوراق سفینہ مضامین رنگین سے برگِ گل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مولانا عبدالغنی خاں رقم طراز ہیں :-

"علوی مولوی عبداللہ خاں مولدش مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد در سنِ صغر با پدر بہ دہلی رفت و کسبِ علوم و تکمیلِ فنون از علمائے نامدار آں دیار نمود جامع اکثرے از فضائل بود در انشاء و سخنوری قدرت تمام داشت امام بخش صہبائی و محمد حسین مہجور ناظم اندور و مولوی امین الدین خاں امین دہلوی شاگرد آں او شیدہ۔ با شیخ ابراہیم ذوق و مومن خاں کمال اتحاد و ارتباط داشت انشائے صغیر و صحت نامہ از مصنفات شریفہ او ست بقرابت قریبہ خال مولف خاکسار بود، در عمرِ آخر عمر بوطن مراجعت نمود و ہماں جا فوت شد انتہٰی"

علوی مولوی عبداللہ خاں کی جائے ولادت مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد ہے آپ بچپن میں ہی اپنے والد کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کے نامور علماء کرام سے کسبِ علوم اور تکمیل فنون کی۔ آپ اکثر فضائل کے جامع تھے۔ انشاء و سخنوری میں مہارت تامہ رکھتے تھے امام بخش صہبائی، محمد حسین مہجور ناظم اندور اور مولوی امین الدین خاں امین دہلوی آپ کے شاگرد ہیں شیخ ابراہیم ذوق اور مومن خاں کے ساتھ کمال اتحاد و ارتباط رکھتے تھے" انشائے صغیر" اور "صحت نامہ" آپ کی تصنیفات ہیں قرابتِ قریبہ کی وجہ سے خاکسار مؤلف کے ماموں تھے آخر عمر میں وطن تشریف لائے اور وہیں فوت ہو گئے۔

آپ سید احمد صاحبؒ سے بیعت بھی تھے اُردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن اصلاً فارسی کے شاعر تھے آپ کی نظم و نثر کے کچھ نمونے "آثار الصنادید" میں دیکھے جا سکتے ہیں سید صاحبؒ کی مدح میں آپ نے درج ذیل اشعار کہے ۔

برخیز ای بہار گلستانِ احمدی — کاندر سرِ زمانہ ہوائے تو یافتند
آں گوہرے کہ حاصلِ صد گنج شائگاں — یک فلس رالکاں زبہائے تو یافتند
آں لالۂ شگفتہ باغ سیادتے — کز گلشن مدینہ صبائے تو یافتند
بگذار کو ہسار باوغاں سنگ دل — کایں ابلہاں نہ قیمت جائے تو یافتند
دریاب ای مسیح کہ دلِ خستگانِ کفر — بنہادہ گوش دل بصدائے تو یافتند
بشتاب ای کلیم کہ لب تشنگانِ دیں — آب جگر بضرب عصائے تو یافتند

امروز سرخروئے اسلام در جہاں
موقوفِ تیغ کفر زدائے تو یافتند

آخر عمر میں جب تشریف لائے تو نواب سید محمد علی خاں بہادر شمس آبادی کے ہاں ملازم ہو گئے تو مدۃ العمر انہیں کے پاس مقیم رہے حتٰی کہ بہ عارضۂ تپِ محرقہ ۱۲۶۲ھ میں انتقال فرما گئے۔ کسی نے آپ کی تاریخ وفات کہی تھی ۔ ۔

علوی کہ چو او ند او کس دادِ سخن — چوں او نرسیدہ کس بفریاد سخن
ناگہہ ز جہاں رخت اقامت بربست — ہاتف گفتہ افتاد بنیادِ سخن ۱۲۶۲ھ

حضرت نواب والاجاہ سید صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب "العلم الخفاق من علم الاشتقاق" کے آخر میں اپنے کتب خانہ سے متعلق ایک فہرست میں آپ کی ایک کتاب "المنہج السدید فی رد التقلید" کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ بزبانِ فارسی ہے چنانچہ فرماتے ہیں "المنہج السدید فی ردِ التقلید" بالفارسی للعالم المتقی عبداللہ خاں بن قاسم علی خاں العلوی تلمیذ الشیخ العلامۃ محمد اسمٰعیل الشہید صاحب تقویۃ الایمان[۵۲]"

یاد رہے کہ حضرت نواب صاحبؒ کے خزانۃ الکتب میں اس کا مخطوطہ تھا کیونکہ یہ کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی۔ آپ نے اپنی کتاب میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے مولانا

امام خاں نوشہروی نے اپنے ایک مقالہ "کتب خانہ امیر الملک میں بمبئی نوادر" میں اس کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ یہ "تقویت الایمان" کی شرح ہے جیسا کہ اس کے متن میں مذکور ہے[۵۵]

مولانا عبد الہادی جھوکوی رح

حضرت مولانا عبد الہادی جھوکوی علاقہ چمپارن کے ایک گاؤں "جھومکا" میں ۱۲۰۵ھ میں ایک بُت پرست گھرانے میں پیدا ہوئے، کتابت، حساب، انشاء، تاریخ اور انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کی نیز اُمورِ سلطنت سے متعلق قوانین کا نہ صرف مُطالعہ کیا بلکہ انہیں ازبر بھی کیا، ایک امتحان کے سلسلہ میں عظیم آباد گئے کہ خوش قسمتی سے حضرت سید احمدؒ کی زیارت ہو گئی۔ آپ ان دنوں حجازِ مقدس کی طرف جاتے ہوئے یہاں فروکش تھے۔ مقدر کا ستارہ چمکا اور آپ حضرت سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے کفر سے تائب اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر خصوصی نوازش یہ بھی ہوئی کہ آپ کو حضرت امام صاحبؒ، مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، سید حسن بن علی بخاری قنوجی[۵۶] اور حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ ایسے کبار ائمہ فن سے تلمذ کی سعادت نصیب ہوئی چنانچہ حضرت سید صاحبؒ نے آپ کو بہار کے علاقہ سارن اور چمپارن میں اپنا نائب مقرر فرما دیا، آپ نے اس علاقہ کے دورے کیے اور حکمت و دانش کے ساتھ دعوت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری کیا چونکہ مسلکِ اہلِ حدیث سے وابستہ اور ائمہ سلف کی روش کے متبع تھے اس لیے مخالفین و معاندین نے ایک محاذ قائم کیا اور آپ کی ایذا رسانی کے درپے ہو گئے لیکن یہ تمام تکلیفیں اور مصیبتیں آپ کے پایۂ استقلال میں قطعاً جنبش پیدا نہ کر سکیں اور اللہ تعالیٰ نے اس علاقہ کے لوگوں کو آپ کے وجودِ مسعود سے بہت نفع بخشا بالآخر سفرِ حج میں تھے کہ بلاوا آ گیا اور ۱۲۶۵ھ میں آپ نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔[۵۷]

سید محمد بن اعلیٰ نصیر آبادیؒ

مولانا سید محمد بن اعلیٰ بن محمد بن تقی بن عبد الرحیم بن ہدایت اللہ حسنی نصیر آبادی بہت بڑے عالم و عابد تھے۔ آپ نے پہلے لکھنؤ کے اساتذہ سے پڑھا اور پھر مزید تحصیلِ علم کے لیے حضرت امام صاحبؒ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی۔ آپ سید صاحبؒ

سے بیعت بھی تھے، ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے مولانا عبدالحیؒ بن فخر الدین صاحب "نزھتہ الخواطر" کے دادا مولانا سید عبدالعلیؒ جو ان کے برادر عم زاد تھے۔ سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ اور بہت سے دوسرے لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا۔ ہفتہ کی رات یکم شعبان ۱۲۸۶ھ میں بعمر ۰ ۷ سال بہ عارضۂ فالج اللہ کو پیارے ہو گئے۔[۵۸]

مولانا معین الدین سہسوانی

مولانا معین الدین بن بخشش الدین انصاری سہسوانیؒ بہت بڑے عالم، خطیب اور عابد و زاہد تھے، ولادت سہسوان میں ہوئی۔ بچپن بھی وہاں گزارا پھر طلب علم کے لیے رامپور چلے گئے اور اساتذۂ وقت سے درسی کتابوں کو پڑھا علمی تشنگی کی تسکین کے لیے کچھ اور شہروں کے سفر بھی اختیار کیے بالآخر حضرت امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور طویل مدت تک ان کے پاس رہ کر فیوض و برکات حاصل کرتے رہے پھر اپنے شہر واپس دعوت و ارشاد میں مصروف ہو گئے اور بلا خوف لومۃ لائم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضوں کو پورا کرنے لگے اس طرح بے شمار خلق خدا کو آپ سے بہت بہت فائدہ پہنچا۔ ۱۲۷۲ھ میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔[۵۹]

مولانا وحید الدین پھلتیؒ

مولانا وحید الدین بن معین الدین پھلتی دہلویؒ عالم باعمل، عبد صالح اور بہت بڑے مجاہد تھے دہلی سے بیس میل کے فاصلہ پر واقع بستی پھلت میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ علم کی تحصیل آپ نے حضرت امام صاحبؒ سے کی نیز تیرہ سال تک آپ کو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کی صحبت بھی نصیب رہی پھر حضرت سید صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان کی معیت میں حرمین شریفین کا سفر کر کے حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ اور پھر سرحد کے سفر میں بھی آپ سید صاحبؒ کے ساتھ تھے۔[۶۰] مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں سید صاحبؒ نے جب مولانا عبدالحی اور امام صاحب سے فرمایا تھا کہ ایسی متبرک مقام میں کچھ علوم دینیہ کا مشغلہ ہونا چاہیے یہ وقت غنیمت ہے۔ تو مولانا عبدالحی صاحبؒ نے حافظ سید محمد کو مشکوٰۃ کا اور امام صاحبؒ نے مولانا

وحید الدین صاحب کو اپنے جدِ محترم کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ" کا درس دینا شروع کیا حتیٰ کہ دونوں مجلسوں میں بڑی کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرنے لگے اور اس طرح عوام الناس کو بھی اپنے عہد کے ان دونوں جلیل القدر علماء سے استفادہ کا موقع ملا۔

مولانا ولایت علی صادقپوریؒ

تعلیم وتعلّم ، حضرت مولانا ولایت علی بن فتح علی بن وارث علی بن محمد بن سعید ہاشمی۔ صادقپوری عظیم آبادیؒ علماء ربانیین میں سے تھے آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں صادقپور کے ایک ممتاز زبیری خاندان میں ہوئی جسے عظیم آباد میں امارت و ریاست کا درجہ حاصل تھا شرفاء ہند کے معمول کے مطابق چار سال کی عمر میں آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا ذہانت و ذکاوتِ وافر سے سات برس کی عمر میں آپ کی استعداد اس حد تک پہنچ گئی کہ اُستاد سے تشفّی نہ ہوتی تھی تو پھر والدِ بزرگوار نے اپنے نونہال کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا بیڑا خود اٹھایا۔ بارہ برس کی عمر میں جب آپ نے مختصرات سے فراغت حاصل کرلی تو آپ کو معقول کے مشہور اُستاد اور مذہبِ امامیہ کے مجتہد مولانا رمضان علی کے حلقۂ درس میں داخل کر دیا گیا پھر مزید تحصیلِ علوم کے لیے ماہرِ معقول و منقول مولانا محمد اشرف بن نعمت اللہ کے پاس لکھنؤ تشریف لے گئے اور تقریباً چار سال تک وہاں اقامت پذیر رہے اسی عرصہ میں حضرت سید صاحبؒ سے ملاقات ہوئی اور پہلی ہی صحبت میں نقدِ دل ہار بیٹھے۔ لکھنؤ سے فراغت کے بعد کچھ مدّت کے لیے اپنے شہر تشریف لے آئے اور جمعہ و جماعت، درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں مصروف ہو گئے لیکن جلد ہی پھر سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اسی عرصہ میں حضرت امام صاحبؒ سے کتبِ حدیث کو پڑھنا شروع کر دیا۔

سادگی : حضرت امام صاحبؒ نے اپنی جماعت میں آپ کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ مگر آپ کو اب اسوۂ حسنہ نبوی سے ایسا ذوق حاصل ہو چکا تھا کہ آپ اپنی جماعت والوں کی آپ خدمت کیا کرتے تھے اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور اپنے سر پہ رکھ کر لایا کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے اور مٹی گارے کا کام خود انجام دیتے چنانچہ اسی زمانہ میں آپ کے والدِ ماجد نے ایک خدمت گار کو جو بچپن میں آپ کی خدمت میں

رہتا تھا، چار سو روپے نقد و ملبوسات بیش بہا دے کر روانہ کیا۔ ملازم نے بریلی پہنچ کر سید صاحب کے قافلہ میں آپ کو دریافت کیا، لوگوں نے بتایا کہ دریا کنارے وہ مٹی کا کام کر رہے ہیں۔ دریا کے کنارے بہت سے لوگ تعمیر مسجد و مکان قافلہ میں مصروف تھے مولانا بھی ایک موٹا سیاہ تہبند باندھے ہوئے گارے میں لتھڑے ہوئے کام میں مشغول تھے۔ آپ کی صورت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ یہ قدیم ملازم وہاں پہنچ کر اور آپ سے ہم کلام ہو کر بھی آپ کو نہ پہچان سکا۔ بلکہ مولانا ولایت علی صاحب کے خود اقرار کرنے کے باوجود اس نے اسے تمسخر پر محمول کیا اور سخت ناراض ہوا آخرش آپ نے فرمایا اچھا پھر جا کر قافلہ میں تلاش کرو۔ جب وہ قافلہ میں واپس آیا تو لوگوں نے اس کو یقین دلایا کہ مولوی ولایت علی عظیم آبادی وہی شخص ہیں جن سے تم دریا کنارے بات کر آئے ہو، تب وہ دوبارہ آپ کے پاس آکر اپنی جسارت پر نادم و پشیمان ہوا اور آپ سے معافی چاہی۔ آپ نے اسے گلے سے لگا لیا اور بہت اخلاق و تواضع سے پیش آئے۔ اس ملازم نے نقد و ملبوسات پیش کر کے ان کے استعمال کی آرزو ظاہر کی اور آپ کی طبیعت دیکھ کر زار زار رونے لگا مگر آپ اسی روز رات آتے ہی نقد و ملبوسات جیسے بندھے ہوئے تھے، سید صاحب کے حضور میں رکھ کر خاموش چلے آئے۔ آخرش ملازم چند روز تک آپ کو اسی حالت میں دیکھ کر آپ سے رخصت ہوا اور واپس آکر آپ کے بزرگوں سے ساری کیفیت بیان کی۔ اس کیفیت کو سن کر آپ کے والد ماجد اپنے فرزند خورد مولوی فرحت حسین کے ہمراہ بریلی پہنچے اور سید صاحب کی صحبت بیش بہا سے فیض یاب ہوتے رہے۔[۱۱]

مختلف واقعات

آپ سید صاحبؒ کے ساتھ ہجرت کر کے بغرض جہاد گئے تھے لیکن سید صاحبؒ نے آپ کو دعوت و تبلیغ کی غرض سے حیدر آباد بھیج دیا۔ حیدر آباد میں آپ کم و بیش چار سال رہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجود مسعود سے اپنے بعض بندوں کو ہدایت فرما دی۔ اسی اثناء میں معرکۂ بالاکوٹ میں حضرت صاحبؒ، حضرت امام صاحبؒ اور بہت سے دیگر رفقاء جام شہادت نوش فرما گئے اور ادھر آپ کے والد ماجد بھی رحلت فرما گئے تو آپ حیدر آباد سے عظیم آباد تشریف لے گئے۔ دو

سال کی اقامت کے بعد حجازِ مقدّس کے سفر پر روانہ ہوکر حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور شیخ عبداللہ سراج مفتی مکّہ سے حدیث کی سند بھی لی پھر یمن، نجد اور حضرموت میں بھی گئے، یمن میں علاّمہ شوکانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث کی سند حاصل کی، شیخ عبداللہ سراج فرمایا کرتے تھے، مولانا نے حدیث کے لفظوں کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے مولانا سے حاصل کی۔ یہ شاید اس لیے کہ حضرت امام صاحبؒ سے تلمذ کے پیشِ نظر آپ میں بہت عمدہ ذوقِ حدیث دانی پیدا ہو چکا تھا۔

جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ نے اپنے برادرِ اصغر مولانا عنایت علیؒ کو خراسان بھیج دیا اور خود کشمیر میں جہاد میں مصروف ہوگئے جہاں آپ کو نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن کشمیر کے حکمران نے انگریزوں سے مداخلت کے لیے اپیل کی؛ چنانچہ انگریز آپ کو پکڑ کر لاہور لے آئے اور انہوں نے آپ کے جہاد پر پابندی عائد کر دی اور آپ کو دو سال کے لیے عظیم آباد میں نظر بند کر دیا؛ چنانچہ عظیم آباد پہنچ کر آپ نے درس و تدریس اور دینی کتب کی نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحبؒ رقم طراز ہیں :-

> "آپ کی اشاعتِ دین کی انتھک کوشش غرب و شرق، شمال و جنوب کل کو محیط تھی مجمع اور میلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بھی بغرضِ تبلیغ و پند پہنچتے اور نور بافوں کو کرگہ میں جاکر اور کسانوں کو ان کے کھیتوں میں جاکر اللہ کی اطاعت و بندگی کی ترغیب دیتے اور ان کی بدزبانیوں اور غصوں کو شربت کی طرح نوش کر جاتے آپ اپنے دورہ و سیر میں قریہ قریہ فروکش ہوتے جاتے اور اللہ کی باتیں پہنچاتے جاتے اس لیے اپنے مخصوص مقامات تک پہنچنے میں مہینوں اور برسوں کی آپ کو دیر لگتی۔ دینیات کی تعلیم کے لیے مکان پر بعد نمازِ ظہر تا نمازِ عصر قرآن و حدیث کا درس دیتے مولوی عبداللہ آپ کے خلفِ اکبر قاری ہوتے۔ دوسرے علماء ایک تفسیر ہاتھ میں لے بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ مریدوں کی بڑی بڑی بھاری صفت

ہوتی۔ "قرآن مجید" اور "بلوغ المرام" کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے تاکہ لوگ اللہ کی مرضی اور غیر مرضی (امر و نہی) سے آگاہ ہو جائیں۔ ان پڑھ بھی نمازوں میں اپنے پڑھنے کی سورتوں اور دعاؤں کے معانی اور مطالب سے خوب آگاہ ہوتے (عام واقفیت کے لیے سوائے ترجمہ کے دوسری سبیل نہیں) جناب نے شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نبیرۂ مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ دہلوی کی خدمت میں ترجمہ قرآن از شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور رسائل مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے ارسال کی درخواست کی اور جناب شاہ صاحبؒ کے ارسال فرمانے پر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کے طبع کرانے کی سعی فرمائی بعد انکار صاحب مطبع آپ نے زمانہ دورہ سیر بنگال کے اس خدمت طبع کو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزمان صاحب بردوانی کے حوالہ فرمایا۔ چنانچہ مولوی صاحبؒ نے ایک ٹائپ پریس قیمتی دس ہزار خرید کر کے بہ کرات مرات تعمیل ارشاد کیا۔ پھر تو دیگر مطابع ہند نے بھی بغرض تحصیل زر و مال کتب دینی کے طبع کی طرف توجہ کی۔ آپ نے جہاں جیسی ضرورت دیکھی یا لوگوں نے مسائل دریافت کیے محض تفہیم کی غرض سے مختصر اور عام فہم رسائل قلمبند فرما کر لوگوں کے حوالہ کیے ایسے رسائل کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی مگر اس وقت صرف چند دستیاب ہو سکے جو مجموعہ رسائل میں شامل ہیں۔ قریہ قریہ جماعت اور امامت اور واعظین بھی مقرر کیے[۶۲]"

قیام وطن کے زمانہ میں بھی آپ کا معمول تھا کہ ہر ہفتہ شب سہ شنبہ کو مغرب کی نماز کے بعد اپنے مکان میں مجلس وعظ منعقد فرماتے جس میں بڑی کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرتے اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیان میں عجیب تاثیر ودیعت فرمائی تھی۔ جب قبر و قیامت کا ذکر فرماتے تو لوگوں کی حالت دگرگوں ہو جاتی۔ دعوت و تبلیغ کے علاوہ پوری سرگرمی سے آپ امور جہاد میں

بھی مصروف رہے۔ درہ دوب وغیرہ کی جنگ آپ کے زمانہ میں ہی لڑی گئی آخر کار آپ نے ۱۲ شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو گھر بار چھوڑا اور ہجرت کرکے سوات تشریف لے گئے مولانا یحییٰ علی بن مولانا الٰہی بخش اور چند دیگر احباب بھی آپ کے ساتھ روانہ ہوئے اور ہجرت کے بعد سے اب تک کے عرصہ میں کوئی خاص کارنامہ سرانجام دینے نہیں پائے تھے کہ ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو بعارضہ خناق راہگرائے ملک بریں ہوئے ستھانہ میں آپ کی قبر ہے۔ وفات پر درج ذیل دو تاریخیں کہی گئیں ؎

ولایت علی العالم المتورع — توفی بالهجرة للدین ناصر
وهذا الذی قد طاب حیاً ومیتاً — فارخ قلبی طاب غاز مهاجر

۱۲ ھ ۶۹

دوسری تاریخ وفات فارسی میں کہی گئی ؎

ولایت علی رہبرِ دینِ حق — بہ ماہِ محرم چو شد زیرِ خاک
بگو از سرِ آہ سالِ وفات — شدہ جا بسیرش بہ فردوس پاک

ازواج واولاد

آپ کی پہلی شادی سید مقصود علی کی دختر نیک اختر امیرن سے ہوئی تھی جب یہ وفات پاگئیں تو آپ نے حیدر آباد کے ایک رئیس مرزا واحد بیگ کی دختر فرخندہ اختر مراد النساء بیگم سے نکاح کیا۔ آپ کے بطنِ اطہر سے پانچ بچے تولد ہوئے اور آپ نے تیسرا نکاح مولانا الٰہی بخش کی بیوہ صاحبزادی جمیلۃ النساء سے کیا، ان کے بطن سے چار بچوں نے جنم لیا، اولاد کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مولانا عبداللہ ۲۔ رحمت اللہ ۳۔ ہدایت اللہ ۴۔ عبدالرحمٰن ۵۔ مولانا عبدالکریم
۶۔ مولانا محمد حسن ذبیح ۷۔ شاکرہ ۸۔ زینب ۹۔ محمد حسین

تصنیفات

آپ کی ساری زندگی دعوت و ارشاد اور امورِ جہاد میں بسر ہوئی ان مصروفیتوں کے پیشِ نظر آپ کو تصنیف کے لیے خاص وقت میسر نہ آسکا تاہم آپ نے بے شمار رسائل مختلف عنوانات پر تصنیف فرمائے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ۱۔ ردِ شرک (فارسی) ۲۔ شجرۂ باثمرہ (اردو) ۳۔ تیسیر الصلوٰۃ (اردو) ۴۔ اربعین فی

المهند بعین (عربی) ۵۔ عمل بالحدیث (فارسی) ۶۔ تبیان الشرک (اردو) ۷۔ دعوت (اردو)

استقامت

حضرت مولانا ولایت علیؒ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو بہار کے روسائے کبار میں شمار ہوتا تھا۔ بنا بریں ناز و نعمت میں پرورش پائی لیکن عشق حق، ولولۂ جہاد اور ترتیب احیائے دین کے پیش نظر سب کچھ تج دیا اور ایسی راہ کا انتخاب کیا جس میں آلام و مصائب کے سوا استقبال کے لیے کچھ نہ تھا اور پھر ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو ارباب دعوت و عزیمت سے ہی مختص ہیں یاد رہے آپ کے برادر اصغر مولانا عنایت علی بھی آپ کے ساتھ برابر کے شریک رہے اور انہوں نے بھی راہ خدا میں استقامت اور عزیمت کی زندہ جاوید مثالیں چھوڑی ہیں" ہائے آں صادقپور بہ کجاست! واہل صادقپور بہ کجا اند! نہ مکاں را تمکنے! و نہ مکین را تمکنے! الٰہی ایں چہ سیت!!

مولانا کرامت علی دہلوی

مولانا کرامت علی بن حیات علی اسرائیلی، شافعی دہلویؒ کبار علماء کرام میں سے تھے آپ کی ولادت و نشأت دہلی میں ہوئی والد ماجد نحو نویس تھے شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا فضل امام بن محمد ارشد خیر آبادیؒ سے علم پڑھا اور سند حدیث شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ سے لی۔ آپ کو حضرت امام صاحبؒ سے تلمذ کی سعادت بھی نصیب ہوئی اور آپ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں تحصیل علم سے فراغت کے بعد مدت دراز تک دہلی میں مسند تدریس پر جلوہ افروز رہے اور پھر حیدر آباد تشریف لے گئے اور ہزار روپیہ مشاہرہ پر منصب عدل و قضا پر بیس سال تک فائز رہے۔ سر سید لکھتے ہیں۔

> فضل و کمال ان کا حد تقریر اور احاطۂ تحریر سے باہر ہے استحضار مسائل اس درجہ کو پہنچا ہے کہ حصول ان کے ذہن میں حکم حضوری کا رکھتا ہے عرصۂ چند سال کا ہوا کہ شہر شاہجہان آباد کو تلاش معاش کی تقریب سے چھوڑا اور حیدر آباد کی طرف راہی ہوئے چونکہ" المسفو وسیلۃ الظفر" حدیث مشہور ہے گردش فلک نے وہاں ان کے موافقت کی اور بالفعل ہزار روپیہ ماہیانہ کے منصب سے

سرفراز ہیں، اس نواح میں معہ قبائل اور عشائر کے بسر کرتے ہیں
نظم ونثر ان کا کچھ راقم کو بہم نہیں پہنچا[65]۔

"سیرتِ احمدیہ" بزبانِ عربی ایک ضخیم جلد میں آپ کی تصنیف ہے معلوم نہیں سرسید کو اس کا علم نہیں ہوسکا یا مولانا کرامت علیؒ نے ہی اسے سرسید کے "آثار الصنادید" لکھنے کے بعد تصنیف فرمایا۔ ۱۲۷۷ھ میں حیدر آباد میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں[66]۔

مولانا جعفر علی بستویؒ

مولانا جعفر علی بستوی بن قطب علی حسینی نقوی بستویؒ مبھا امیر ضلع بستی (یو۔پی) میں ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور تکمیل کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے آپ کو حضرت امام صاحبؒ سے بھی تلمذ کی سعادت نصیب ہوئی نیز حضرت سید صاحبؒ سے بیعت بھی تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید حسن علی اور والد صاحب تو تکیہ شریفہ جاکر بیعت کر چکے تھے مگر آپ علالتِ طبع کے باعث نہ جا سکے۔ ان کی طبیعت پر سید صاحبؒ کا رنگ دیکھ کر آپ بھی بہت بے قرار تھے۔ ان دِنوں گورکھ پور میں مقدمے کی پیروی کے لیے اکثر جایا کرتے تھے اس لیے فیصلہ کر لیا کہ وہیں سے حضرت سید صاحبؒ کی طرف چلے جائیں گے رخصت کے وقت والد صاحب سے دُعا کے لیے کہا انہوں نے سمجھا شاید مقدمہ میں کامیابی کے لیے دُعا کے خواستگار ہیں چنانچہ انہوں نے دُعا کی۔ چھوٹا بھائی چھ میل تک ساتھ گیا اس کے پاس بندوق تھی اس نے پیش کش کی مگر انہوں نے فرمایا کہ اسے اپنے پاس رکھو مجھے اللہ تعالیٰ اور دے گا۔ بھائی نے گلوگیر لہجہ میں کہا جب آپ راہِ خدا میں جا رہے ہیں تو دنیا کی دولت میرے لیے کیا حقیقت رکھتی ہے سید جعفر صاحب نے اسے تسلی دی اور ساتھ ہی والدین کی خدمت کی از حد تاکید کی۔

سید صاحبؒ جب گھر سے نکلے تو موسمِ برسات شروع ہو چکا تھا ندی نالے اور دریا ٹھاٹھیں مار رہے تھے اور انہیں عبور کرنا بہت دشوار تھا اور پھر لطف یہ کہ پہلی رات ہی آشوبِ چشم میں مبتلا ہوگئے اور درد کی شدت کے پیشِ نظر ذرا بھر نہ سو سکے اور اس میں کوئی اچنبھا کی بات نہیں عشاق کو ان کٹھن منزلوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے اور یہ بھی ان سے ہی پوچھئے کہ ان سنگلاخ گھاٹیوں اور خار زار وادیوں کو طے کرتے وقت انہیں کس قدر فرحت اور مسرت حاصل ہوتی ہے وہ اشخاص

جنہیں عشق و سرمستی کی راہوں سے گزرنا کبھی نصیب نہ ہوا ہو وہ تڑپ اور اضطراب کی لذت کیا جانیں یہ حقیقت ہے کہ مشکل منزلیں انہی کی راہ میں آتی ہیں جن میں اضطراب ہو، تڑپ ہو، کشش ہو، حوصلہ ہو اور راہِ خُدا میں سر کٹا دینے کا عزم ہو۔ اب راہِ حق کے اس مسافر کی کیفیت مُلاحظہ فرمایئے کہ منزل نہایت دشوار راستہ ناہموار کہیں صحرا اور کہیں دریا۔ کھانے پینے کی کوئی چیز ساتھ نہیں اور پھر راستہ میں ہر مقام پر سکھوں کی طرف سے حملہ کا شدید خطرہ لیکن یہ غازی راہِ خُدا نہ صرف خود رواں دواں ہے بلکہ قدم قدم پر ہمراہیوں کو ولولۂ تازہ دیئے جا رہا ہے۔ ساتھیو! ہمّت کرو آگے بڑھو ہم اُنتیس ہیں اور اسلحہ ہمارے پاس موجود۔ اگر سکھوں سے مقابلہ ہو گیا تو انہیں مار کر اونٹ اور گھوڑے لے لیں گے اور پھر بہت جلد حضرت سیّد صاحبؒ اور اپنے مجاہدین بھائیوں سے جا ملیں گے۔

دس آدمی راستہ میں اور آملے تھے اب اہلِ حق کا یہ قافلہ اُنتیس (۲۹) افراد پر مشتمل تھا جو کہ ۹ رمضان المبارک ۱۲۴۵ھ (۴ مارچ ۱۸۳۰ء) کو پنجتار پہنچ گیا۔ سیّد صاحبؒ ان دنوں امب تشریف فرما تھے لہٰذا یہ حضرات سیدھے امب پہنچے۔ مولانا جعفر علی صاحبؒ تقریباً ایک سال تک جہاد میں مصروف رہے حتیٰ کہ سانحۂ بالاکوٹ پیش آگیا اور انہوں نے وطن مراجعت کا ارادہ کر لیا۔

بالاکوٹ سے واپسی پر آپ نے دو اہم خدمتیں انجام دیں اوّل یہ کہ آپ نے اپنی بستی سے چھ میل کے فاصلے پر کرھی میں "ہدایت المسلمین" کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی دوسری یہ کہ نواب وزیر الدولہ والئی ٹونک اور آپ کے صاحبزادے نواب محمد علی خاں کی فرمائش پر حضرت سیّد صاحب اور دیگر حضراتِ مجاہدین کے حالات پر مشتمل "منظورۃ السعداُ فی احوال الغزاۃ والشُہداء" نامی بزبانِ فارسی ایک مفصّل کتاب تصنیف فرمائی جس کا دوسرا نام "تاریخِ احمدی" ہے مگر افسوس کہ یہ نہایت قیمتی معلومات سے لبریز اور ایک اہم دستاویز آج تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجُود ہے۔

آخر کار عمر شریف کی ستر بہاریں دیکھنے کے بعد یہ غازیٔ اسلام رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (نومبر ۱۸۷۱ء) میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وفات سے قبل آپ نے یہ خواب دیکھا کہ ایک انتہائی آراستہ و پیراستہ مقام میں شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت سیّد احمد اور حضرت امام محمد اسمٰعیلؒ اور کچھ دیگر حضرات کرسیوں پر جلوہ افروز ہیں اور ایک کرسی خالی پڑی ہے کسی نے دریافت

کیا۔ یہ کس کے لیے ہے ؟

جواب ملا جعفر علی کے لیے۔

اولاد میں زینب نامی صرف ایک دختر فرخندہ اختر چھوڑی جن کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی برادرِ اصغر سید حسن علی کے صاحبزادے محمد ذکریا کی اولاد میں سے سید محمد مصطفیٰ، سید محمد احمد، اور سید محمد صالح ۱۹۴۱ء تک بقیدِ حیات رہے۔ یاد رہے مولانا جعفر علی صاحب حضرت امام صاحب کے تلمیذِ رشید ہونے کے علاوہ آپ کے کاتبِ خاص بھی تھے[۶۷]

مولانا جلال الدین بنارسی رح

مولانا جلال الدین بن عبد الاعلیٰ بن کریم اللہ بن ظہور محمد ہاشمی جعفری بنارسی ۱۲۱۹ھ یا ۱۲۲۱ھ میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ شاہ محمد غوث صاحب گوالیاری کے واسطے سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے آپ نے تعلیم اپنے والد صاحب مولانا احمد اللہ نامی رح اور حضرت امام صاحب رح سے حاصل کی اور سندِ حدیث مولانا عبد الحق بن فضل اللہ نیوتنی سے حاصل کیں اور انہیں بزرگوں کی صحبت کے پیشِ نظر ترکِ تقلید اور عمل بالحدیث کا رنگ آپ پر غالب تھا۔ چنانچہ مولوی خرم علی صاحب[۶۸] سے مسئلہ فاتحہ خلف امام میں آپ کا مناظرہ مشہور ہے اسی مبحث میں آپ نے بزبانِ فارسی رسالہ "فاتحۃ الصواب فی قرأۃ فاتحۃ الکتاب" محرم ۱۲۵۶ھ میں تصنیف فرمایا پھر اس کا خلاصہ بزبانِ اُردو بنام "زبدۃ الالباب" فرمایا جو مطبع سعید میں طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ آپ بے حد ذہین تھے حفظِ قرآن کا شوق ہوا تو رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو التزام کیا دن میں ایک پارہ حفظ کر لیتے اور شب کو تراویح میں سنا دیتے۔ خاندان میں مہر فاطمی کا رواج آپ ہی کی سعی سے ہُوا۔

ایک مدت تک بنارس کالج میں مدرس رہے بڑے بڑے انگریز حکام نے آپ کی شاگردی کی ہے آپ کو وائسرائے کے دربار میں خاص کرسی ملتی تھی باوجود ایسے اعزاز کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ اپنے لیے عہدہ کی ترقی ناپسند فرمائی اور دینیات کی طرف آپ کی توجہ بہت زیادہ رہی۔ صاحبِ کرامات بھی تھے۔

"فاتحۃ الصواب" اور "زبدۃ الالباب" کے علاوہ آپ کی دوسری تصانیف یہ ہیں "زبدۃ القوانین"

"انبساط عبارۃ الکافیۃ بالبیان الشافیۃ" "فرہنگ اخوان الصفا" اور قواعدِ اُردو۔

جمادی الاُولیٰ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۳ء) میں اٹھاون برس کی عمر میں وفات پائی اور سعید الدین احمد، مجید الدین احمد، حمید الدین احمد اور شہید الدین احمد چار صاحبزادگانِ عالی مرتبت یادگار چھوڑے[69]

مولانا محمد حسن صاحبؒ

مولانا محمد حسن صاحبؒ رامپور مہاراں سے تعلق رکھتے تھے امیر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حکیم ضیاء الدین رامپوری کے چچا مولوی محمد حسن صاحب کو میں بچپن سے جانتا ہوں کیونکہ میں نے اپنے استاد میاں جی محمدی صاحبؒ سے ان کے بہت سے حالات سُنے ہیں مولوی صاحبؒ موصوف مولوی اسمٰعیل صاحبؒ اور مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلویؒ کے شاگرد تھے[71]۔

روایت ہے کہ آپ ابتداء میں نہایت نفاست پسند اور نازک مزاج تھے لیکن آپ کی نازک مزاجی (جس کا حضرت امام صاحبؒ نے علاج کیا) کا جو قصہ "حکایاتِ اولیاء" میں مولانا گنگوہی سے منقول ہے بقول مولانا غلام رسول مہر مرحوم "وہ کسی لحاظ سے بھی قابلِ قبول نہیں ہم اتنا جانتے ہیں کہ دورانِ جہاد میں انتہائی سادگی سے زندگی گزاری، یہاں تک کہ اپنے لیئے سونے کی بھی کوئی جگہ مقرر نہ کی۔ سید صاحبؒ کی باتیں سننے کے شوق میں پاس بیٹھے رہتے، نیند آتی تو وہیں پر سو جاتے"[72]

مولانا مہر صاحب آپ کے حالات میں مزید رقم طراز ہیں:۔

> مولوی محبوب علی دہلویؒ[73] قافلہ لے کر سرحد پہنچے تو راستے کی تکلیفوں سے اس قدر پریشان ہوئے کہ واپسی کا قصد کر لیا اور مجاہدین سے بھی کہنا شروع کر دیا کہ گھر واپس چلو اور اقربا کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں، انہیں ادا کرو۔ دوسرے مجاہدین کے علاوہ مولوی محمد حسن نے بھی اس موقع پر مولوی محبوب علی سے گفتگو کی تھی۔
>
> محمد حسن: حضرت! آپ کس دلیل سے مجاہدین کے قیام کو لغو ٹھہراتے ہیں؟
>
> محبوب علی: آخر یہاں کس کافر سے جنگ درپیش ہے؟
>
> محمد حسن: جنگ کو قتال کہتے ہیں اور اس کا موقع گاہے گاہے آتا ہے۔ جہاد یہ ہے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے سعی کی جائے۔ یہاں سب لوگ اس کام میں مصروف ہیں۔ آپ ان کے فعل

کو عبث قرار دیتے ہیں اگر کسی روز کافروں سے مقابلہ پیش آجائے اور آپ دہلی میں ہوں تو کون سی کرامت سے دُور دراز کا راستہ طے کرتے ہوئے اس میں شریک ہو سکیں گے ؟

مولوی محبوب علی یہ دلیل سن کر لاجواب ہو گئے۔

فتح امب کے بعد پائندہ خاں تنولی سے مصالحت کی گفتگو شروع ہو گئی تو ایک مرتبہ شیخ ولی محمد پھلتی[۷۴] اور مولوی خیرالدین شیرکوٹی[۷۵] کے علاوہ مولوی محمد حسن کو بھی سید صاحب نے پائندہ خاں[۷۶] کے پاس بھیجا تھا اور وہ سید صاحب کی مجلسِ شوریٰ کے بھی مستقل رکن تھے یعنی تمام اہم مشوروں میں شریک ہوتے تھے۔

سید احمد علی رائے بریلوی[۷۷] کو سالارِ اعلیٰ بنا کر پھولڑہ بھیجا تو مولوی محمد حسن کو ان کا خاص مشیر مقرر کر دیا گیا۔ یہ اور رحیم بخش جراح جنگ کے وقت پاس پاس کھڑے تھے۔ جب سید احمد علی کی شہادت کا علم ہوا تو ایک دم گھمسان کے رن میں گھس گئے اور مردانگی سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ پھولڑہ ہی کے گنج شہیداں میں سید احمد علی اور دوسرے رفقاء کے ساتھ دفن ہوئے۔ "منظورہ کا بیان ہے شاہ اسمٰعیل کے بعد لشکر اسلام میں عجز، علم، خاکساری اور قابلیت کے لحاظ سے مولوی محمد حسن جیسا کوئی نہ تھا۔"[۷۸]

آپ کے ہزاروں تلامذہ میں سے مشتے نمونہ از خروارے "چند ایک کے مختصر حالات ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے تو کئی دفاتر درکار ہیں آپ کے لیے یہ فخر ہی کیا کم ہے کہ جہاں حضرت سید احمد شہیدؒ آپ کے سلسلۂ تلمذ میں شامل ہیں وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب آپ حج کے لیے تشریف لے گئے تو مکہ کے نامور مفتی شیخ عبداللہ سراج بھی آپ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتے اور اپنے شبہات علمی کو پوچھتے ہیں اور خاص طور پر علم مناظرہ کی تحصیل تو انہوں نے آپ ہی سے کی۔

الغرض بقول غالب ؎

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

آپ جہاں تہاں بھی تشریف لے گئے دبستانِ علم وفضل کھلتے گئے۔

باب سوم

دعوت و تبلیغ

مدرسہ رحیمیہ سے سندِ فراغت کی تحصیل کے بعد آپ نے جب گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی اور ماحول کا جائزہ لیا تو ہر طرف شرک و بدعت کی ظلمتوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے انسان نظر آئے آپ نے ان کی حالتِ زار کا مشاہدہ فرمانے کے بعد عزمِ صمیم کر لیا کہ گم گشتگانِ راہ بھائیوں کو شیطانی پگڈنڈیوں پر چلنے سے منع کریں گے۔ اور کوشش کریں گے کہ وہ پھر سے صراطِ مستقیم پر چلنے لگیں چنانچہ اس عزم کی تکمیل کے لیے آپ نے وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ لیکن حضرت سیّد صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد تو آپ نے اپنی حیاتِ طیبہ کو دعوت و ارشاد، اصلاح و تبلیغ احیائے دین اور ردِ شرک و بدعات کے لیے وقف کر دیا اور اس مشن کا باقاعدہ آغاز رمضان المبارک سنہ ۱۲۲۱ھ کے پہلے جمعۃ المبارک سے کیا۔ اس سے قبل حالت یہ تھی کہ خطباً حضرات عربی کے خطبات ہی پڑھا کرتے تھے جس سے عربی سے ناواقف عوام کو قطعاً کوئی فائدہ نہ ہوتا اس لیے حضرت امام صاحب نے افادۂ عوام کی خاطر عربی کی بجائے اُردو میں خطبہ ارشاد فرمایا اور شاید برِ صغیر پاک و ہند میں یہ پہلا خطبہ تھا جو اُردو میں دیا گیا۔ امید ہے کہ قیامت تک آپ کو

اپنے اس "صدقہ جاریہ" کا ثواب ملتا رہے گا۔ آپ نے اپنے اس ابتدائی خطاب میں دہلی کی جامع مسجد میں "مسئلہ توحید اور ردِ شرک و بدعت" کو اس قدر جرأت اور حق گوئی و بے باکی سے بیان فرمایا کہ جہاں دلائل و براہین کی فراوانی پہ لوگ عش عش کر رہے تھے وہاں تاثیر کا بھی یہ عالم تھا کہ سامعین پر ایک سناٹا طاری تھا اور ان کے دل خشیت الٰہی سے لرز لرز اٹھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب رواں دواں ہو گئے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جنگل کی آگ کی طرح اس ابتدائی خطاب کا عوام و خواص میں چرچا ہو گیا اس کے بعد آپ نے باقاعدہ ہر جمعۃ المبارک کے دن جامع مسجد دہلی میں خطاب فرمانا شروع کر دیا اور علماء بدعت کی طرف سے مخالفت کے طوفانِ بدتمیزی کے برپا کر دیئے جانے کے باوصف لوگ تھے کہ کشاں کشاں پہنچتے اور کھینچے کھینچے چلے آتے اور خطاب کے اختتام تک قوتِ تاثیر کے پیشِ نظر محویت اور استغراق کا یہ عالم ہوتا گویا کسی ماہر اور مشاق جادوگر نے اپنی کرشمہ سازیوں اور سحر آفرینیوں سے ساکت و جامد بنا دیا ہے۔ کیوں نہ ہو جب کہ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

سرسید آپ کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"وعظ و نصائح سے اہلِ غفلت کے کان کھول دیئے جو جو مسائل کہ ان پر مواظبت کرنی ضروریاتِ دین سے تھی اور بسبب سستی اور کاہلی کوئی علمائے وقت کے عوام روزگار کیا بلکہ خواص کے گوشِ وہم تک بھی نہ پہنچے تھے آپ کی سعی و جہد سے سب پر کھل گئے اور آوازہ اعلامِ سنت اور ہدمِ بنیانِ شرک و بدعت کا وضیع و شریف کے کان تک پہنچ گیا باوجودیکہ اربابِ مشیخت اور صاحبانِ تشخیص کہ سلسلہ اعتقاد و سررشتہ ارادت خاص و عام کا ان کے ساتھ مستحکم تھا اور

کسی کو مداہنت کا گمان نہ ہوتا تھا۔ اور اس گمان سے کہ اگر مسائل حقہ گوشِ مردمِ روزگار تک پہنچا تو ہمارے حق میں موجب ضعفِ اعتقاد کا ہو جائے گا علم منازعت اور لوائے مخالفت بلند کر کے درپئے اذیت و اہانت ہوئے لیکن چونکہ مؤید بتائید اللہ تھے اس ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے اور خلق کو یہاں تک توفیق اتباعِ سنتِ نبوی اور ترکِ بدعات و احداث کی ہوئی کہ ایک اور ہی طرح کا نورِ پیشانی احوال سے چمکنے لگا اور ان مفسدانِ مضل کا بازار کاسد ہو گیا اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ لوگ بطمع اخذ و بجز کے امور حق کو آج تک چھپاتے رہے اور بچشم خود دیکھا گیا کہ وضیع و شریف کو توفیق نماز کی ایسی ہوئی کہ مسجد جامع میں نمازِ جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی جیسے عیدگاہ میں نمازِ عیدین کے واسطے ہوا کرتی ہے اور تائیدِ الٰہی اور ان کی صدقِ نیت اور خلوصِ طویت کی برکت سے الی الآن وہی حال چلا آتا ہے اور یہ ثواب انہیں حضرت کے جریدۂ اعمال میں لکھا گیا اور آج تک اس کا اجر ان کی روحِ پُر فتوح پر پہنچا جاتا ہے۔ الحمد للہ علی ذلک فالحمد للہ علی ذلک۔ آپ کی عادت یوں تھی کہ روزِ جمعہ اور روزِ سہ شنبہ کو مسجد جامع میں مجلس وعظ کو مرتب فرماتے تھے طرفہ تو یہ ہے کہ سامعین کو کہ ہزارہا سے متجاوز ہوتے تھے اس چار روز کے عرصہ میں بسبب اغوائے مغویانِ ضلالت نہاد کے یا بسببِ انحرافِ نفسِ امارہ کے اگر شبہ پیدا ہوتے اور ارادہ کرتے کہ اپنے وعظ میں آپ کی حسنِ تقریر سے اس کو دفع کریں گے۔ جب درس کی مجلس میں آن کر حاضر ہوتے تو حضرت ابتداء وعظ میں کلمات چند بطریق تمہید کے ارشاد کرتے اور ان کی تقریر کی جامعیت سے وہ چیزیں مذکور ہوتیں کہ ہر شخص اپنے شبہ کا جواب پاتا اور کچھ خدشہ باقی نہ رہتا یہاں

تک کہ بعد اختتام درس کے کسی کو یہ خلجان نہ رہتا کہ ان شبہات کو پھر اپنی زبان سے بیان کر کے دلیل طلب کرے اور عمدہ مقاصد تردید شرک و بدعت اور احیائے سنّت تھا۔ آپ کی حُسنِ تقریر سے وہ مسائل غامضہ کہ طالب علم کو بعد ردّ و قدح کے ذہن نشین ہوں۔ جُہلائے عامی کو بمجرد استماع کے سمجھ میں آجاتے تھے اور اس طرح منقوشِ خاطر ہوتے تھے کہ مخالفین سے بعض اہل علم چاہتے تھے کچھ دلائل علمی سے اس کو رد کر کے اس کے ذہن سے نکالیں ممکن نہ ہوتا جب یہ مطالب خوب جم گئے بموجب ارشاد سیّد اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ کے اس طرح سے تقریر و وعظ کی بنیاد ڈالی کہ مسائلِ جہاد فی سبیل اللہ بشیتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کے صیقلِ تقریر سے مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور مجلا ہو گیا اور اس طرح سے راہ حق میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار چاہنے لگے کہ سر ان کا راہِ حق میں فدا ہو اور جان ان کی لوائے دین محمدی میں صرف ہو۔"

آپ انتہائی سادگی اور بے تکلفی سے وعظ ارشاد فرمایا کرتے تھے جُبّہ و دستار کہ بقولِ شخصے ریا کار کے ہتھیار ہیں، کا بالکل اہتمام نہ کرتے تھے، خطبۂ مسنونہ کے بعد دل سوزی کے ساتھ قرآنِ حکیم کی آیات تلاوت فرماتے اور پھر کتاب و سنّت کی روشنی میں ہی ان کی تفسیر شروع فرما دیتے جیسا کہ ابھی ابھی ذکر کیا جا چکا اس سادہ سے پیرایۂ بیان میں ہی قدرت نے وہ تاثیر ودلیعت فرما دی تھی کہ سامعین کے دِل خوفِ خدا سے کانپ اٹھتے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اسی لیۓ بعض ثقات نے لکھا ہے کہ حضرت کے ایک ایک وعظ سے وہ نسبتیں پیدا ہو جاتی تھیں جو دس بارہ سال کے اشتغال و مراقبہ سے پیدا ہوتی ہیں" مشتے نمونہ از خروارے " آپ کے بیان کی تاثیر کی چند ایک مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

طوائف کو وعظ

ایک دفعہ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحؒ کے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ بہت سی حسین وجمیل دوشیزگان بلا پردہ مختلف سواریوں پر سوار کہیں جا رہی ہیں آپ نے کسی سے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں، کہاں جا رہی ہیں اور پردہ کے بغیر کیوں ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ سب طوائفیں ہیں اور فلاں بڑی طائفہ کے مکان پر ایک تقریب میں شرکت کے لیے جا رہی ہیں آپ نے ازراہِ تعجّب استفسار کیا یہ سب مسلمان ہیں؟ اس نے جواب دیا جی ہاں یہ سب مسلمان ہیں۔ سُن کر آپ کو شدید صدمہ ہوا فرمانے لگے یہ تو ہماری مسلمان بہنیں ہیں اگر روزِ حشر خدا تعالیٰ نے ہم سے پوچھ لیا کہ انہیں کیوں نہ سمجھایا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اس لیے میں تو ان کے مکان پر پہنچ کر انہیں ضرور نصیحت کروں گا۔

احباب و رفقاء نے کہا کہ آپ کا وہاں تشریف لے جانا قرینِ مصلحت نہیں۔ دشمن ہوائی اڑائیں گے کہ آپ قحبہ خانوں میں بھی جانے لگے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے ان طعنوں اور ملامتوں کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں۔ میں بلا خوف لومۃ لائم پیغامِ الٰہی ہر کس و ناکس اور ادنیٰ و اعلیٰ کے گوش گزار کر کے رہوں گا۔

اس کے بعد اپنے دل کو سمجھانے لگے اے دل! اگر تیرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوّوں اور چیلوں کو کھلا دیئے جائیں اور اس جسم کو جس میں تیرا مسکن ہے ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر کھینچوا دیا جائے اور خواہ تجھے کیسے ہی آلام و مصائب کا تختۂ مشق بننا پڑے تو نے بہر آئینہ اللہ ہی کی بات کہنا ہے اور اس کے پیغام کو پہنچانے سے قطعاً نہیں رکنا۔ دل نے کہا جب تک میرے اندر جان ہے راہِ خدا میں بڑے سے بڑے آلام و مصائب کو برداشت کروں گا۔

اس جذبۂ صادقہ اور عزمِ صمیم کے ساتھ آپ درویشوں سا لباس زیبِ تن فرمائے ہوئے اس مکان پر پہنچ گئے جہاں تقریب کا انتظام تھا اور صدا کرنے لگے اے اللہ والیو/ اے اللہ والیو/ چند لڑکیوں نے دروازے پر آکر پوچھا کون ہو؟ فرمایا۔ فقیر ہوں کچھ صدا سنا ڈل

گا۔ انہوں نے سمجھا شاید کوئی تماشہ گیر فقیر ہے دروازہ کھول دیا اور اندر بلا لیا تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ مالکۂ مکان بالا خانے پر اپنے مہمانوں کے ساتھ جشن میں مصروف ہے آپ بھی اُوپر تشریف لے گئے اور دیکھا کہ بڑی بی بڑی شان و شوکت کے ساتھ مہمانوں کے ہجوم میں کرسی پر بیٹھی ہے اور ہر طرف شمعیں اور قندیلیں روشن ہیں۔

آپ چونکہ مشہور و معروف خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ تھے اور عظیم المرتبت عالم تھے اس لیے لباس کی خستگی کے باوجود وہ آپ کو پہچان گئی اور ادب سے کھڑی ہو کر کہنے لگی حضرت آپ نے یہاں تشریف لانے کی زحمت کیوں گوارا کی؟ آپ نے فرمایا گھبراؤ نہیں کچھ صدا سنانے آیا ہوں تم سب اطمینان و سکون سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھی رہو۔ ان کے مقدر کا ستارہ چونکہ چمک اٹھا تھا اس لیے سب ہمہ تن آپ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

آپ نے قرآن مجید کھول کر بڑے خشوع و خضوع اور دلسوزی کے ساتھ کچھ آیات تلاوت فرمائیں جسے سب نے ہمہ تن توجہ کے ساتھ سنا۔ پھر آپ نے ان کا ترجمہ کرنے کے بعد فرمایا یہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے۔ مال و دولت کو دوام ہے اور نہ حسن و شباب کو قیام اس مفہوم کا یہ بیان اس قدر پر تاثیر اور پُر درد تھا کہ سب پر گریہ کا عالم طاری ہو گیا۔

اس کے بعد آپ نے موت و حیات کی کشمکش میں ابتلاء کے وقت کی شدت و تلخی اور انسان کی بے چارگی و بے بسی کی اس طرح تصویر کھینچی کہ تمام کا روتے روتے برا حال ہو گیا۔

پھر آپ نے قبر کی تاریکیوں اور تنہائیوں اور وہاں کی آفتوں اور مصیبتوں اور منکر و نکیر کے سوالوں کا ذکر شروع فرمایا۔ بس پھر کیا تھا کہ سب پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ نالہ و بکا اور آہ و زاری کی وجہ سے کہرام مچ گیا۔

پھر آپ نے میدان حشر اور روز قیامت کی سختیوں اور عقوبتوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں دوسرے مجرموں کی طرح بدکردار لوگوں کو بھی گرفتار کر کے فرشتے عدالت الٰہی میں حاضر کریں گے ایک بدکردار عورت کے ساتھ سینکڑوں زانی و بدکردار آدمی لائے جائیں گے جو اس کی وجہ سے اس بدعادت کا شکار ہوئے تو بتاؤ اس وقت خدا تعالیٰ کے

پاس تمہارا کیا جواب ہوگا؟ یہ بیان بھی اس قدر پُر درد اور پُر سوز تھا جس کی وجہ سے روتے روتے ان کا بُرا حال ہوگیا اور ہچکیاں بندھ گئیں۔

اس کے بعد آپ نے توبہ کی فضیلت بیان فرمائی اور فرمایا کہ توبہ سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں سرورِ دنیا و دیں رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ

"یعنی گناہ سے توبہ کرنے والے نے گویا کوئی گناہ کیا ہی نہیں"۔

اور ساتھ ہی آپ نے نکاح کی فضیلت بیان فرمائی اور فرمایا کہ جس کا دِل چاہے وہ نکاح کرے۔

جب آپ یہ وعظ ارشاد فرما رہے تھے۔ آناً فاناً سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی اور لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ دیوانہ وار لپکتے ہوئے وہاں آپہنچے گرد و پیش کے تمام مکانوں کی چھتوں پر انسانوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے اور تمام لوگ ہمہ تن گوش بر آواز تھے۔ آپ کے اس بیان کا یہ اثر ہوا کہ تمام عورتوں نے اسی مجلس میں صدقِ دل سے توبہ کر لی، جوان عورتوں نے بعد میں نکاح کر لیے اور عُمر رسیدہ نے محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔

ایک مُخنّث کی توبہ

ایک دفعہ آپ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے پاس خطاب فرما رہے تھے کہ ایک مُخنّث کی قسمت کا ستارا چمکا وہ مہندی لگائے ہاتھوں میں چوڑیاں پاؤں میں کڑے اور سُرخ جوڑا پہنے ازراہِ تفنّن آپ کے پاس آکھڑا ہوا اور وعظ سننے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ آپ کے ملفوظات اثر دکھانے لگے اور اس کی طبیعت پر خوشگوار اثر پڑنے لگا کچھ دیر اور گزری تو اس پر محویت کا عالم طاری ہوگیا اور آپ کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ آپ نے بھی اس کی طرف توجّہ مبذول فرمائی اور اس کی نسوانی ہیئت کی مذمّت کی، خدا تعالیٰ کی گرفت اور عذابِ آخرت کی شِدّت اس قدر سوز و گداز سے بیان فرمائی کہ تیر نشانہ مراد پر لگا اور وہ اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً توبہ کر لی، چوڑیاں توڑ ڈالیں، زیورات اُتار

پھینکے اور مہندی کا رنگ دُور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں کو سیڑھیوں کے پتھروں پر اس قدر زور زور سے رگڑا کہ خون جاری ہو گیا اس کے بعد وہ ہمیشہ آپ کے حلقۂ خدام میں شامل رہا اور آپ کی معیت میں ہی خراسان گیا اور وہاں کا یہ سعادت مند مخنث سکھوں کے مقابلہ میں شجاعت کے جوہر دکھاتا ہوا جامِ شہادت نوش کر گیا۔

دربارِ اکبر میں وعظ

ایک مرتبہ آپ نے ایامِ محرم میں قلعہ کے اندر بھی ایک تاریخی خطاب فرمایا جس میں بادشاہ اکبر ثانی بھی شریکِ مجلس تھا اس خطاب کا پسِ منظر یہ تھا کہ ایک دن آپ چند معتقدوں کی معیت میں جامع مسجد کے حوض کے پاس تشریف فرما تھے کہ خدام تبرکات لے کر اکبر کو زیارت کرانے کے لیے سُوئے قلعہ جا رہے تھے۔ لوگوں نے جب ان کو دیکھا تو فوراً تعظیماً کھڑے ہو گئے اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگے مگر آپ اور آپ کے معتقدین بدستور بیٹھے رہے اور اس کی طرف قطعاً توجہ مبذول نہ فرمائی۔ تبرکات سے اعتقاد رکھنے والے یہ دیکھ کر بہت نالاں ہوئے اور انہوں نے دربارِ اکبر میں شکایت کی کہ شاہ عبدالعزیزؒ کا بھتیجا اسمٰعیل دینِ اسلام کی توہین کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مُطلقاً ادب نہیں کرتا ابھی ابھی جب ہم تبرکات لے کر حاضرِ خدمت ہو رہے تھے تو تمام مسلمان تعظیماً کھڑے ہو گئے مگر انہوں نے تعظیم نہیں کی بلکہ ہمیں اور تبرکات کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا۔

اکبر نے سُن کر آپ کی طرف قلعہ میں آنے کے لیے پیغام بھیجا۔ آپ تمام معاملہ سمجھ گئے۔ معتقدوں اور چند افرادِ خاندان نے مشورہ دیا کہ آپ پہلے ریذیڈنٹ سے مل کر اپنی مخالفت کی وجُوہ بیان فرما دیں مبادا کہ اکبر آپ کو کچھ نقصان پہنچائے۔ جواب میں آپ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرما دی۔

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ○

فرما دیجئے "ہمیں ہرگز کوئی بُرائی یا بھلائی نہیں پہنچتی مگر وہ اللہ نے جو ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہلِ ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اور فرمایا کہ میں نے دینی و دنیاوی کسی قسم کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تو کسی طرح کا خوف دامن گیر کیوں ہو لہٰذا میں بلا جھجک اس کے پاس جاتا ہوں ۔ جو دریافت کرے گا اس کا برملا جواب دوں گا ۔

آپ دربار میں تشریف لے گئے ، اکبر نے حوض کے واقعہ کی تفصیل دریافت کی آپ نے فرمایا یہ تبرکات مصنوعی ہیں ان کی تعظیم کے ہم مکلّف نہیں ۔ آپ نے سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے نہایت نرم لہجہ میں فرمایا جب کہ تبسّم بھی آپ کے رُخِ انور پر رقصاں تھا کہ میں تو صرف کہتا ہی ہوں اور آپ ان کو مصنوعی سمجھتے بھی ہیں ۔ اکبر نے تعجب سے پُوچھا کہ یہ کیسے ؟ آپ نے فرمایا سال بھر میں دو دفعہ تبرکات آپ کی زیارت کے لئے لائے جاتے ہیں آپ ایک دفعہ بھی ان کی زیارت کے لیے تشریف نہیں لے جاتے ۔ سُن کر اکبر چُپ ہو گیا اس کے بعد آپ نے کسی سے فرمایا کہ قرآن مجید اور بخاری شریف لاؤ وہ لائے گئے تو آپ نے انہیں واپس کر دیا اور پھر یہ تقریر فرمائی ۔

ان تبرکات کے متعلّق اولاً تو کلام ہے کہ یہ مصنوعی ہیں یا حقیقی ۔ اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ حقیقی ہیں تو پھر بھی اکثر تبرکات مثلاً چادر وغیرہ ایسے ہیں جن کا کوئی ذاتی شرف نہیں ان میں شرف محض تلبس کی وجہ سے ہے لیکن قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں اسی طرح بخاری شریف بالاتفاق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے اور اس کا کلامِ رسول ہونا بھی ناقابلِ انکار ہے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زیب تن فرمائی ہوئی چادر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول کے کلام کے اشرف ہونے میں کوئی شک نہیں مگر ان تمام باتوں کے باوصف کلامِ خدا و کلامِ رسُول تمہارے سامنے آیا مگر تم لوگوں نے ان کی کوئی تعظیم نہیں کی بلکہ بدستور بیٹھے رہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ حضرات تبرکات کی تعظیم ان کے شرف کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ محض ایک رسم کے پیشِ نظر کرتے ہیں ۔

اس مضمون کو جب آپ نہایت شرح و بسط سے بیان فرما رہے تھے تو اکبر گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے ۔ دورانِ خطاب آپ نے دیکھا کہ اکبر کے ہاتھ اور پاؤں میں سونے کے کڑے ہیں اور پاس بیٹھے ہوئے

شہزادہ کی داڑھی صاف ہے تو فرمایا کہ مردوں کو سونا پہننا حرام ہے اور شہزادہ تو چکنا گھڑا ہے کہ پچاس برس حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا وعظ سنا مگر اب تک داڑھی نہیں رکھی۔ اس وعظ کا اثر یہ ہوا کہ شہزادہ نے داڑھی رکھ لی اور بادشاہ نے فوراً سونے کے کپڑے اتار پھینکے۔[1]

اللہ اللہ حضرت کے خلوص و للہیت کا کیا عالم تھا کہ زبان مبارک سے جو کلمہ بھی نکلا تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلا اور یہ لوگ بھی کتنے سعادت مند تھے کہ حق سننے اور اس کے واضح ہو جانے کے بعد فوراً سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے، آج فرائض و سُنن ترک کرنے والوں سے ہزار بار کہیئے کہ یہ فرض ہے، یہ سُنّتِ رسُولؐ ہے اور مسلمان کا شعار ہے مگر کیا مجال کہ ٹس سے مس ہوں۔

کلکتہ میں وعظ

جب حضرت سیّد احمدؒ صاحب نے کلکتہ کو قدومِ میمنت لزوم سے نوازا اور یہ لوگ لپکتے ہوئے آئے اور آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے معصیت آلود زندگیوں سے تائب ہو گئے تو حضرت امام صاحب نے زنگ سے دُھلے ہوئے ان دلوں کو صیقل کرنے کے لیے ہر منگل اور جمعہ کو ظہر سے شام تک وعظ فرمانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالحئیؒ صاحب بھی اس مبارک کام میں حصّہ لیا کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ کثرت سے شراب نوشی کے عادی تھے۔ لہذا حرمتِ شراب کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا اور خاطر خواہ کامیابی ہوئی، مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

"ان بزرگوں کے وعظ کی یہ تاثیر ہوئی کہ خلقت مثل پروانہ گرویدہ ہو گئی اور ہر ایک بیعت کنندہ کے شراب نوشی سے تائب ہونے پر شراب کی دوکانیں بند ہو گئیں۔ ٹھیکیداران شراب نے اس کی نالش بہ حضور حاکمانِ شہر کر کے استعفاء داخل کر دیئے اور کہا کہ صبح و شام تک ایک خریدار نہیں آتا کس کے ہاتھ فروخت کریں۔"[2]

شیعہ حضرات کو وعظ

ایک مرتبہ لکھنؤ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ کل ہم شیعوں کی عیدگاہ میں وعظ کہیں گے۔ چنانچہ آپ

حسبِ اعلان وعظ کہنے کے لیے عیدگاہ تشریف لے گئے۔ اس اعلان کی اطلاع عام طور پر ہو چکی تھی اس لیئے دونوں فریق کے لوگ جمع ہو گئے اور بہت بڑا مجمع ہو گیا مولانا ممبر پر تشریف لائے اور وعظ شروع فرمایا، مولوی عبد القیوم صاحب، مولوی عبدالحی صاحب کے صاحبزادے آپ کے پاؤں کے پاس بیٹھے تھے۔ وعظ میں آپ نے مذہبِ تشیع کی خوب دھجیاں اُڑائیں۔ اس وعظ میں دو نوعُمر اور نوجوان لڑکے جو آپس میں بھائی بھائی تھے جن میں سے ایک کا نام محمد ارتضا تھا اور دُوسرے کا نام محمد مرتضیٰ تھا مولانا کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے، ان پر اس وعظ کا اثر ہُوا اور ان میں سے چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا کہ مولانا کی تقریر کو سُن کر میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ اس شہر میں ہماری حکومت ہے اور یہ شخص جو مذہبِ تشیع کی اس بے باکی سے تردید کر رہا ہے محض ایک معمولی اور دُبلا پتلا آدمی ہے نہ کہیں کا بادشاہ ہے نہ نواب، نہ اس کے پاس فوج ہے نہ ہتھیار، پھر باوجود اس بےکسی و بےبسی کے جو یہ اس قدر جُرأت دکھلا رہا ہے تو وہ کون سی بات ہے؟ جو اس کو اس بے باکی اور سر فروشی پر آمادہ کر رہی ہے۔ وہ صرف اس کا ایمان ہے۔ اور اب ہم اپنے ائمہ پر نظر کرتے ہیں ہمارے ائمہ ہمارے مذہب کی روایات کے مطابق اس قدر قوی اور شجاع تھے کہ ان کی قوت کو نہ کسی فرشتے کی قوت پہنچتی تھی اور نہ جن کی اور اس کے ساتھ ہی وہ تقیہ بھی اس قدر کرتے تھے کہ مخالف تو درکنار خود اپنے شیعوں سے بھی صاف بات نہ کہتے تھے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ مذہبِ تشیع تو کسی طرح حق نہیں ہو سکتا کیونکہ یا تو ان کی بہادری کے افسانے جھُوٹے تھے یا ان کے تقیہ کی کہانی غلط ہے۔ اب صرف دو مذہب سچے ہو سکتے ہیں یا مذہبِ خوارج جو ان کو کافر سمجھتے ہیں یا مذہبِ اہلِ سُنّت وجماعت جو کہتے ہیں کہ ائمہ نہایت راستگو اور نہایت با ایمان تھے اور ان کی شان " **لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم** " تھی اور ان کا مذہب وہی تھا جو اہلِ سنّت کا مذہب ہے اور جو باتیں ان کی طرف شیعہ نسبت کرتے ہیں وہ ان کا افترا ہے اور جب مذہبِ تشیع بالکل افسانہ ثابت ہُوا اور حق دائر ہو گیا خوارج اور اہلِ سنت کے درمیان تو پھر جب میں ان دونوں مذہبوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہوں تو مجھے اہلِ سُنّت کا مذہب اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے

اس کو سن کر بڑے بھائی نے کہا کہ مجھے بھی یہی خیال ہوتا ہے جب وہ دونوں متفق ہو گئے تو چھوٹا بھائی اٹھا اور کہا کہ مولانا ذرا منبر پر سے اتر جائیے مجھے کچھ عرض کرنا ہے مولانا سمجھے کہ شاید میری تردید کرے گا اور یہ خیال کرکے آپ نیچے تشریف لے آئے۔

اس لڑکے نے منبر پہ جا کر تمام شیعوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ صاحبو! آپ کو معلوم ہے کہ اس مقام پر شیعوں کی حکومت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ مولانا جو اس جرأت سے مذہب تشیع کی تردید فرما رہے ہیں اور نہ ان کو بادشاہ کا خوف تھا اور نہ ارکانِ دولت کا اور نہ عام رعایا کا محض ایک معمولی شخص ہیں کہ نہ ان کو کوئی جسمانی قوت ہم لوگوں سے ممتاز حاصل ہے اور نہ ان کے پاس کوئی فوجی قوت ہے پھر باوجود اس بے کسی و بے بسی اور کمزوری کے جو وہ اس قدر جرأت دکھلا رہے تھے اس کا سبب کیا ہے؟ اور وہ کون سی قوت ہے جس نے ان کو اس قدر جانباز بنا دیا ہے۔ میرے نزدیک وہ قوت صرف قوتِ ایمانی ہے۔ اب میں دریافت کرتا ہوں کہ ہمارے ائمہ جو عمر بھر تقیہ کرتے رہے حتیٰ کہ خود اپنے شیعوں سے بھی ڈرتے رہے تو اس کمزوری کا کیا سبب ہے؟ اگر اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں قوت نہ تھی، اوّل تو مذہب تشیع اس کا انکار کرتا ہے اور ان کے اندر انسانی طاقت سے زیادہ طاقت بتلاتا ہے پھر اگر اس کو تسلیم نہ بھی کر لیا جاوے تو وہ قوت میں مولوی اسمٰعیل صاحب سے کسی صورت میں کم نہ ہوں گے پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں مولوی اسمٰعیل صاحب کی سی جرأت نہ تھی اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان میں وہ مولوی اسمٰعیلؒ سے بھی کمزور تھے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب تشیع تو کسی طرح سے حق نہیں ہو سکتا اگر حق ہو سکتا ہے تو مذہب خوارج یا مذہب اہلِ سنت اور یا تو ائمہ (نعوذ باللہ) سراسر بے ایمان تھے جیسے خوارج کہتے ہیں اور یا وہ پکے سُنّی تھے جیسے اہلِ سنت کہتے ہیں۔ یہ میرا شبہ ہے اگر کسی شیعی کے پاس اس کا جواب ہو تو اس کا جواب دے ورنہ میں مذہب تشیع سے تائب ہوتا ہوں اور میرے ساتھ میرا بڑا بھائی بھی تائب ہو گا اس مجمع میں مجتہدین بھی تھے مگر کسی نے کوئی جواب نہ دیا اس نے پھر کہا کہ یا تو کوئی صاحب جواب دیں ورنہ میں سُنّی ہوتا ہوں اس کا بھی کچھ جواب نہ ملا آخر وہ منبر پر سے اترا اور مولانا سے عرض کیا کہ میں اپنا کام کر چکا ہوں اب آپ

وعظ فرمائیں مولانا نے فرمایا کہ وعظ سے جو میرا مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا اور جو تقریر تم نے کی میں ایسی نہ کرتا اس لیے اب مجھے کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔

یہ دونوں لڑکے کسی بڑے وثیقہ دار کے لڑکے تھے جب یہ سنی ہو گئے تو انہوں نے اپنا سب گھر بار چھوڑ دیا اور چھوڑ کر مولانا کے ساتھ ہو گئے اور انہی کے ساتھ رہے یہاں تک کہ جہاد میں مولانا کے ساتھ شہید ہو گئے۔[۶]

شہزادی کو تبلیغ

اکبر بادشاہ دہلی کی ایک بہن تھیں جن کو بی چھکو کہتے تھے یہ اکبر شاہ سے بہت بڑی تھیں اور انہوں نے اکبر بادشاہ کو گود میں کھلایا تھا اس لیے بادشاہ بھی ان کا ادب کرتے تھے۔ اور تمام شہزادے اور شہزادیاں بھی ان کو بڑا مانتے تھے غرض تمام اہل قلعہ ان سے دبتے تھے اور یہ کوسنے اور گالیاں بہت دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ چند شہزادوں اور چند شہدوں نے مشورہ کیا کہ ایک دن بھرے مجمع میں بی چھکو سے مولوی اسمٰعیل کو گالیاں دلوانی چاہئیں اور اس کے لیے تدبیر یہ کی گئی کہ ان شہزادوں نے ایک دعوتی جلسہ تجویز کیا جس میں بی چھکو کو بھی مدعو کیا اور مولانا شہیدؒ کو بھی اور جو شہزادے اور شہدے اپنے ہم مذاق تھے ان کو بھی دعوت دی گئی اور جو شہزادے وغیرہ ان کے ہم مذاق نہ تھے ان کو مدعو نہیں کیا گیا اور اس عرصہ میں یہ کارروائی کی گئی کہ مولانا شہیدؒ کی طرف سے بی چھکو کو خوب بھر دیا گیا کہ اسمٰعیل بی بی کی صحنک کو منع کرتا ہے اور میراں کے بکرے کو ناجائز کہتا ہے، فلاں کے روٹ کو منع کرتا ہے، فلاں کے توشہ کو۔ شیخ عبدالقادرؒ کی گیارھویں کو منع کرتا ہے، اور یہ کرتا ہے وہ کرتا ہے۔ جب خوب اچھی طرح بی چھکو کے کان بھر دیے تو جلسہ منعقد کیا گیا۔

یہ سب لوگ جلسہ میں آئے اور بی چھکو بھی آئیں (مگر یہ پردہ میں تھیں) اتفاق سے مولوی اسمٰعیل صاحب کو ذرا دیر ہو گئی اس پر اور ان کو موقع ملا اور انہوں نے بی چھکو سے کہا کہ دیکھیے یہ شخص کتنا مغرور ہے کہ اب تک نہیں آیا اس پر وہ اور بھی برہم ہو گئیں۔ غرض یہ کہ جب مولانا شہیدؒ جلسہ میں پہنچے اس وقت یار لوگ بی چھکو کو خوب برہم کر چکے تھے ان کے پہنچنے پر بی چھکو نے غصہ کی آواز سے پوچھا کہ عبدالعزیز کا بھتیجا اسمٰعیل آ گیا۔ مولانا جلسہ کا رنگ دیکھ کر تاڑ

گئے تھے کہ آج ضرور کوئی شرارت کی گئی ہے آپ نے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا اور فرمایا اخاہ! یہ آواز تو چھکو اماں کی معلوم ہوتی ہے۔ اماں سلام!

جب انہوں نے اس انداز سے گفتگو کی تو بی چھکو کا غصہ سب کافور ہوگیا اور انہوں نے بڑوں کے قاعدے سے اُن کے سلام کا جواب دیا اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے کہا اسمٰعیل ہم نے سُنا ہے کہ تم بی بی کی صحنک کو منع کرتے ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ اماں میں منع نہیں کرتا بھلا میری کیا مجال ہے کہ میں بی بی کی صحنک کو منع کروں۔ انہوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ جو کوئی کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے بات صرف اتنی ہے کہ بی بی کے ابا جان منع کرتے ہیں میں لوگوں کو بی بی کے ابا جان کا حکم سُناتا ہوں اس پر بی چھکو نے حیرت کے لہجہ میں فرمایا کہ بی بی کے ابا منع کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا جی ہاں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"مَن احدث فی دیننا ھٰذا مَا لَیسَ منه فهو ردٌ"

اور حدیث پڑھ کر اس کی تفصیل فرمائی اور اس سے صحنک کی ممانعت ثابت فرمائی۔

بی چھکو نے جو یہ تقریر سُنی تو مان گئیں اور کہا کہ اب اگر کوئی عورت کرے گی تو اس حرامزادی کی ناک چٹیا کاٹ لوں گی۔ ہم بی بی پر ایمان نہیں لائے ہم تو بی بی کے ابا پر ایمان لائے ہیں جب وہی منع کرتے ہیں تو پھر ہم کیوں کریں؟

مجمعوں اور میلوں میں وعظ

"مولوی اسمٰعیل صاحب کاندھلوی (مولوی یحییٰ صاحب کے والد) اور مولوی عبدالرحیم (رانڈوں کی شادی والے) بیان کرتے تھے کہ مولوی اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کا قاعدہ تھا کہ جہاں کہیں کوئی میلا ہوتا خواہ ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا یا کوئی اور مجمع ہوتا جیسے ناچ کی محفل تو آپ وہاں پہنچتے اور کھڑے ہو کر وعظ فرماتے اور اس کا اثر یہ ہوتا کہ جہاں ناچ یا قوالی وغیرہ کی محفل ہوتی اور آپ وہاں وعظ فرماتے تو اکثر لوگ محفل کو چھوڑ کر آپ کے وعظ میں آجایا کرتے تھے آپ حضرت نظام الدین اولیاء میں بھی پہنچتے تھے اور وہاں بھی وعظ فرماتے تھے اور وہاں بھی یہی اثر ہونے لگا تھا جب مجاوروں نے یہ رنگ دیکھا تو ان کو سخت ناگوار ہوا اور انہوں نے مشورہ کیا کہ مولوی اسمٰعیل کو کسی طرح قتل کر دینا چاہیے اس پر ایک بڈھے نے آپ کے قتل کا بیڑا اٹھایا اور کہا کہ میں

ان کو قتل کروں گا عزم یہ عمل طے پاگیا۔ ایک روز مولانا شہیدؒ جامع مسجد میں بیچ کے در میں وعظ فرما رہے تھے کہ اس بڈھے نے مولانا پر تلوار کا وار کیا سو مولانا تو بچ گئے مگر وہ تلوار ان کے ایک دوست کے لگی اور ران کا شانہ زخمی ہو گیا (خاں صاحب حضرت امیر شاہ نے فرمایا کہ راویوں نے ان کے دوست کا نام لیا تھا مگر مجھے یاد نہیں رہا) اس پر مولانا کے دوست اس بڈھے کو لپٹ گئے اور تھپڑ وغیرہ مارے مولانا نے اس بڈھے کو چھڑا دیا اور کوئی مقدمہ نہیں چلایا۔

اللہ کے دین کی تبلیغ کا یہ جذبۂ صادقہ ہی تھا جو دشمنوں کی محفلوں اور مشرکوں اور بدعتیوں کے میلوں وغیرہ میں جانے اور حق سنانے پر مجبور کرتا اور پھر اس مجسّم اخلاق اور پیکر رشد و ہدایت کے حلم اور عفو کا اندازہ لگائیے کہ دشمن خون کا پیاسا ہے اور تلوار کا وار کرنے سے نہیں چوکتا مگر آپ اسے معاف فرما دیتے ہیں اور قطعاً کوئی انتقام نہیں لیتے۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

؎ شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

مخالفت ان سابقہ صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے حبِّ الٰہی، عشقِ رسولؐ، ولولۂ جہاد اور تڑپ احیائے دین کے جذبات سے سرشار ہو کر تبلیغ و اشاعت دین میں دن رات ایک کر دیا اور جملہ انبیاء کرام کی اس سنّت پر عمل پیرا ہونے میں قطعاً کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کیا یہ سب کچھ حالات کی موزونی، قوم کی موافقت اور امن، چین اور سکون کے ساتھ انجام پا گیا؟ نہیں ہرگز نہیں یہ ممکن ہی نہیں کوئی سفر طائف اختیار کرے اور پتھر اس کا استقبال نہ کریں۔ آپ کو بھی ان تمام مصائب و شدائد سے دوچار ہونا پڑا، اصحابِ دعوت و عزیمت کے راستے میں جو حائل ہوا کرتے ہیں۔

یہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ ایک بوڑھے نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا حتیٰ کہ تلوار کے ساتھ آپ پر وار بھی کر دیا۔ لیکن مشیّت ایزدی تھی کہ آپ کو کوئی نقصان نہ

پہنچ سکا بلکہ آپ کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا علاوہ ازیں آپ پر پھبتیاں کسی گئیں، گالیاں دی گئیں اور پتھر برسائے گئے مگر صبر و استقامت کا یہ کوہِ گراں میدان میں بڑی آن بان سے کھڑا رہا اور بڑے سے بڑے آلام و مصائب بھی قطعاً جنبش پیدا نہ کر سکے تو اہلِ باطل نے ایک اور حیلہ سوچا کہ ڈیڑھ ہزار معززینِ شہر کے دستخط کروا کے دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کو ایک درخواست لکھی جس میں الزام لگایا گیا کہ مولانا اسمٰعیل کی تقریروں سے نقضِ امن کا خطرہ ہے اور اندیشہ ہے کہ شدید انتشار پیدا ہو جائے گا جس پر قابو پانے کے لیے فوج طلب کرنا پڑے گی۔ آپ کے سب سے بڑے حریف اور علماءِ سُو کے سرغنہ مولوی فضل حق خیرآبادی اس سلسلہ میں پیش پیش تھے چنانچہ یہ اس وقت انگریزی گورنمنٹ کے ملازم تھے اور سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز تھے اس لیے یہ آپ کی تقریر پر پابندی کے احکام صادر کرانے میں کامیاب رہے چنانچہ چالیس دن تک آپ کا وعظ بند رہا۔

آخرکار آپ نے بھی اس حکم کے خلاف اپیل دائر کر دی اور آپ نے "اسّی"[۸۰] وجوہات لکھ کر ثابت کیا کہ اگر تقریر بند رہی تو یہ یہ خرابیاں رُونما ہوں گی۔ ریذیڈنٹ نے مولوی فضل حق کو بُلا کر کہا:۔

"مولوی صاحب چالیس دِن تک شاہ اسمٰعیلؒ کا وعظ بند رکھّا گیا میری رائے میں یہ بالکل غلط کارروائی ہوئی ہے اتنے بڑے مولوی کے ساتھ ناجائز برتاؤ کیا گیا ہے ابھی حکم لکھ دو کہ وعظ کھولا جائے اور جو کوئی مزاحم ہو اسے قانونی سزا دی جائے۔

مولوی فضل حق نے وعظ کے اجراء کا حکم تو لکھ دیا لیکن اسے ارسال نہ کیا کئی دن گزرنے کے بعد امام صاحب مولانا عبدالرحیم محدّث، مولانا عبدالصمد بنگالی اپنے منشی ہیرالال اور ایک خادم کو لے کر پھر ریذیڈنٹ کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ جب اسے آپ کی تشریف آوری کا علم ہُوا تو فوراً باہر نکل آیا اور اندر کوٹھی میں لے گیا۔ مزاج پُرسی کے بعد ریذیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے۔

"مولوی صاحب ہمارے سررشتہ دار کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا تھا لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو

تو میں نے اسی وقت حکمِ ثانی لکھوا دیا تھا تاکہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو غالباً آپ وعظ فرماتے ہوں گے۔"

آپ نے فرمایا کہ مجھے حکمِ ثانی موصول نہیں ہوا تو ریذیڈنٹ نے مولوی فضل حق کو طلب کیا اور نہایت غصّے سے کہا کہ جب چھ روز ہو چکے ہیں میں اجراء وعظ کا حکم دے چکا ہوں تو تم نے میرے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی۔ مولوی صاحب کوئی معقول جواب نہ دے سکے چنانچہ ان کو تین ماہ کے لیے معطّل کر دیا گیا اور وہ رامپور چلے گئے اور حضرت امام صاحب اجازت لے کر واپس تشریف لے آئے ریذیڈنٹ نے نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو الوداع کیا

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فنِ خطابت میں مکمل دسترس سے نوازا تھا۔ اور پھر اخلاص، للّٰہیت، تڑپ احیاء دین اور پند و موعظت کے جذبہ بے پناہ نے قوّتِ تاثیر کو چار چاند لگا دیئے جذبہ اصلاح کی ایک مثال سماعت فرمایئے۔ ایک مرتبہ آپ نے خطاب فرمایا۔ ابھی بیان ختم کر کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے حیرت سے پوچھا کہ کیا آپ کا خطاب ہو چکا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ ہو چکا۔ وہ کفِ افسوس ملنے لگا کہ میں تو گھر سے دور دراز کا فاصلہ طے کر کے اس لیے حاضر ہوا تھا کہ کچھ پند و نصیحت سنوں گا۔ آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا بھائی افسوس نہ کرو میں تمہیں پھر سنائے دیتا ہوں چنانچہ آپ نے پورا وعظ اوّل سے آخر تک دہرا دیا کہ شاید اسی ایک کو ہدایت ہو جائے "لأن یھدی اللہ بك رجلاً واحداً خیرٌ لك من حمر النعم"۔

ڈاکٹر ہنٹر نے ایک عام وہابی مبلغ کے متعلق لکھا ہے۔

"جہاں تک میرا تجربہ ہے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، سب سے کم خود غرض اور بے لوث ہو گا۔"[1]

جب وہابیوں کے ایک بہت بڑے دشمن کے ان کے ایک عام مبلغ کے متعلق یہ تاثرات ہیں تو کیا وہابیوں کے امام اور ان کے رئیس المبلغین حضرت امام محمد اسمٰعیلؒ کی للّٰہیت بے غرضی اور بے لوثی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب آپ خطاب فرماتے

تو ہزاروں کی تعداد میں سامعین جمع ہو جاتے حتیٰ کہ ہم عصر علماء حسد کا شکار ہو گئے چنانچہ مولوی مرزا حسن علی صاحب محدث لکھنویؒ آپ کی مجلس وعظ میں ہجوم خلائق دیکھ کر از راہِ حسد کہا کرتے تھے کہ میں بھی قرآن و حدیث کا وعظ کرتا ہوں اور یہ بھی قرآن و حدیث کا وعظ کرتے ہیں مگر میرے وعظ میں دس پانچ آدمی سے زیادہ جمع نہیں ہوتے اور ان کے وعظ میں سارا شہر ٹوٹا پڑتا ہے اور مسجدوں میں سامعین کو بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔

اندازِ بیاں اور

قدرت کی طرف سے آپ کو جس بے مثل سخنوری، قوتِ گویائی خوبیٔ تقریر اور زورِ بیان سے نوازا گیا اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔ ایک مرتبہ مجلسِ وعظ میں آپ نے ایک رکوع کی تفسیر و تشریح اس قدر احسن پیرایۂ بیان میں کی کہ مولانا امام بخش صاحب صہبائیؒ، مولانا عبداللہ خانؒ صاحب اور مفتی صدر الدین صاحبؒ جیسے جلیل القدر علماء نے جو کہ اس وقت شریکِ مجلس تھے آپ سے درخواست کی کہ یہ بیان دوبارہ کیا جائے آپ نے ان حضرات کے حسبِ استدعا ایک دوسرے جلسہ میں اس رکوع کی تلاوت کی اور ترجمہ کے بعد اس قدر فصیح و بلیغ انداز میں اس کا مفہوم سمجھایا کہ بڑے بڑے علماء دنگ رہ گئے اور پھر لطف یہ کہ آپ نے جو اسرار و رموز بیان فرمائے وہ پہلے دن کی نسبت بالکل مختلف تھے ایک تیسری نشست میں بھی سامعین کی طرف سے اسی رکوع کے بیان کی درخواست ہوئی جسے آپ نے شرفِ قبولیت بخشا اور سابقہ دونوں بیانوں کی نسبت آج بالکل نئے اور اچھوتے انداز سے اس کی وضاحت فرمائی کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص قوتِ تاثیر سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں بدعتی اور شیعہ اپنی بدعات اور غلط عقائد سے تائب اور غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی شخص آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے توحید و اتباعِ سنت کا بیان سنے اور شرک و بدعت سے توبہ نہ کرے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

چند اصلاحی کارنامے

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دین کی نصرت و حمایت اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے ہی پیدا فرمایا تھا یہی وجہ ہے کہ جب ہم آپ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ نے

قدم قدم پر ایسے ایسے اصلاحی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو رہتی دُنیا تک یاد رہیں گے آپ کی تدریس و تبلیغ کا ذکر ہو چکا، حج، جہاد اور تصنیفی کارناموں کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا ذیل میں چند دیگر اصلاحی کارناموں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تطہیر مسجد

آپ کے دور میں مسلمانوں کے دِلوں میں مسجدوں کا احترام باقی نہیں رہا تھا حتیٰ کہ دہلی کی جامع مسجد کے اندرونی حوض پر ایک بازار لگتا تھا جس میں سودا سلف اور کھلونوں وغیرہ کی بے شمار دوکانیں تھیں اور تو اور مسلمانوں کی بے حمیتی اس حد تک تجاوز کر گئی تھی کہ مسلمانوں کی اس عظیم الشان مسجد میں ہندوؤں نے بھی دوکانیں لگانی شروع کر دیں حضرت امام صاحبؒ نے خانۂ خُدا کی بے حرمتی کو جب مُلاحظہ کیا تو احترامِ مساجد کے عنوان سے اس قدر جامع اور پُر از تاثیر خطاب فرمایا کہ لوگوں میں اتنا جوش و خروش پیدا ہو گیا کہ اگر انہیں منع نہ کر دیا جاتا تو وہ لاٹھیاں مار مار کر دوکانداروں کا بُرا حشر کر دیتے۔ لیکن اس دانائے روزگار نے خُون خرابہ کی بجائے اعتدال کا یہ راستہ اختیار فرمایا کہ تمام سامعین کے دستخطوں سے اس مفہوم کی اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں ایک درخواست ارسال کر دی کہ مسجد میں دوکانیں اور بازار اس کے تقدّس کے منافی ہے لہٰذا اسے فوراً ختم کر دیا جائے چنانچہ اکبر نے اس درخواست کو فوراً منظور کر کے مسجد میں بازار لگنے کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا۔ آپ کی اس اصلاح کو خاص و عام سب نے بہت زیادہ پسند کیا۔

نکاحِ بیوگان

حضرت امام صاحبؒ کے زمانہ میں ہندوؤں کے ساتھ میل جول کے پیشِ نظر مسلمانوں میں جو معیُوب اور غیر شرعی رسوم رواج پا گئی تھیں ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو وہ ہرگز ہرگز دوسرا نکاح کرنے کی مجاز نہ تھی خواہ اس کی عمر کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہوتا حالانکہ اسلام میں بیوہ عورتوں کا نکاحِ ثانی بالکل معیُوب نہیں بلکہ ان میں سے خصُوصاً ضرورت مندوں کے نکاح کی تاکید کی گئی ہے اور تو اور خود سرورِ دنیا و دین رحمتہ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مُطہرات میں سے اکثر و بشیتر بیوہ تھیں اس سُنّت کے احیاء کی طرف سب سے پہلے حضرت سید صاحبؒ نے توجّہ فرمائی۔ آپ کے منجھلے بھائی سیّد محمد اسحٰق صاحبؒ کی بیوہ جوان تھی اور اس کا چھ سات برس کی عُمر کا ایک بچہ تھا

احیائے سُنّت کے پیشِ نظر آپ نے ان کو نکاح کی ترغیب دی مگر انہوں نے تسلیم نہ کیا اسی دوران آپ نے خواب دیکھا کہ لکڑیوں کے ایک بھاری گٹھا کو اکثر لوگ اٹھانے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اٹھا نہیں سکتے اور وہاں آپ کی یہ بھاوج بھی موجود ہیں آپ نے عاجزی و انکساری کے ساتھ اُن سے کہا کہ اگر تم ذرا مدد کرو تو میں اس وزنی گٹھے کو اٹھا کر گھر لے چلتا ہوں اولاً تو انہوں نے بھی اس کے بھاری ہونے کی وجہ سے انکار کیا لیکن بالآخر سیّد صاحبؒ کا اصرار ان کے انکار پر غالب آیا اور وہ راضی ہوگئیں۔ صُبح کی نماز کے بعد انہوں نے حضرت امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کو اپنا خواب سُنایا اور فرمایا کہ اس کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اس رسمِ قبیح کا خاتمہ کر دوں گا۔ اس کے بعد سیّد صاحبؒ گھر تشریف لے گئے اور تمام رشتہ دار خواتین کو جمع کر کے وعظ فرمایا کہ:-

"اسلام یہ نہیں کہ انسان زبان سے کہے کہ میں مسلمان ہوں یا گائے کا گوشت کھائے اور ختنہ کرائے یا مسلمانوں کی مُروّجہ رسموں میں شریک رہے اسلام یہ ہے کہ تمام احکام الٰہی کی تعمیل دل و جان سے کی جائے یہاں تک کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح ذبح فرزند کا بھی اشارہ ہو تو اسے خوشی خوشی بجا لائے منہیاتِ شرعی کا خیال بھی دِل میں آئے تو چالیس(۴۰) روز تک استغفار کرے۔

انہیں احکام میں سے بیوہ کا نکاحِ ثانی بھی ہے خصوصاً وہ بیوہ جو جوان ہو۔ افسوس کہ اس زمانے میں بیوہ کے نکاحِ ثانی کو شرک اور کُفر کے برابر سمجھ لیا گیا ہے۔ اس پر عمل پیرائی کو نہایت درجہ قبیح و شنیع تصوّر کیا جاتا ہے ...

...... جو بیوہ نکاح کرے اسے بہت نازیبا الفاظ سے مطعون کیا جاتا ہے یہ کوئی نہیں سوچتا کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن، حضرت عائشہ رضؓ کے سوا سب بیوہ تھیں۔"

دوسرے دِن بھی آپ نے اسی مفہوم کا وعظ فرمایا اور ساتھ ہی [illegible]

کہا کہ ہماری بھاوج کو نکاح پر جس طرح بھی ممکن ہو راضی کر و اور میں صرف بہ احیائے سُنتِ نبوی ؐ کے پیشِ نظر اصرار کر رہا ہوں ورنہ میرے گھر میں حسین و جمیل اور عفت مآب بیوی موجود ہے آخر کار تمام اعزہ و اقارب کے کہنے پر سیدہ ولیہ راضی ہو گئیں اور آپ کا نکاح ہو گیا اس کے بعد سید صاحبؒ نے حضرت امام صاحبؒ سے خطوط کے مسودے مرتب کرا کے دہلی، رامپور پھلت اور دیگر مرکزی مقامات پر بھجوا دیئے تاکہ اس عملِ صالح کی خوب خوب اشاعت ہو جائے
اس سُنّتِ نبوی کے احیاء کی ابتداء اگرچہ سید صاحبؒ نے کی مگر پھر حضرت امام صاحب نے بھی اس سلسلہ میں بے پناہ سعی و کاوش کی سب سے پہلے تو اپنی معمّر بیوہ ہمشیرہ کو مولانا عبدالحی صاحبؒ کے حبالۂ عقد میں دے دیا اور پھر اس مضمون کو اپنے وعظ و ارشاد کا عنوان بنا لیا۔ نکاحِ ثانی کی فضیلتیں اور اس کو معیوب سمجھنے کی برائیاں ایسی وضاحت اور خوبی کے ساتھ بیان فرمانا شروع کیں کہ دہلی میں ہزار ہا رانڈوں کے نکاحِ ثانی ہو گئے۔
مولانا جعفر تھانیسریؒ کا بیان ہے کہ" ایک معتبر دیرینہ شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ اس وقت دس ہزار کے قریب بیکس و بے بس رانڈیں آپ کی سعی اور کوشش سے شوہر والیاں ہو گئیں اور آپ کی بدولت یہ رسم زبوں ہمیشہ کے واسطے شہر دہلی سے اٹھ کر سنّتِ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم جاری ہو گئی۔ اسی طرح ایک روز خانم بازار میں تقریباً تیس کسبیوں کو جمع کر کے ان کو وعظ سُنایا اس شام ان میں سے انتیس کسبیوں نے توبہ کر کے نکاح کر لیے[۱]۔

اصلاحِ عقائدِ شیعہ

برِ صغیر پاک و ہند میں سُنّی اور شیعہ دو بڑے مذہبی فرقے اگرچہ ابتداء سے ہی چلے آ رہے تھے لیکن عہدِ مغلیہ کے آخری دور میں ان دونوں فرقوں میں حصولِ اقتدار کے لیئے مسابقت شروع ہو گئی۔ شیعہ پارٹی اگرچہ تعداد میں قلیل تھی مگر تدبر اور تنظیم کے اعتبار سے مضبوط تھی اس لیئے اکثر اسے کامیابی حاصل ہوتی اور ہمایوں کے دوبارہ ہندوستان آنے کے بعد تو اسے بہت ہی زیادہ فروغ نصیب ہو گیا۔ اکبر[۱] کی مذہبی پالیسی بھی بہت آزاد تھی اور اس کے دورِ حکومت میں بھی شیعہ کو بڑا رسوخ حاصل ہوا۔ یاد رہے کہ اکبر کے نائب السلطنت بیرم[۲] خاں کے زوال کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ مذہباً شیعہ تھا امرائے دہلی کی اکثریت سُنّی

تھی اور انہیں بجا طور پر یہ شکایت رہتی تھی کہ بیرم خاں شیعہ سے امتیازی سلوک کرتا ہے چنانچہ اس نے شیخ گدائی کو جو کہ شیعہ تھا صدرِ صدور کے عہدہ پر فائز کر دیا اور اس کو تمام دیگر علماء اور سادات پر فوقیت دیتے ہوئے کورنش بجا لانے سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔ جہانگیر[۲۱] کے زمانہ میں بھی شاہی دربار میں شیعہ کو کافی اثر و رسوخ حاصل رہا۔ اورنگ زیب اگرچہ سنّی تھا لیکن اس کے دربار میں بھی شیعہ بکثرت تھے حتیٰ کہ اورنگ زیب کے صاحبزادے بہادر شاہ اوّل[۲۲] نے تو اپنے دورِ حکومت میں مذہب تشیع کو اختیار کر لیا تھا۔ اور اس نے ۱۷۰۹ء میں اپنے شیعہ وزیر منعم خاں کے مشورہ سے حکم دیا کہ خطبۂ جمعہ میں خلفائے راشدین کے ذکر میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "علیٌ ولیُّ اللہ وصی رسول اللہ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ آگرہ، احمد آباد اور بعض دوسرے شہروں میں سنّی مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔ احمد آباد میں خطیب نے اس پر عمل شروع کیا تو عامۃ المسلمین نے برافروختہ ہو کر اسے قتل کر دیا۔ لیکن بادشاہ اپنے فیصلہ پر مُصر رہا حتیٰ کہ لاہور میں صورتِ حال انتہائی نازک شکل اختیار کر گئی۔ بادشاہ نے علماء کرام کو مباحثہ کے لیے بلایا اور بزورِ بازو اپنے فیصلہ کی تائید حاصل کرنا چاہی مگر مولانا یار محمد نے نہایت حق گوئی و بے باکی کے ساتھ اپنے موقف سے سرِ مو نہ ہلنے کا اظہار کیا۔ تو بادشاہ نے کہا تم میرے غضب سے نہیں ڈرتے؟ تو انہوں نے نہایت جرأت سے جواب دیا۔

"میں اپنے خدا سے چار چیزوں کی آرزو رکھتا تھا۔ حصولِ علم، حفظِ قرآن حج اور شہادت۔ خدا کے فضل سے پہلی تین تو پوری ہو گئیں آرزوئے شہادت باقی ہے زہے قسمت، اگر یہ حاصل ہو جائے۔"[۲۳]

اس مباحثہ میں کئی روز لگ گئے۔ تمام آدمی مولانا یار محمد صاحب سے متفق تھے بالآخر بادشاہ نے افسرِ توپ خانہ کو حکم دیا کہ وہ بروز جمعہ ۲ر اکتوبر ۱۷۱۱ء بادشاہی مسجد کے منبر سے حکم شاہی کے مطابق خطبہ پڑھے مگر زندہ دلانِ لاہور نے عزمِ صمیم کر لیا کہ حکومت سے ٹکرا جائیں گے لیکن یہ نہ ہونے دیں گے اور اس مقصد کے لیے ایک لاکھ فرزندانِ توحید جمع ہو گئے بادشاہ نے انسانوں کے اس بحرِ ناپیدا کنار کو دیکھا تو اس کے وقار کی موتی ٹوٹ گئی، زرد پتوں کی طرح بکھر گیا اور اسے مسلمانوں کے سامنے جھکنا پڑا چنانچہ اس نے اپنا حکم واپس لے لیا اور ملک میں

خطبۂ عہدِ عالمگیری کے مطابق ہونے لگا۔ اس واقعہ کے بعد کسی مغل حکمران کو شیعہ عقائد کی پشت پناہی کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ البتہ اٹھارویں صدی میں جو جدید ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوئیں ان میں اکثریت شیعہ حکام کی تھی اور مغل حکمرانوں کی پشت پناہی کے پیش نظر مذہب تشیع کے جراثیم دور دور تک پھیل گئے حتیٰ کہ اچھے خاصے سنی گھرانے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے دور میں جب اس صورت حال کو دیکھا تو اس کے انسداد کیلیے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین دو بلند پایہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ حضرت شاہ صاحب کے بعد ان کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی اس صورتِ حال کو ملاحظہ کیا اور دیکھا کہ اب تو نوبت بایں جا رسید کہ شیعہ مذہب کی نشر و اشاعت کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہو جس کے ایک دو فرد شیعہ افکار و نظریات سے متاثر نہ ہوں حتیٰ کہ ان کے اپنے گھر میں انکے عزیز اور مشہور فارسی دان شاعر میر قمر الدین منت[۲۴] نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا چونکہ یہ صورتِ احوال ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی اسلیے اس کے تدارک کے لیے تحفہ اثنا عشریہ،، کے نام سے معرکۃ الآراء کتاب تصنیف فرمائی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی اس معرکۃ الآرا اور خارا شگاف کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کے دورِ تصنیف سے لے کر آج تک کے شیعہ علماء نے اپنی تمام قوتِ بیان اس کی تردید میں صرف کر دی ہے جیسا کہ اہلِ بدعت نے حضرت امام ہمام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف لطیف " تقویۃ الایمان" کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانے کیلیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا لیکن ؎

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

شیعہ علماءِ لکھنؤ میں سب سے ممتاز مولوی دلدار علی[۲۵] نے کچھ کتابیں اور رسالے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تحریرات کی تردید میں لکھے "صوارم الالہیات" "حسام الاسلام" احیاء السنۃ میں تحفہ اثنا عشریہ" کے ان ابواب کا جواب ہے جو بالترتیب الٰہیات، نبوت اور معاد و حجت کے متعلق ہیں رسالہ ذو الفقار" تحفہ کے باب ۱۲ از دہم کے جواب میں ہے خاتمہ کتاب صوارم میں اثباتِ امامت کا ذکر ہے اور رسالہ" غیبت" میں شاہ صاحب کے اقوال دوبارہ غیبت کا ذکر ہے حکیم مرزا محمد کامل دہلوی[۲۶] نے تحفہ کے جواب میں نہ صرف نزہت اثنا عشریہ" لکھی بلکہ ان مباحث سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو تحفہ کی اشاعت سے پیدا ہوئے تھے انہوں نے اپنی عمر صرف کر دی اسی طرح مفتی محمد قلی خاں کنتوری[۲۸] کا وظیفہ حیات بھی تحفہ کی تردید معلوم ہوتا ہے تحفہ کے باب ہشتم کا جواب انہوں نے

تنبیہ الطائن و کشف المغالطن" میں دیا۔ "سیف ناصری" میں باب اوّل "تقلیب المکائد" میں باب دوم "برہان سعادت" میں باب ہفتم اور "مصارع الافہام" میں باب یازدہم کا جواب دیا اسی طرح مولوی دلدار علی کے جانشین مولوی محمد صاحب نے بھی تحفہ اثنا عشریہ" کی تردید میں رسالے لکھے تحفہ اثنا عشریہ "جب ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کے ایک شیعہ رئیس میر اشرف علی نے دس ہزار روپے تحفہ کا جواب لکھنے کے لیے عراق بھیجا تھا تحفہ اثنا عشریہ" فی الحقیقت ایک معرکۃ الآرا کتاب تھی جو کہ شیعہ سنی مسائل کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اگرچہ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ کی دو کتابیں بھی موجود تھیں جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا لیکن ایسی جامع اور مانع کتاب کوئی نہ تھی اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے انتخاب میں اصول حق کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے شیعہ مذہب اور خیالات کے بیان میں فقط مستند اور معتبر کتب پر انحصار کیا گیا ہے اور تواریخ و تفسیر میں فقط انہی چیزوں کو چنا گیا ہے جن پر شیعہ سنی دونوں فریق متفق ہیں کتاب کی زبان اور طرز بیان متین اور مہذبانہ ہے۔ اس تمام داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں شیعہ مذہب کو جو فروغ سرا اسے روکنے میں اگرچہ شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبدالعزیزؒ کی تصانیف کو بڑا دخل تھا۔ اور یہ اُن کا نہایت علمی کارنامہ تھا لیکن اس کے باوصف حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتابوں میں اپنے مخصوص مصلحت آمیز طرز بیان کو پیش نظر رکھا اسی طرح اگرچہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی "تحفہ اثنا عشریہ" متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے اپنی مثل آپ ہے تاہم کتاب کے سرورق پر انہوں نے بطور مصنف جو نام لکھا وہ "حافظ غلام حلیم بن شیخ محمد قطب الدین احمد بن شیخ ابوالفیض دہلوی تھا۔ غلام حلیم آپ کا تاریخی نام تھا۔ اسی طرح قطب الدین احمد حضرت شاہ ولی اللہ کا دوسرا نام تھا جو کہ شہرت حاصل نہ کر سکا علیٰ ہذا القیاس ابوالفیض حضرت شاہ عبدالرحیم کی کنیت تھی جس کا بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ لیکن ان تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سب سے زیادہ جس نے جرأت و جسارت کا مظاہرہ کر کے شیعت کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی اور سر بازار وہ باتیں کہہ دیں جن کے کہنے کی بڑے بڑے لوگوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ حضرت امام محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

حضرت امام صاحبؒ نے لکھنؤ میں قیام کے زمانہ میں جب ملاحظہ فرمایا کہ شرک و بدعت کے ساتھ ساتھ دیگر امراض جو اسلام کے رُخ زیبا کو مسخ کیے جا رہے ہیں وہ شیعہ عقائد میں

جوکہ سراسر غلط اور کتاب و سُنت سے کوسوں بعید ہیں اس لیے آپ نے ارادہ فرمالیا کہ اب سے اسے موضوعِ سخن بنا کر لوگوں کی اصلاح کریں گے جب آپ کے اس عزم کا احباب و رفقاء کو علم ہوا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ فی الحال یہ اقدام اٹھانا مصلحت کے خلاف ہے کیوں کہ یہاں شیعہ حکومت ہے ممکن ہے آپ کو نقصان پہنچے مگر آپ نے فرمایا حکیم کے لیے لازم ہے کہ جو مرض ہو اس کی دوا دے اس وقت مرضِ رفض یہاں حدِ اعتدال سے گزرا ہوا ہے اس واسطے اسی مرض کا علاج کرنا ازبس ضروری ہے اور اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا کہ کوئی خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔ چنانچہ آپ نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ ...... الآیۃ کا بیان شروع کیا اور اسی آیت سے ترتیبِ خلافت اور فضائلِ خلفاء ایسی خوبی سے بیان کیے کہ شیعوں سے اس کے سوا کچھ نہ بن پڑا کہ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس آیت کی ترتیب کو جامع القرآن حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدل ڈالا تھا۔ تو اس وقت حضرت امام صاحبؒ نے عہدِ نادر شاہ دُرّانی کا ایک قصّہ بیان فرمایا کہ اس وقت بھی شیعوں نے (جب نادر شاہ نے اپنے سامنے بحث کرائی تھی) اس آیت کے زیر بالا ہونے کا عذر کیا تھا۔ مگر جب نادر شاہ نے علماءِ یہود و نصاریٰ سے جن کی کتابوں کا حوالہ اس کوع میں ہے، استفسار کیا تو انہوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں بھی نبیِّ آخر الزمان کے خلفائے راشدین کی ترتیبِ خلافت اسی طرح ہے جب نادر شاہ نے یہ سُنا تو اس کا غصّہ بھڑکا، چنانچہ اسی غصّہ میں اس نے چند شیعوں کو قتل کرا دیا اور رفض و شیعت سے توبہ کر لی۔

حضرت امام صاحبؒ کی ان تقاریر سے جن میں آپ نے مذہبِ تشیع کی خوب دھجیاں اڑائیں خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ بہت سے لوگ مذہبِ تشیع ترک کر کے اہلِ سنت میں داخل ہو گئے مثلاً دو شیعہ بھائیوں محمّد ارتضاء اور محمّد مرتضیٰ کے آپ کے بیان کو سُن کر شیعت ترک کر کے اہلِ سُنّت میں شامل ہو جانے کا واقعہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ

وعظ و ارشاد کے علاوہ شیعہ حضرات کی اصلاح کے لیے ایک تدبیر آپ نے یہ سوچی کہ کیوں نہ شیعہ کے سب سے بڑے عالم کے پاس جا کر بالمشافہ گفتگو کر کے تبادلۂ خیالات کیا جائے شاید اسی

طرح کسی کو ہدایت نصیب ہو جائے چنانچہ ایک دن آپ مولوی دلدار علی شیعہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور گفتگو میں انہیں لاجواب کر دیا اس واقعہ کی تفصیل مولانا محمد جعفر تھانیسری رح کی زبانی سنیئے :-

" ایک روز مولانا اسمٰعیل شہید رح سپاہیانہ لباس پہنے اور تلوار آبدار گلے میں حمائل کیے ہوئے مولوی دلدار علی صاحب مجتہد کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس وقت مولوی دلدار علی صاحب طالب علموں کو سبق پڑھا رہے تھے مولانا شہید رح بطرزِ دلیرانہ سلام علیک کر کے وہاں بیٹھ گئے چونکہ مجتہد صاحب کے ہاں سوائے بندگی کے اور آداب و تسلیمات کے سلام علیک کا دستور نہ تھا۔ انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آنا ہوا؟ مولانا نے جواب دیا کہ میں مسافر سپاہی ہوں۔ ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجتہد صاحب نے فرمایا کہ وہ کیا مسئلہ ہے؟ مولانا نے عرض کیا کہ تقیہ اور نفاق میں کیا فرق ہے؟ ذرا اس کو سمجھا دیجئے مجتہد صاحب نے بہت دلائل سے ان کا فرق بیان کیا۔ مولانا نے ان سب دلائل کو رد کر کے ان دونوں کو ایک کر کے دکھایا تب مجتہد صاحب نے مزید دلائل اپنے دعویٰ کے بیان کے ضمن میں بیان کیے۔ مولانا نے ان دلائل کو بھی رد کر دیا تب تو مجتہد صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور اپنے دل میں کہا کہ یہ کیسا سپاہی ہے، جو ہمارے دلائل کا ایک تسمہ بھی باقی نہیں چھوڑتا مجتہد صاحب اپنے طالب علموں کے سامنے لاجواب ہو کر بہت خفیف ہوئے اور سمجھ گئے کہ یہ نرا سپاہی نہیں ہے کوئی بڑا علامۂ دہر اور فاضل عصر ہے اس وقت مولانا سے پوچھا کہ آپ کا اسم شریف کیا ہے؟ مولانا نے کہا عاجز عبداللہ ہے اس وقت مجتہد صاحب نے اپنے طلبہ کے سامنے خفت دور کرنے کے لیے یہ بات بنائی کہ ایسے مسائل زبانی تقریر سے طے نہیں ہو سکتے آپ تحریری بحث کریں تب مولانا۔۔۔۔ سلام علیک کر کے وہاں سے چل دیئے۔ مجتہد صاحب نے آپ کے پیچھے آدمی کو دوڑا کر فرمایا کہ معلوم کرو کہ یہ کون شخص ہے اور کدھر جاتا ہے؟ ان آدمیوں نے دریافت کرنے کے بعد مجتہد صاحب سے جا کر کہا کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی مرید رشید سید صاحب کے ہیں تب مجتہد صاحب نے چند آدمی آپ کے پیچھے دوڑا کر منت و آرزو آپ کو واپس بلوا بھیجا۔ جب آپ دوبارہ مجتہد صاحب کے مکان پر پہنچے تو مجتہد صاحب نے

سروقد اُٹھ کر بہت تعظیم سے آپ سے معانقہ اور مُصافحہ کیا اور اوّل بار بہ آداب پیش نہ آنے کی معذرت کی۔ مولانا تھوڑی دیر بیٹھ کر پھر رخصت ہو کر اپنے پیر و مُرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

مجتہد صاحب نے جُملہ اکابر عُلماء شیعہ کو جمع کر کے ایک بڑا لمبا چوڑا استفتاء امر متنازعہ فیہ کا مع جواب مُدلّل بدلائل عقلی و نقلی و مملّو بہ لغات مُشکلہ و مضامین تفاسیر و احادیث و کتب سیر تواریخ وغیرہ لکھ کر آپ کے پاس بھیج دیا جب مولوی دلدار علی صاحب کا آدمی اس کاغذ کو لے کر آیا۔ مولانا صاحبؒ بہ ہیئت ایک سپاہی گلے میں تلوار لٹکائے ٹہل رہے تھے اور مولوی عبدالحی صاحبؒ مع چند آدمیوں کے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے حامل کو قطعاً شک نہ ہوا کہ یہ سپاہی مسلّح بہ شمشیر مولوی ہو گا۔ اس نے مولوی عبدالحی صاحبؒ کو مولانا اسمٰعیل اپنا مکتوب الیہ سمجھ کر کاغذ ان کے حوالے کر دیا۔ مولوی عبدالحی صاحبؒ نے ان مضامین ادق کو جو اس کاغذ میں بھرے تھے دیکھ کر سمجھا کہ بلا موجودگی صدہا کتب ہر علم و فن کے جن کا حوالہ اس کاغذ میں ہے جواب الجواب تحریر ہونا محال ہے اور یہ سب کتابیں ایسی حالتِ سفر میں بآسانی میسّر ہونا دشوار ہے مولوی عبدالحی صاحب نے مُلاحظہ کرنے کے بعد اس کاغذ کو مولانا شہید کے پاس بھجوا دیا۔ مولانا شہیدؒ نے ٹہلتے ٹہلتے اس کاغذ کو اوّل سے آخر تک دیکھا اور اسی دم کاغذ اور قلم و دوات لے کر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر میں اس ادق مسٔلہ کے تمام مندرجہ دلائل کا جواب لکھ کر اس خوبی سے رَدّ کیا کہ پھر اس کا رَدِّ جواب حضرت مجتہد صاحب سے نہ بن پڑا۔

شیعہ حضرات کو دیکھ کر سُنّی مسلمان بھی محرّم میں بہت سی بدعات کے مُرتکب ہو جاتے تھے خصوصاً عورتیں تو اس سلسلہ میں کچھ آگے ہی تھیں وہ اپنے شیر خوار نونہالوں کو امام حسینؓ کا سقّہ بنا کر تعزیوں کے نیچے سے گزارتیں تاکہ ان کی عُمر اور دولت میں اضافہ ہو۔ نو محرّم کو وہ سروں کے بالوں کو کھول کر ثواب کی نیّت سے ان میں بھوسہ ڈالتیں۔ حضرت امام صاحبؒ نے جب ان کو اس قسم کی بے شمار بدعات و خرافات کو مُلاحظہ فرمایا تو ان کے انسداد کے لیے کمربستہ ہو گئے کتاب و سُنّت کی روشنی میں جب آپ نے ان اور دیگر بدعاتِ محرّم کی تردید فرمائی تو بہت سے لوگوں نے ان بدعات سے توبہ کر لی حتیٰ کہ کئی مقامات پر شیعہ حضرات نے تعزیہ کی رسم سے توبہ کر لی۔

باب چہارم

سفرِ حج

شوال ۱۲۳۶ھ (جولائی ۱۸۲۱ء) میں حضرت امام صاحبؒ نے حضرت سیّد احمد صاحبؒ اور دیگر احباب و رفقاء کی معیّت میں حج کا قصد فرمایا۔ یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان کے مختلف عُلماء نے بحری سفر میں اندیشۂ ہلاکت کے پیشِ نظر فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔

پسِ منظر

اس فتویٰ کا پسِ منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب بحرِ ہند اور بحیرۂ عرب پر پرتگیزوں کا قبضہ ہُوا تو انہوں نے حجاج کے لیے خطرات پیدا کر دیئے تھے کیوں کہ پرتگیز اپنے وطن میں سالہا سال تک مُسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے تھے اس لیے مُسلم دشمنی میں یہ اندھے ہو چکے تھے عہدِ مُغلیہ میں انہوں نے اور مسلمانوں کے ازلی و ابدی دشمن انگریزوں نے کئی مرتبہ حاجیوں کے جہازوں کو نقصان پہنچایا اور اس کا انہیں شدید خمیازہ بھی بھُگتنا پڑا لیکن جب مُغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی اور فرنگی جبرہ دستیاں بے لگام ہو گئیں تو بعض عُلماء نے فتویٰ دے دیا کہ سمندری سفر میں بعض اوقات جہاز ڈوب

جاتے ہیں یا ڈبا دیئے جاتے ہیں لہٰذا راستہ کے پُر امن نہ ہونے کے پیشِ نظر فریضۂ حج ساقط ہو گیا کیوں کہ راستہ کا پُر امن ہونا حج کی شرائط میں سے ہے۔ جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط پر عمل پیرا ہونے کی فرضیت بھی ساقط ہو گئی ہے۔

امام صاحبؒ کی تردید

جب اس قسم کے فتویٰ کا چرچا ہُوا تو حضرتِ امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس کی زبردست تردید کی اور حج کی فرضیّت کے اثبات پر زور دیا۔ منشی خیر الدین نامی ایک شخص نے اصل فتویٰ جو کہ علماء لکھنو کی طرف سے تھا اور امام صاحبؒ و مولانا عبدالحی صاحبؒ کی طرف سے اس کی تردید حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس ارسال کر کے آخری فیصلہ طلب کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا فیصلہ

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اصل فتویٰ اور اس پر تعاقب کو دیکھ کر جو محاکمہ فرمایا اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے :-

۱۔ علُوم دینیہ و عقلیہ میں اسمٰعیلؒ اور عبدالحی کا پایہ مجھ سے کم نہیں۔

۲۔ جن لوگوں نے فریضۂ حج کو ساقط قرار دیا ہے اُن کے سامنے فتاویٰ کی دو چار مشہور کتابوں کے سوا کچھ نہیں حالانکہ ان کتابوں کی سند ہرگز بلند نہیں اور جن مُعتبر کتابوں پر دین کا مدار ہے ان سے یہ لوگ بہرۂ وافر نہیں رکھتے۔

۳۔ ان کے بیان کردہ حالات کی سند درجۂ اعتبار سے ساقط ہے اور ان کے لگائے ہوئے حکموں پر عمل پیرا ہونا سراسر گمراہی کا مُوجب ہے۔

۴۔ جن حضرات نے آج فرضیتِ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل نماز، روزے کی معافی کا بھی حُکم نہ لکھ دیں گے؟ زکوٰۃ تو ان کے نزدیک بدرجہ اولیٰ ساقط ہو گی۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تفسیرِ عزیزی میں بھی بہ سلسلہ تشریحات وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي .... الآیۃ، مسئلے کے اس پہلو پر توجّہ فرمائی تھی اور لکھا تھا :-

"ہر چند جہاز راگاہے نوبت بہ تباہی ہم عارض شود امابشیتر اوقات بہ سلامت می رسد پس او را خلاف امن طریق نتواں شمرد[2]۔"

اگرچہ جہاز بعض اوقات ڈوب بھی جاتا ہے لیکن چونکہ اکثر سلامت منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اس لیے گاہ گاہ کی غرقابی کو امن طریق کے خلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔

لیکن ان علمی بحثوں کے علاوہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اجتماعی طور پر بہت وسیع پیمانے پر اس فریضۂ الٰہی کو ادا کرکے مانعین پر حجت تمام کردی جائے چنانچہ اس عملی اقدام کے لیے آپ کے پیرومرشد حضرت سید احمد صاحبؒ میدان میں اترے اور انہوں نے اپنے تمام عقیدت مندوں کو سید زین العابدین[3] سے خطوط لکھوا کر ارسال فرما دیئے جن کا مضمون یہ تھا۔

"ہم واسطے ادائے حج کے بیت اللہ جاتے ہیں جن جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو انہیں اپنے ہمراہ لائیں مگر یہ حقیقت ہر ایک پر واضح کردیں کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے نہ خزانہ محض اللہ تعالیٰ پر توکل کرکے جاتے ہیں اس کی ذات پاک سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل سے ہماری مراد پوری کرے گا اور جہاں کہیں راستے میں واسطے حاجت ضروری کے خرچ نہ ہوگا وہاں ٹھہر کر ہم لوگ محنت مزدوری کریں گے جب بخوبی خرچ جمع ہوجائے گا تب وہاں سے آگے کو روانہ ہوں گے عورتیں اور ضعیف مرد جو مزدوری کے قابل نہ ہوں گے ڈیروں کی نگرانی پر رہیں گے اور اس خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک رہیں گے۔"

جن حضرات کی طرف حضرت سید احمد صاحبؒ نے خطوط ارسال فرمائے ان میں حضرت امام صاحبؒ سرفہرست ہیں آپ کے علاوہ چند دیگر مکتوب الیہ حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں مولانا عبدالحی صاحبؒ (بڑھانہ) مولانا وحید الدینؒ ان کے بھائی حافظ قطب الدینؒ اور والد حافظ معین الدین (پھلت) مولانا وجیہہ الدینؒ۔ حافظ عبدالربؒ، حکیم مغیث الدین

اور اُن کے بھانجے شہاب الدینؒ (سہارنپور) اور مُلّا دوندےؒ (بہاولپور) تمام حضرات نے جن کو خطوط لکھے گئے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور دعوت پر لبیک کہا حضرت امام صاحبؒ نے بھی جواب میں لکھا کہ میں حکیم مغیث الدینؒ، مولانا وجیہہ الدین، مولانا وحید الدینؒ اور حافظ قطب الدین پھلتیؒ کی معیت میں مرد و زن پر مشتمل اڑھائی سو کا قافلہ لے کر آ رہا ہوں اور ہم گڑھ مکتشیر کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو چکے ہیں اس طرح دیگر علاقوں کے لوگوں سمیت قریباً چار سو افراد کا قافلہ تیار ہو گیا جو شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ (۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء) کو پیر کے دن کامل بے سرو سامانی کے عالم میں رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ اور کلکتہ پہنچتے پہنچتے اس مقدس قافلہ کی تعداد سات سو تریسٹھ تک پہنچ گئی۔ قیام کلکتہ کے دوران بھی حضرت امام صاحبؒ نے ایک مجلس میں اپنے علم و فضل کے جوہر دکھائے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کلکتہ میں سلطان ٹیپو شہیدؒ کے خاندان کے کچھ افراد رہتے تھے ان میں سے بعض شہزادوں کے عقائد مولوی عبدالرحیم فلسفی کی صحبت کے پیش نظر خراب ہو گئے تھے۔ یہ شہزادے غالباً سلطان ٹیپو شہید کے پوتے تھے اور مولوی عبدالرحیم گورکھپور کے باشندے تھے جن کے والد کا نام مصاحب علی تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے تلامذہ میں سے تھے لیکن بعد میں منطق اور فلسفہ میں توغل کے سبب "دہری" مشہور ہو گئے، سلطان شہید مرحوم کے پوتوں نے محمد قاسم خواجہ سرا کو بھیج کر حضرت سید احمد صاحبؒ کو اپنے ہاں مدعو کیا سید صاحبؒ چند رفقاء کی معیت میں تشریف لے گئے مجلس میں چند مسائل پر گفتگو شروع ہوئی شہزادوں کی طرف سے مولوی عبدالرحیم اور حضرت سید صاحب کی طرف سے حضرت امام صاحبؒ بات میں حصہ لے رہے تھے مولوی صاحب کو چونکہ اپنے منطقی و فلسفی ہونے پر بڑا ناز تھا اس لیے انہوں نے منطق و فلسفہ کی زبان میں بات کی لیکن اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ آج کس حکیم الامت اور مفکر اسلام سے اس کا واسطہ تھا، حضرت امام صاحبؒ نے اس کی تمام باتوں کا اس قدر احسن پیرایۂ بیان میں جواب دیا کہ منطقی و فلسفی صاحب کا ناطقہ بند ہو گیا اور ہر طرف سے آپ کے حق میں تحسین و آفرین کی صداؤں کا غلغلہ بلند ہوا۔ بڑے شہزادے کو بھی اپنے علم پر بڑا غرور تھا اس نے بھی مختلف اسالیب بیان سے تقریر کی اس کا جواب دینے

کے لیے بھی آپ بڑے بے قرار تھے مگر شہزادہ کا جواب حضرت سید صاحبؒ نے اپنے ذمہ لے لیا اور چند ہی لمحوں میں اس کے پندارِ علم کو خاک میں ملا دیا۔ ان دونوں بزرگوں کی ان دل نشین اور ایمان افروز تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے غلط خیالات سے تائب ہو گئے حتیٰ کہ وہ سید صاحبؒ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے اور پھر انہوں نے اہلِ قافلہ کی دعوت بھی کی۔

ذکر کیا جا رہا تھا کہ کلکتہ تک پہنچتے پہنچتے قافلہ کی تعداد سات سو ترپن ہو گئی قافلہ کو دس جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا اور دس جہازوں کا انتظام کر لیا گیا ہر جماعت ایک ایک جہاز پر دیگر مسافروں کے ساتھ سوار ہوئی ہر جماعت کے لیے ایک ایک امیرِ سفر بھی متعین کیا گیا تھا ایک سو پچھتر افراد پر مشتمل ایک جماعت حضرت امام صاحبؒ کے زیرِ امارت تھی اور آپ کے حصہ میں جو جہاز آیا اس کا نام "فیضِ ربانی" تھا۔ امیر شاہ خاں صاحبؒ نے اس سفر میں آپ کے رفقاءؒ و احباب سے مزاح اور خوش طبعی سے پیش آنے کا ایک واقعہ بروایت مولانا عبدالقیوم صاحبؒ نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا وجیہ الدین صاحبؒ بھی مولانا شہیدؒ کے ساتھ جہاز میں تھے اور دونوں مل کر حجاج کے لیے آٹا پیسا کرتے تھے آٹا پیستے ہوئے مولانا شہیدؒ ان کو چھیڑا کرتے تھے کبھی آٹا ان کے منہ پر مل دیتے تھے کبھی پیٹھ پر، کبھی کوئی اور مذاق کرتے تھے ان کے علاوہ مولاناؒ اور ساتھیوں سے بھی ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے میں (یعنی مولانا عبدالقیوم صاحب) اس زمانہ میں بچہ تھا اور مولانا کو مجھ سے بہت محبت تھی اس لیے مولانا اکثر مجھے اپنے پاس رکھتے تھے اور جہاز میں بھی مجھے اپنے ہی ساتھ رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں بادی جہاز تھے اور مسافروں کو روزانہ فی کس ایک بوتل پانی ملا کرتا تھا۔ اتفاق سے ہوا ناموافق ہو گئی اور جہاز میں پانی کم رہ گیا اس لیے جہاز والوں نے اعلان کر دیا کہ کل سے پانی آدھی بوتل ملے گا۔ دو دن تک آدھی بوتل پانی دیا اس کے بعد جب پانی بالکل ختم ہو گیا تو جہاز والوں نے کہہ دیا کہ اب پانی بالکل نہیں رہا ہے اس لیے ہم پانی نہیں دے سکتے سب لوگ نہایت پریشان ہوئے۔

اس جہاز میں علاوہ سید صاحبؒ کے قافلہ والوں کے اور بھی بڑے بڑے لوگ سوار تھے اب ان لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ یہ شخص (مولانا شہیدؒ) لوگوں سے ہنسی مذاق کرتا ہے

اسی کی شامت سے ہم پر یہ بلا آئی ہے لہٰذا اس کو روکنا چاہیے اور دعائیں کرنی چاہئیں اس کی اطلاع مولوی وجیہہ الدین صاحبؒ اور دوسرے لوگوں کو ہوئی۔ مولوی وجیہہ الدینؒ مع چند دیگر اشخاص کے ان لوگوں کے پاس پہنچے اور ان کو مولانا شہیدؒ کی عظمتِ شان سے آگاہ کیا اور کہا کہ یہ شامت تمہاری اس گستاخی اور بدگمانی کی ہے کہ تم ان کی نسبت ایسا خیال کرتے ہو تم کو چاہیے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے معافی چاہو اور ان سے دعا کی درخواست کرو چنانچہ وہ سب لوگ آئے اور سب نے مولانا سے دعا کی درخواست کی۔

مولانا نے فرمایا کہ سب دعا کرو میں بھی دعا کروں گا مگر میری دعا تو مٹھائی کے بغیر چپکتی نہیں اس پر ایک شخص نے وعدہ کیا کہ سب جہاز کے لوگوں کو مسقطی حلوا کھلاؤں گا اس کی مقدار مجھے یاد نہیں رہی مگر اتنا یاد ہے کہ فی کس پاؤ بھر سے زیادہ تھا اس پر آپ نے دوسرے لوگوں سے مل کر دعا کی جس کا اثر اسی وقت ظاہر ہوا اور ایک چشمہ شیریں پانی کا جو لمبائی چوڑائی میں دو بڑی چادر پائیوں کے برابر ہوگا دوڑتا ہوا آیا اور جہاز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا مولانا نے اس کو دیکھ کر فرمایا اس پانی کو تو دیکھو کیسا ہے؟ لوگوں نے جو چکھا تو نہایت ٹھنڈا اور شیریں تھا اس پر سب لوگوں نے اپنے اپنے برتن بھر لیے اور جہاز والوں نے بھی اپنے ظروف خوب بھر لیے جب سب بھر چکے تو وہ پانی غائب ہو گیا۔

اس کے بعد لوگوں نے ہوا کی موافقت کے لیے دعا کی درخواست کی پھر آپ نے وہی فرمایا کہ سب دعا کرو میں بھی شریک ہو جاؤں گا مگر میری دعا مٹھائی کے بغیر نہیں چپکتی اس پر کسی اور امیر نے کچھ وعدہ کیا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ اس پر آپ نے سب لوگوں کے ساتھ مل کر موافقت ہوا کی دعا کی اور ہوا موافق ہو گئی۔ جہاز کا لنگر کھول دیا گیا اور جتنے دنوں میں اچھی ہوا کی حالت میں جہاز جدہ پہنچتا تھا اس سے بھی نصف دنوں میں ہمارا جہاز جدہ پہنچ گیا۔[۱]

نفوسِ قدسیہ پر مشتمل اللہ والوں کا یہ قافلہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عموماً ہر آفت و بلا سے محفوظ رہتے ہوئے، بنارس میں ایک ماہ، کلکتہ میں تین ماہ، مغا میں ایک ماہ، کسی جگہ پندرہ دن، کسی جگہ دو چار دن اور کہیں صرف ایک رات قیام کرنے کے بعد شعبان ۱۲۳۷ھ (مئی ۱۸۲۲ء) کو کل دس مہینے سفر میں صرف کرنے کے بعد حرم پاک میں پہنچ گیا۔ اس سفر میں چند رفقاء مثلاً عنایت علی عظیم آبادی، عبدالغفار خان بخاری، سید صاحب کی اناجن بوا فوت ہو گئے اور حضرت امام

صاحبؒ کی والدہ ماجدہ بھی مکہ معظمہ میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ آپ کی وفات کا قصّہ حسب ذیل ہے۔

والدہ ماجدہ کا سفرِ آخرت

اس مبارک سفر میں حضرت امام صاحبؒ کے ہمراہ آپ کی والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ مکرمہ بھی تھیں والدہ محترمہ مکہ معظمہ پہنچ کر سخت بیمار پڑ گئیں اور ابھی تک آپ نے حضرت سید صاحب کے دستِ مبارک پر بیعت نہیں کی تھی بلکہ آپ بیعت سے سخت انکار کرتے ہوئے فرماتی تھیں کہ سید صاحب نے تو ہمارے گھر میں بیعت کی ہے اب ہم اُلٹی ان کے ہاتھ پر کیسی بیعت کریں؟ لیکن حضرت امام صاحبؒ کی دلی آرزو تھی کہ والدہ صاحبہؒ، سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کرلیں لیکن سعی بسیار اور بے پناہ اصرار کے باعث آپ انکار ہی کرتی رہیں۔ جب امام صاحبؒ کے اصرار پر آپ کا انکار غالب آ تا رہا تو انہیں ایک تدبیر سُوجھی کہ کیوں نہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے چنانچہ آپ نے نہایت الحاح وزاری سے دعا کی۔

اے اللہ! میری والدہ محترمہ کا شاید آخری وقت ہے نامعلوم کب ان کی رُوح آپ کے پاس پہنچ جائے لہذا انہیں سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی توفیق عنایت فرما دو۔

یہ تدبیر کامیاب ثابت ہوئی اور تیرِ دعا نشانۂ مُراد کو پہنچ گیا۔ چنانچہ ایک رات والدہ صاحبہ نے خواب دیکھا کہ میدانِ حشر کا نقشہ ہے، سر پر آفتاب آگ برسا رہا ہے، گرمی کی شدّت سے لوگوں کا بُرا حال ہو رہا ہے تاحدِّ نگاہ کوئی شجر سایہ دار نہیں کہ ستا لیا جائے اور نہ پانی ہے کہ پیاس کی شدت سے کانٹا بنے ہوئے حلق میں دو قطرے ڈال لیئے جائیں آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح سایہ و پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر حیران و سرگردان ہو کر دوڑنے لگیں اچانک دُور ایک جگہ گھنا سایہ نظر آیا جہاں ایک خلقِ کثیر شاداں و فرحاں جلوہ افروز ہے آپ نے کسی سے پُوچھا یہ کون سعادت مند ہیں جو اس خزاں کے عالم میں بھی بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ حضرت سید احمدؒ اور اُن کے مُریدانِ باصفا کا مقدس گروہ ہے۔

گفت ایں جملہ گروہِ احمدی است	سایۂ شاں ظلّ فیضِ سرمدی است
تو از ایشاں شو کہ تا ذی شاں شوی	دور کن افکار تا از ایشاں شوی

خواب دیکھنے کے بعد پریشانی کے عالم میں آپ بیدار ہو گئیں۔ امام صاحبؒ کو بُلا کر خواب سنایا اور فرمایا کہ فوراً سید صاحبؒ کو بُلا لاؤ تاکہ میں بھی بیعت کر لوں۔ چنانچہ آپ تشریف لائے تو مخدومہ محترمہ نے بیعت کر لی اس واقعہ کے سات روز بعد پیامِ اجل آ پہنچا اور آپ اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئیں۔ جنت المعلیٰ میں آپ محوِ استراحت ہیں غَفَرَ اللہُ لَھَا

مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسریؒ نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> نواب وزیر الدولہ مرحوم اور صاحبِ "مخزن" بالاتفاق لکھتے ہیں کہ مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی والدہ شریفہ بھی اس سفر میں اپنے بیٹے کے ساتھ تھیں۔ ادائے حج کے بعد سخت بیمار پڑ گئیں اس وقت مخدومہ سید صاحبؒ کی بیعت سے مشرف نہ ہوئی تھیں بلکہ آپ کی بیعت کرنے سے آپ کو سخت انکار تھا اور اپنی خام خیالی کے سبب کہا کرتی تھیں کہ سید صاحبؒ نے ہمارے گھر میں بیعت کی ہے اب ہم اُلٹی ان کے ہاتھ پر کیسی بیعت کریں حالانکہ ان کے شوہر مولوی عبدالغنی صاحبؒ اور ان کے لائق بیٹے مولوی محمد اسمٰعیل صاحبؒ بلکہ اس خاندان کے کل مرد و عورت سید صاحبؒ کی بیعت سے مشرف ہو چکے تھے[۹]

تعجب ہے کہ ان بزرگوں نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کو حضرت سید صاحبؒ کے بیعت کنندگان میں کیسے شامل کر لیا جب کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی وفات ۱۶ رجب ۱۲۰۳ھ کو ہوئی اور حضرت سید صاحبؒ نے اس وقت عمر شریف کی ابھی تک صرف دو تین بہاریں دیکھی تھیں کیونکہ آپ کی ولادت باسعادت ۶ صفر ۱۲۰۱ھ میں ہوئی لہذا حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی بیعت کرنے کے کیا معنی؟ قبل ازیں بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ فافہم

ادائے حج

۸ ذوالحجہ کو سُنّت کے مطابق حج کے لیے روانہ ہوئے تمام مشاعر پر طویل دعائیں کیں۔ عقبہ کے مقام پر تمام رفقائے نے از سرِ نو تبرکاً سید صاحب

سے بیعت کی تجدید کی۔ سب سے لمبی دُعائیں عرفہ کے دن جبل رحمت کے دامن میں کی گئیں اس مبارک دن اور مقام کے تقدس کے پیشِ نظر پھر بیعت کی گئی۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ نے حرم پاک میں مشکوٰۃ اور حضرت امام صاحبؒ نے اپنے جدِامجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت، فقہ، تصوّف، فلسفہ اور سیاست سے اہلِ عرب کو متعارف کرانے کے لیئے ان کی تصنیف لطیف "حجۃ اللہ البالغہ" کا درس دینا شروع فرما دیا۔ سید صاحبؒ کے وہ ملفوظات جو حضرت امام صاحبؒ نے مولانا عبدالحی صاحبؒ کے اشتراک سے "صراطِ مستقیم" کے نام سے ترتیب دیئے ہیں مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اسی اثناء میں ان کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تاکہ اہلِ عرب سید صاحبؒ کے علوم و معارف سے بھی استفادہ کر سکیں بعض رفقاء نے بھی اس عربی ترجمہ کی نقلیں لے لی تھیں۔

مُراجعتِ وطن

محرّم کے آخر میں اہلِ قافلہ مکّہ معظمہ سے سوئے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور دس گیارہ دن کے بعد مدینہ طیبّہ میں پہنچ گئے اور وہاں ایک مہینہ گزار کر ۹ ربیع الاوّل ۱۲۳۸ھ کو واپس مکہ معظمہ آ گئے۔ رمضان المبارک حرم ہی میں گزارا اور ۱۵ شوال (۲۵ جون ۱۸۲۳ء) کو مکّہ معظمہ سے سوئے وطن روانہ ہوئے اور ۲۰ ذوالحجہ (۱۹ اگست ۱۸۲۳ء) کو بمبئی اور ۶ صفر ۱۲۳۹ھ (۱۲ اکتوبر ۱۸۲۳ء) کو کلکتہ پہنچ گئے۔

قصیدہ

اللہ والوں کا یہ مقدّس قافلہ جب بخیر و عافیت وطن پہنچ گیا تو سید ابوالحسن نے حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں ایک لمبا قصیدہ پیش کیا اس کے اکثر اشعار "حیاتِ سید احمد شہیدؒ" مصنّفہ مولانا محمد جعفر تھانیسری میں موجود ہیں مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے بھی "سید احمد شہیدؒ" میں اس قصیدہ سے منتخب اشعار درج فرمائے ہیں۔ شائقین وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں ذیل میں صرف دو شعر نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جن میں حضرت امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کا تذکرہ ہے ؎

رکنِ دین مولوی عبدالحی و شہ اسمٰعیل — فیض سے تیرے ہوئے کاملوں کے سر دفتر
تیری صحبت نے ملائک کی کری خاصیت — گو کہ ظاہر میں نظر آتے ہیں ہم شکلِ بشر

باب پنجم

جہاد

ابتدائے آفرینش سے حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی چلی آرہی ہے۔ ضربِ کلیم سے فرعونی لشکروں، تیشۂ ابراہیم سے نمرودی بُت کدوں اور چراغِ مصطفوی سے شرارِ بُولہبی کی ستیزہ کاری ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت سے یُوں نقاب کشائی کی ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

اور ایسی بے شمار حقیقتیں ہیں جو جریدۂ عالم پر ثبت ہیں اور حق کی طرف سے باطل کی اس یُورش اور طوفانِ بدتمیزی کو روکنے کے لیے جدوجہد کو جہاد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
جنگ ایک بُرا فعل ہے۔ کوئی شریف آدمی اس کی حمایت نہیں کر سکتا، نونہالوں کے

اپنے آباء کے سایۂ شفقت سے محروم ہو جانے، سہاگنوں کے سہاگ لُٹ جانے، رعنا جوانوں کے اپاہج ہو جانے اور میدانوں میں خون کی ندیاں رواں دواں ہونے کو کون مستحسن نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے؟ کون ہے جو سروں کی فصل کٹتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو؟ کسے خون کے چھوٹتے ہوئے فواروں کے منظر حسین نظر آ سکتے ہیں؟ ہاں وہ کون ظالم ہے جسے زخمیوں کی ٹیسیں، آہیں اور درد انگیز نالے جانفزا معلوم ہوتے ہیں؟ کوئی نہیں صرف انتہائی بدبخت اور سنگدل لوگ ہی اپنے جیسے انسانوں کو آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنے ہوئے دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں، لیکن ٹھہریئے کبھی یہ جنگ، ہاں جنگ ایک مقدس فرض کا روپ بھی دھار لیتی ہے جب خدا کو معبود ماننا چھوڑ دیا جائے اور سینکڑوں طاغوتوں کو معبود تسلیم کیا جانے لگے، جب شرک و بدعت کی گرم بازاری ہو، جب لوگ رحمٰن سے سرکشی کر کے شیطان کے پیرو بن جائیں، جب حدودِ الٰہی کو معطل قرار دیا جائے، جب خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرا لیا جائے، جب مردوں پر بجلیاں گرائی جائیں اور عورتوں پر ظلم و استبداد کے پہاڑ توڑے جائیں تو جنگ فرض ہے، ایک مقدس فرض اور اس مقدس فرض کی ادائیگی کو اصطلاحِ شریعت میں جہاد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جہاد کے معنی

لفظ "جہاد" جاہد یجاہد باب مفاعلہ کا مصدر ہے جس کے لغوی معنی محنت مشقت، تعب اور کسی کام کے لیے سخت تکلیف برداشت کر لینے پر ہمہ تن آمادگی کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں یہ لفظ خاص اور عام دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے عام تو یہ کہ نفس کو ہر اس کام کے کرنے پر آمادہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ سے قرب اور اس کے منع کردہ امور سے بُعد کا ذریعہ بنے حدیث میں ہے "المجاهد من جاهد نفسه"۔ (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے) اور خاص یہ ہے کہ دشمن کے حملہ کی روک تھام کے لیے اپنی پوری وسعت و طاقت کے ساتھ ظاہری و باطنی طور پر بے دریغ سعی کرنا۔

یاد رہے کفار کے ساتھ اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد ایک بہت بڑا عمل ہے کیوں نہ ہو جب کہ ایک مجاہد اپنے مال و دولت کی پرواہ نہیں کرتا، بیوی بچوں سے منہ موڑ لیتا ہے اور اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے یا اپنے بھائی بندوں کی حفاظت کے لیے اپنا خون گرانے اور

اپنی جان ایسی قیمتی و عزیز ترین متاع کے قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا بلکہ صد انبساط و انشراحِ قلب و صدر کے ساتھ کہتا ہے ؎

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اپنے ان جانباز بندوں پر فیاضیوں کی انتہا ہو جاتی ہے اور وہ معاوضہ میں انہیں نعیم ابدی کی کامرانیاں عطا فرما دیتا ہے۔ ارشاد ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ہ

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں ، اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لیئے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات ، انجیل ، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟ پس مسلمانو! اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا ، خوشیاں مناؤ ، اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروز مندی ہے

اور یہی وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کے متعلق فرمایا :-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہترین کام ہے اگر تم جانو۔

جہاد کی عظمت و سربلندی اس انداز سے بیان فرمائی۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو ان لوگوں کے کام کے برابر ٹھہرایا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں لڑے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے اللہ کے نزدیک ان کا درجہ زیادہ بڑا ہے اور وہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کامیاب ہیں۔

جہاد کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے تعریف اس طرح فرمائی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝

اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح سے صف باندھے ہوئے جم کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

اور بھی بہت سی آیات میں جہاد اور مجاہدین کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:۔

انتدب اللّٰہ لمن خرج فی سبیلہ لا یخرجہ الا ایمان بی و

اللہ کے ساتھ ایمان رکھنے والے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کرنے والے مجاہد کو

تصدیق برسلی اَن ارجعه بما نال من اَجر او غنیمة او ادخله الجنّة ۵

۔ اللہ تعالیٰ نے اجر و غنیمت کے ساتھ گھر واپس لوٹانے یا جنّت میں داخل کرنے کی ضمانت دی ہے ۔

(۲) لا یکلم اَحد فی سبیل اللہِ وَاللّٰہُ اعلم بِمَنْ یکلم فِی سبیل اللہ الاجاء یوم القیامة و جرحه یثعب دمًا اللون لون الدم والرّیح ریح المسك ۶

جیسے اللہ کے راستہ میں کوئی زخم لگے اور یہ اللہ کو ہی علم ہے کہ اس کے راستہ میں کیسے زخم پہنچتا ہے روزِ قیامت اس کے زخم سے خون کا فوارہ جاری ہوگا جس کی رنگت اگرچہ خون جیسی ہوگی لیکن خوشبو کستوری کی سی ہوگی

(۳) وَالّذِی نفسی بیدہ لولا اَن رجالًا مِن المؤمِنِینَ لا تطیب انفسهم ان یتخلفوا عنّی ولا اجد ما احملهم عَلَیْهِ ما تخلفت عَنْ سریة تغزو فی سَبِیْلِ اللہِ وَالّذِی نفسی بیدہٖ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہِ ثُمَّ احیی ثم اقتل ثُمَّ احیی ثُمَّ اقتل ثُمَّ احیی ثُمَّ اقتل ۷

بخدا! اگر مسلمانوں کے مشقت میں پڑ جانے کا خیال دامن گیر نہ ہو کہ وہ مجھ سے پیچھے رہنا گوارا نہ کریں گے تو میں کسی سریہ سے پیچھے نہ رہوں ۔ مقدور میں نہیں کہ ان سب کے لیے سواریوں کا انتظام کرسکوں ۔ اس ذاتِ اقدس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا شہید ہوجاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر شہید ہوجاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر شہید ہوجاؤں ۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہوجاؤں ۔

غور فرمائیے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کس قدر بے تابی کے ساتھ راہِ خدا میں تن من دھن قربان کردینے کی تمنا کا اظہار فرما رہے ہیں لقد کان لکم فِی رسُوْلِ اللہ اسوۃ حسنة ۔

جیسے جہاد میں حصّہ لینے پر بے پایاں اجر و ثواب ملتا ہے ایسے ہی اگر کوئی فریضۂ جہاد کے وجوب کے وقت تکلیف، مشقت، اہل و عیال کی مفارقت یا موت کے خوف وغیرہ کے سبب جہاد میں شرکت نہ کرے تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے ۔ ارشادِ خداوندی ہے :-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

لڑائی کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے لیکن بہت ممکن ہے ایک بات کو تم ناگوار سمجھتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ایک بات تمہیں اچھی لگتی ہو اور اس میں تمہارے لیے بُرائی ہو اللہ جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

ایک دُوسرے انداز میں ارشاد فرمایا :-

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے، اس کے رسُول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے آئے اور اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں پر (کامیابی وسعادت کی راہ نہیں کھولتا۔

اس سے معلوم ہُوا کہ دنیا کے مال ومنال، شان وشکوہ کے قصرِ زرنگار اور دیگر سامانِ آرائش وزیبائش میں گم ہوکر فریضۂ جہاد کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف اور موجب فسق ہے۔

پس اے جوانو! اپنے دلوں میں جذبۂ جہاد موجزن کرو۔ ایثار اور قربانی ہی دینِ اسلام کی رُوح ہے جو انسان اپنے دوسرے بھائیوں کو مسرت، راحت اطمینان اور سکون مہیا کرنے

کے لیے قربانی کا خوگر نہیں وہ انجام کار اس سے خود محروم کر دیا جاتا ہے۔

بات ذرا طول پکڑ گئی ہم ان صفحات میں امیرِ جیوش، مقدم عساکر، حامی حوزۂ اسلام اور دشمنانِ دین کے حق میں خدا تعالیٰ کی شمشیرِ بے نیام حضرت امام محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے جانثار رفقاءِ کرام کے جہاد کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت امام صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ کا اگرچہ سفرِ حج پہ روانہ ہونے سے قبل ہی جہاد کا مصمم ارادہ تھا مگر انہوں نے جہاد سے قبل فریضۂ حج کے ادا کرنے کو ضروری سمجھا کیونکہ مسلمانانِ ہند اس وقت اس فریضہ کو بھی ترک کر چکے تھے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے اس لیے حج سے واپسی کے بعد سیدین شہیدینؒ ہمہ تن جہاد کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے:۔

> "بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اترے، ان لوگوں کی کثرت بھی جو ان کا وعظ سننے آئے یا مرید ہونا چاہتے تھے، ان کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لیے مجبور نہ کر سکی وہ جہاں کہیں بھی گئے اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی کہ مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی بایں ہمہ وہ ان پُرامن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے رہے معلوم ہوتا ہے اب ان کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دور دراز جنگ جو آبادی پہ لگی رہتی تھی[۱]"

ہنٹر نے مزید لکھا ہے:۔

> "پہلے جو چیز خواب و خیال تھی اب ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریزوں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا[۱]"

حضرت امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ نے کچھ دنوں کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کی وجہ سے دہلی میں قیام فرمایا اور اس کے بعد انہوں نے ہجرت اور ترغیبِ جہاد کے لیے دورے شروع کر دیئے اور اطراف و اکنافِ ہندوستان تک اس مقصد کے لیے پہنچے جہاد کے لیے ان دعوتی و تنظیمی دوروں کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۷ شوال ۱۲۳۹ھ کو حضرت

شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات ہوتی ہے اور حضرت امام صاحبؒ "تقویۃ الایمان" کے سلسلہ میں سید عبداللہ بغدادیؒ کے اعتراضات کا ایک مکتوب کی شکل میں جواب ۱۲۴۰ھ میں کانپور سے دیتے ہیں اس مکتوب کا ذکر آئندہ آئے گا غرضیکہ آپ کے ان دوروں کا خاطر خواہ اثر ہوا جہاں تک آپ پہنچے جہاد کی روح پھونکتے گئے اور لوگوں کو ایک ولولۂ تازہ دیتے گئے حتیٰ کہ صوفی و درویش اب سپاہی بن گئے اور ہاتھ میں تسبیح کی بجائے شمشیر بکف نظر آنے لگے اور اس طرح طاغوتی طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کا وہ خواب جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دیکھا تھا ان کے قابلِ فخر اور بے نظیر پوتے اور ان کے جانباز رفقاء نے میدانِ کارزار میں قدم رنجہ ہو کر شرمندۂ تعبیر کر دیا۔

مسلمانوں کی حالت

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی ولادت سے قبل ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ قریباً گل ہو چکا تھا سلطنتِ مغلیہ کے کھنڈرات پر جن مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں استوار کی تھیں وہ بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھیں سیاسی انحطاط کے علاوہ دینی، اخلاقی، سماجی اور تمدنی ہر اعتبار سے ہی مسلمان زوال پذیر تھے اُمراء و رؤسا صرف شاہد و شراب کے ہو کر رہ گئے تھے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں تو نوبت بایں جا رسید کہ اس کے دربار میں تین تین سو طوائف برہنہ رقص کرتیں جب وہ تھک کر چور ہو جاتیں تو ان کی جگہ تین سو تازہ دم آ جاتیں۔ ان کے علاوہ حرم شاہی میں سینکڑوں کی تعداد میں عورتیں تھیں جو بادشاہ کی بیگمات کہلاتیں۔ بادشاہ جب چاہتا اور جس سے چاہتا لطف اندوز ہوتا وہ حدود و قیود سے بالکل آزاد تھا اور اسی طرح دربار میں شراب کا دور جاری رہتا دیگر امراء و رؤسا کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی بلکہ رئیس کے محل میں شراب کی بھٹیاں موجود تھیں۔ عوام کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنے دور کے متعلق فرمایا تھا کہ اگر کوئی مشرکینِ عرب کے عقائد، ان کے اعمال اور ان کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو وہ اس زمانہ کے عوام اور جہلاء کو دیکھ لے تو اس سے اندازہ لگائیے کہ حضرت امام صاحبؒ کے زمانہ کے لوگوں کی کیا کیفیت ہوگی ؟ غرضیکہ اس دور میں وہ تمام معاشرتی زوال و تخریبات رونما

ہوئیں جو اس حالت کا لازمہ ہوتے ہیں، تمام اخلاقی اقدار پاؤں تلے کچل دیئے گئے ذاتی عیش و عشرت اور مقامی اعزاز کی خاطر عظیم قومی مصالح ٹھکرا دیئے جاتے مستقبل تاریک اور بُرے شگونوں میں آلودہ نظر آتا تھا اور اس لیے ہر شخص اس فکر میں رہتا تھا کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لے۔ ایک اوسط درجہ کے شریف آدمی کی زندگی کے لیے تعیش، مے نوشی اور رقص و سرود کی محفلیں لازمی جزو بن گئی تھیں اور ان سے ادنیٰ تر طبقوں میں بھی ان سے نسبتاً پست تر پیمانے پر ان کی تقلید کی جاتی تھی اس زمانہ کی ادبیات بھی جن کی کثیر مثالیں ہمارے سامنے ہیں کاہلی اور عیاشی کے مروجہ عواطف و میلانات مہیا کرتی تھیں۔ ہاں یہ یاس انگیز تصویر ذرا مدھم پڑ جاتی تھی تو اس حقیقت سے کہ اگلے زمانے کے کچھ لطیف جذبات جیسے جرأت و دلیری، وفاشعاری اور شعورِ عزت و آبرو اب بھی لوگوں میں موجود تھے اگرچہ ان کا نشوونما غلط طریقوں پر ہوتا تھا چنانچہ دلیری معمولی معمولی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں پر، وفاداری چھوٹے چھوٹے مقامی معاملوں پر، استقلال و استقامت فرسودہ اور تباہ کن رسم و رواج سے چمٹے رہنے پر، سیر چشمی اسراف پر اور علم و دانش قدیم ذخیروں میں جدید معلومات کا اضافہ کرنے کی بجائے پرانے پرانے متنوں کی طویل الذیل شرحیں لکھنے پر صرف کی جاتی تھیں۔[۱۲]

حالات کے ان تند و تیز طوفانوں اور برائیوں و بے حیائیوں کی ان آندھیوں میں گھرے ہوئے معاشرہ میں پل کر حضرت امام صاحبؒ جوان ہوئے بقول مولانا غلام رسول مہر مرحوم اس وقت عمل کے تین راستے ہو سکتے تھے:۔

۱۔ "حق کو چھوڑ کر باطل سے رشتہ جوڑ لیا جائے۔

۲۔ حق کو نہ چھوڑا جائے اور اس سلسلہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں انہیں صبر و استقامت سے برداشت کر لیا جائے۔

۳۔ باطل کا مقابلہ مردانہ وار کر کے ایسی صورتِ حال پیدا کرنے کی سعی کی جائے کہ حق کے لیے غلبۂ عام کی فضا آراستہ ہو جائے۔[۱۳]"

حضرت امام صاحبؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت سید صاحبؒ کی معیت میں آخری راستہ

کو منتخب فرمایا یہ حسن انتخاب ہی انہیں زیب دیتا تھا اور یہی ان کے وعظ و ارشاد کا محور اور ان کی دعوت و تبلیغ کا نصب العین تھا اور اسی کے لیے جانثاروں اور سرفروشوں کا یہ مقدس گروہ سر پر کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں اترا تھا۔

اعتراضات

جب مجاہدینِ اسلام نے اپنے لیے جہاد کا راستہ منتخب فرمالیا تو کچھ لوگوں نے اعتراضات کیے جن کی کیفیت یہ تھی ۔

۱۔ حضرت سید صاحبؒ اور اُن کے رفقاء پر ذاتی حملے ۔

۲۔ مجاہدین کے پاس اس وقت سامانِ جنگ کی قلت ہے۔

۳۔ بعض لوگ بیعت کرنے کے بعد منحرف ہوگئے جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی استقامت بھی مشکوک ہوگئی ۔

حضرت امام صاحبؒ کو ان اعتراضات کا جب علم ہوا تو آپ نے ایک مکتوب میں تفصیل کے ساتھ ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ ان کا جواب بھی اگرچہ جہاد کے مترادف ہے لیکن ہمیں اس وقت تحریر و تقریر کے لیے فرصت کہاں میسر؟ جیسے نماز کی تعلیم دینا ازبس ضروری ہے لیکن جو انسان نماز میں مصروف ہو وہ دوسروں کو کیسے تعلیم دے سکتا ہے اس تمہید کے بعد آپ نے پہلے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ سید صاحبؒ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ بالکل لغو اور حقیقت سے بعید ہیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے اسی طرح جو اعتراضات آپ کے رفقاء کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر بھی صحیح نہیں ہیں اگر بالفرضِ محال انہیں درست تسلیم کر لیا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ مرتبۂ ولایت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور ولایت، امامت کی شرائط میں سے نہیں ہے جیسا کہ ائمہ سلف کی تحریروں سے ثابت ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا اگرچہ ہمارے پاس ساز و سامان کی قلت ہے تاہم فراہمیٔ سامان کے لیے مقدور بھر کوششیں جاری رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ ۔ یعنی جتنی تمہیں طاقت ہو سامان تیار کر دیہ نہیں فرمایا۔ وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اَعَدُّوا لَكُمْ ۔ کہ جتنا سامان وہ تمہارے مقابلے کے لیے تیار

کریں اتنا ہی تم ان کے مقابلہ کے لیے تیار کرو۔۔۔۔۔ کوئی امام ماں کے پیٹ سے لاؤ لشکر لے کر تو نہیں آتا بلکہ جب کوئی میدانِ کارزار میں آتا ہے تو لوگ اس کے لیے حسب استطاعت سامان فراہم کرتے ہیں اور یہ مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ امام کی خدمت میں حاضر کرنے سے بخل سے کام نہ لیں کیونکہ "اعدوا لھم ما استطعتم" اور "جاھدوا باموالکم وانفسکم" کے مخاطب صرف ائمہ و روسائ تو نہیں بلکہ عامۃ المسلمین بھی ہیں آخر میں حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا سبحان اللہ! کیا اسلام کا حق یہی ہے کہ اس کے ایک بڑے ستون کو بیخ و بُن سے اکھاڑا جا رہا ہو اور ضعیف و ناتواں ہونے کے باوصف جس کا سینہ حرارتِ ایمانی سے گرم ہو اور وہ اس کی حفاظت کے لیے بے قرار ہو، ہم اسے ہی ہدفِ تنقید بنانے لگ جائیں؟ کیا یہ لوگ یہودی، عیسائی، مجوسی یا ہندو ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہیں؟ مسلمانوں کی شان تو کبھی یہ تھی کہ اگر کوئی لبطور مذاق بھی جہاد کا نام لیتا تو ان کے دل گلِ تازہ کی طرح کھل جاتے اور سنبل و ریحاں کی طرح شاداب نظر آتے تھے اگر کہیں دور دراز سے بھی ان غیور مسلمانوں کے کانوں میں جہاد کی آواز پڑتی تو وہ دشت و دریا کی پرواہ کیے بغیر معرکۂ کارزار میں دیوانہ وار پہنچتے اور اس قدر برق رفتاری کے ساتھ پہنچتے کہ معلوم ہوتا کہ یہ چل کر نہیں بلکہ شہباز کی طرح اڑ کر آئے ہیں۔ باقی رہا بیعت سے منحرف ہونے والوں کا مسئلہ تو اس پر بحث کی چنداں حاجت نہیں کیونکہ بیعت سے انحراف کا گناہ انہیں ہوگا امام صاحب کی امامت کو اس سے کیا نقصان لاحق ہو سکتا ہے؟ نوکروں چاکروں کی بے وفائی یا صوبیداروں اور دیگر عہدیداروں کی غداری سے بادشاہ کی بادشاہت تو ختم نہیں ہو جاتی؟

کس کے خلاف جہاد

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجاہدینِ اسلام کس کے خلاف برسرِ پیکار ہونا چاہتے تھے یعنی صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے جیسا کہ مدت سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے یا انگریزوں سے جہاد کرنا بھی ان کے پروگرام میں شامل تھا؟ بعض اصحاب سے سہو ہو گیا ہے، کچھ غلط فہمی کا شکار ہو گئے، بعض نے مصلحتوں کے پیشِ نظر اور کچھ نے اپنے مخفی جذبات کی تسکین کے لیے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ یہ غازیانِ اسلام صرف اور صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے انگریزوں کے خلاف جہاد ان کا مقصود

تھا چنانچہ مولانا محمد جعفر تھانیسری[۱۴۷] "مخزنِ احمدی" کے حوالہ سے سید احمد صاحبؒ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ایامِ طفولیت سے آپ کی طبیعت اور جبلت میں شوق و ذوق اعلائے کلمۃ اللہ و انطفائے نائرہ کفر و بدعت کا بھرا ہوا تھا اس واسطے ہر گھڑی اور ہر ساعت جہاد اور قتل و قتالِ کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے ان حالات کی موجودگی میں کہ انگریزی سرکار کارفرما تھی مگر اس کی مسلمان رعایا کی آزادی اور سرکارِ انگریزی سے جہاد کرنے کو مانع تھیں اس لیے آپ نے فیصلہ فرمایا کہ سکھ قوم پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکاماتِ شریعت کی حارج اور مانع تھی جہاد کیا جائے[۱۹]"

اسی طرح ایک اور مقام پر امام محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایک روز آپ کلکتہ میں وعظ فرما رہے تھے کہ اثناءِ وعظ آپ نے جہاد کا بھی ذکر فرمایا تو سامعین میں سے کسی نے پوچھا کہ سرکارِ انگریزی کے خلاف جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ امام صاحبؒ نے جواب دیا :-

"ایسی بے ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے اس وقت پنجاب کے سکھوں کا ظلم اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ ان پر جہاد کیا جائے[۲۰]"

پھر لکھتے ہیں :-

"یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ (یعنی سید احمد صاحبؒ) سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے۔ کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہو؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں، دینِ اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک اور مددگار ہو جائیں گے۔ سید صاحب نے جواب دیا

کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے۔ سکھوں سے جہاد
کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم
کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی کے ادا کرنے کے مزاحم ہوتے
ہیں اگر سکھ اب یا ہمارے غلبے کے بعد ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد
سے باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے بھی لڑنے کی ضرورت نہ رہے
گی۔ سرکارِ انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور
تعدّی نہیں کرتی اور نہ ان کو عباداتِ لازمی سے روکتی ہے ہم ان
کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویج مذہب کرتے ہیں وہ کبھی
مانع اور مزاحم نہیں ہوتی۔ بلکہ ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس
کو سزا دینے کو تیار رہے۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی
اور احیاءِ سننِ سیدالمرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اس
ملک میں کرتے ہیں پھر ہم سرکارِ انگریزی پر کس سبب سے
جہاد کریں۔[۱۸]

یہ سب افسانہ طرازیاں ہیں جن کا حقائق سے دور کا واسطہ بھی نہیں بلکہ حقیقت یہ
ہے کہ جہاد سکھوں اور انگریزوں دونوں کے خلاف تھا، چنانچہ پروگرام یہ بنایا گیا کہ پہلے
سکھوں کا خاتمہ کیا جائے اور پھر انگریزوں سے نپٹا جائے لیکن افسوس کہ سکھوں کے
ساتھ معرکہ آرائی کے دوران ہی بالاکوٹ کا حادثہ فاجعہ پیش آگیا اور انگریزوں سے ہاتھ
دو چار کرنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ ہمارے مسلمانوں سے تو انگریز مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے
ہی تحریک کے مقصد کو زیادہ درست سمجھا جیسا کہ اس کی کتاب "OUR INDIAN MUSLAMAN"
کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس میں بہت سے امور خلافِ واقعہ ہیں اور پھر
مجاہدین کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں تاہم اس تحریک
کے مقاصد کو اس نے صحیح سمجھا ہے اسی طرح ایچ، ڈبلیو، بیلیو (لاہور ۱۸۶۴ء) . . .
. . . . یوسف زئیوں پر اپنی رپورٹ میں سید احمدؒ کے بارے میں لکھتا ہے :-

"یہ شخص کوئی اور نہ تھا بلکہ میر سید احمد بریلویؒ ہی تھا، جو اِن علاقوں میں سید بادشاہ کے نام سے معروف تھا۔۔۔۔۔۔ جس کا کردار ایک مختصر عرصے تک کامیاب رہا جب کہ وہ مختلف ہمسایہ سُنی مسلم حکومتوں کے حکمرانوں اور لوگوں کو اُکسایا کرتا تھا کہ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں جو اسلامی سلطنت کے دوبارہ قیام کے لیے اور جزیرہ نمائے ہند کو کفّار انگریزوں اور سکھوں سے آزاد کرانے کے لیے بُلند کیا گیا ہے۔"

ایک اور مُصنّف سرحد پر سولھویں صدی کی روشنیہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہے :۔

"روشنیہ کا سربراہ بایزید پیر روشن اور اس کے متبعین اکبر کے حق میں وہی ہو گئے تھے جو وہابی سکھوں کے حق میں اور ہندوستانی مذہبی دیوانے برطانوی حکومت کے حق میں ہو گئے تھے۔[19]"

یہی مصنّف ایک دوسرے مقام پر یُوں رائے زنی کرتا ہے :۔

"بایں ہمہ سید احمدؒ کے نائبین نے جو نوآبادیاں چھوڑی تھیں ۔۔۔۔ وہ برطانوی حکومت کو ورثہ میں ملیں۔ پنجاب کے ساتھ ہمیں جو متروکات ملے ان میں شاید یہ سب سے زیادہ دردِ سر کا باعث تھے۔"

سکھوں کا مشہور مورخ کننگھم جو سید احمدؒ کے نسبتی بھائی اور رفیقِ خاص سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا، یہ معنی خیز فقرے لکھتا ہے۔

"چار سال کی غیر حاضری کے بعد وہ دہلی لوٹے اور مسلمانوں سے کہا کہ کافروں کے خلاف جنگ میں ان کی متابعت کریں۔ ان کے تیور سے ایسا ظاہر ہوا کہ کافروں سے ان کی مُراد صرف سکھ ہیں لیکن واقعی مراد صحیح طور پر سمجھی نہ گئی۔[20]"

ان مذکورہ اقتباسات کو دوبارہ بغور مطالعہ فرمائیے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ ہمارے مسلمانوں کی نسبت تو ان انگریز مصنفین ہی نے تحریک کے مقصد کو زیادہ صحیح سمجھا ہے اور انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تحریک کے انگریز دشمن ہونے کا ہی اظہار کیا ہے۔

سب سے پہلے شخص سر سید احمد خاں ہیں جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد انگریزوں کے نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھا ہنٹر کی مذکورہ کتاب شائع ہو کے جب بازار میں آئی تو سر سید نے اس کے الزامات و اتہامات کے جواب میں ایک سلسلہء مضامین لکھا جو کہ اخبار "پایونیر" کی متعدد اشاعتوں میں قسط وار چھپتا رہا، اس میں سر سید نے لکھا تھا کہ سید صاحبؒ اور مجاہدین صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، انگریزوں سے لڑنا ان کے پروگرام میں شامل نہ تھا[۲۲]۔

بات دراصل یہ تھی کہ انگریزی حکومت نے تحریکِ جہاد کو کچلنے کے لیے جب اپنی پوری طاقت صرف کر دی، مجاہدین پر بے شمار مظالم ڈھائے اور انہیں آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تو وہابیوں پر انگریزوں کے ان مظالم کو دیکھ کر سر سید بے حد متاثر ہوئے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اس تحریک کو اب ختم ہونا چاہیئے تاکہ یہ مظلوم بھی امن، چین اور سکون کا سانس لے سکیں اسی جذبہ کے تحت انہوں نے ہنٹر کی کتاب پر تنقید لکھی اور اپنے تئیں وہابی کہتے ہوئے دیگر تمام وہابیوں کو بھی انگریزی گورنمنٹ کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش حالانکہ وہ وہابی نہ تھے بلکہ عقائد و نظریات میں آزاد منش تھے وہ تو صرف ان رُوح فرسا مظالم کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے اور انہوں نے محض انسانی ہمدردی کے پیشِ نظر ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ ان کی انسانی شرافت تھی۔ افکار و عقائد کے اعتبار سے وہابیت سے ان کی دُوری کا اندازہ تو اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے خلاف جس قدر وہابی علماء نے لکھا شاید ہی کسی نے لکھا ہو حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی[۲۳] رح کا "اشاعۃ السنہ" ان کے غلط افکار و نظریات کی تردید میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا بلکہ فروری ۱۸۷۹ء کے بعد

تکمل طور پر رسالے کا رُخ سرسید کی طرف مڑ گیا اور اس کا اکثر و بیشتر حصّہ ردِّ نیچریت پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ بھی اُن کے خلاف کتاب و سنّت عقائد و افکار پر بھرپور تنقید فرماتے رہتے تھے۔

یہ تو سرسید مرحوم کی شرافت اور معاملہ فہمی تھی کہ وہ ان مظلوموں پر ڈھائے جانیوالے لرزہ خیز مظالم کو دیکھ کر بڑی جرأت وجسارت کے ساتھ سراپا احتجاج بن گئے اور اس سے انگریز بھی متاثر ہوئے۔

سرسید مرحوم کا خیال تھا کہ یہ مظلوم بھی صرف اس صورت میں امن، چین اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں کہ یہ بھی کئی دوسرے مسلمانوں کی طرح انگریزی حکومت کو اپنی کامل وفاداری کا یقین دلا دیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر تنقید لکھی اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد انگریزوں کے نہیں بلکہ سکھوں کے خلاف تھا اور اس سے قبل سرسید احمد خاں ۱۸۵۷ء کے بعد "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر "بڑا کارنامہ" انجام دے چکے تھے اس میں انہوں نے حاکم اور محکوم کو قریب سے قریب تر لانے کی جو کوشش کی اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے چنانچہ ۱۸۷۰ء تک اہلِ حدیث کے سوا مسلمانوں کے دیگر تمام فرقوں نے انگریزی حکومت کو اپنی مکمل وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ چنانچہ مشہور حنفی عالم مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کے متعلق ہم مولانا مسعود عالم ندویؒ کے حوالہ سے اس سے قبل ایک تعارفی نوٹ میں ذکر کر آئے ہیں کہ وہ برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے اور یہ تصدیق نامہ راج (بہار) میں ۱۲؍اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا اور اسے بعد میں خود ان کے پوتوں نے بڑے فخر سے ۱۹۱۴ء میں بھی درج کرایا تھا اور پھر اس میں ان کے صاحبزادے مولوی عبدالاوّل اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق تھی نیز مولانا جونپوری صاحب نے انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ بھی دے دیا تھا۔ دراصل انہوں نے کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی کے ایک اجلاس میں ۲۳؍نومبر ۱۸۷۰ء کو ایک لیکچر دیا تھا جس میں انہوں نے بیان کیا کہ گورنمنٹ کے خلاف جہاد ممنوع ہے اسی لیکچر کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا اور اس میں دیگر متعدد حنفی علماء کے فتاویٰ

کو بھی درج کر دیا گیا تاکہ گورنمنٹ برطانیہ پر واضح ہو جائے کہ تمام جلیل القدر حنفی علماء اس کے حق میں ہیں انگریزوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ چنانچہ ہنٹر نے بڑے فخر سے لکھا:۔

"یہ بڑا ہی مبارک واقعہ ہے کہ جس ضلع (جونپور) سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ (اکبر) کے خلاف بغاوت کا فتویٰ شائع ہوا تھا، اسی نے ایک ایسا عالم (مولوی کرامت علی) بھی پیدا کر دیا جس کا فتویٰ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔[۵]"

اس کے علاوہ ہنٹر نے اس کتاب میں جن علماء کرام کا فتویٰ درج کیا ہے وہ یہ حضرات ہیں:۔ مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا محمد علی لکھنوی، مولانا فیض اللہ لکھنوی، مولانا محمد نعیم لکھنوی، مولانا رحمت اللہ لکھنوی، مولانا قطب الدین لکھنوی، مفتی سعد اللہ لکھنوی، مولانا لطیف اللہ رامپوری، مولانا غلام علی رامپوری[۲۱]

اسی طرح شیعہ حضرات نے بھی جہاد کی مخالفت کی اور انگریزوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اس وقت کے مسلمانوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اہم فرقہ شیعہ سب کا سب انگریزوں کو اپنی کامل وفاداری کا یقین دلانے میں پیش پیش تھا اگرچہ یہ فرقہ کسی وقت بھی انگریز کے نزدیک مشکوک نہیں رہا تھا، چنانچہ اس کی طرف سے فارسی زبان میں ایک رسالہ شائع ہوا جس میں جہاد کی مخالفت اور گورنمنٹ کے ساتھ پوری وفاداری کا اعلان تھا۔ شیعہ کی طرف سے اس فتویٰ اور اعلان پر ہنٹر نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں۔

"بغاوت کے غیر ضروری ہونے پر ان کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آ گیا۔ اس دستاویز پر مستند اور قابلِ اعتماد شیعہ علماء کی مہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ اس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لیے

مجبور رہے۔ اس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاً وفادار ہیں گے۔[۱]

ہم ذکر کر رہے تھے کہ ۱۸۷۱ء تک اہلحدیث کے سوا مسلمانوں کے کئی مکاتب فکر فتاوی شائع کرکے حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلا چکے تھے اور سرسید کا خیال تھا کہ اب مجاہدین کو بھی ایسا ہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ انہی دنوں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے بڑی تند و تیز اور تلخ کتاب "OUR INDIAN MUSALMANS" (جس کا ہم پیچھے بھی ذکر کر آئے ہیں) لکھی جس نے انگریزی حکومت کے غیظ و غضب کی جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اس لیے انہوں نے مجاہدین پر مظالم میں اور زیادہ سختی کر دی اندریں صورت حال سرسید نے اس کتاب پر مؤثر تنقید لکھی لیکن برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس تنقید کا فریقین (انگریزی حکومت اور مجاہدین) پر کیا اثر ہوا اور دونوں کس قدر ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ کیا حکومت کے رویہ میں فرق آیا؟ کیا مجاہدین اپنے موقف سے دستبردار ہوئے؟ اس سے کچھ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے یا نہ ہوئے لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسید احمد خاں رح نے یہ سب کچھ اخلاص، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کیا اس تمام داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ تھے وہ حالات جن کے پیش نظر سرسید نے کوشش کی کہ جہاد کے رخ کو انگریزوں کے بجائے سکھوں کی طرف پھیر دیا جائے۔

دوسرے بزرگ مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری ہیں جنہوں نے جہاد کا رخ انگریزوں کے بجائے صرف سکھوں کی طرف بتایا ہے۔ مولانا موصوف سید صاحبؒ اور حضرت امام صاحبؒ کے ساتھ خاص عقیدت رکھتے تھے اور تحریک کے نہایت گرم کارکن تھے اسی وجہ سے آپ کو بھی بے پناہ آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ نے جان و مال کی قربانیاں پیش کرکے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دی معرکہ امبیلہ کے بعد ۱۸۶۴ء میں بغاوت اور سازش کے الزام میں آپ پر مقدمہ چلایا گیا، منقولہ و غیر منقولہ جائیداد ضبط کر لی گئی، حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی اور آپ نے عمر عزیز کی قریباً اٹھارہ بہاریں کالا پانی میں بسر کیں فرنگی ظلم و استبداد کے مقابلہ میں آپ استقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹے رہے اور بڑی سے

بڑی سزا بھی آپ کے پایۂ استقلال میں قطعاً جنبش پیدا نہ کرسکی[۲۸] مگر افسوس کہ بایں ہمہ آپ تحریک کے مقصد کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے۔

علاوہ ازیں ایک اور توجیہہ بھی کی جاسکتی ہے، جو زیادہ قرین قیاس ہے اور وہ یہ کہ مولانا تھانیسریؒ مرحوم نے "سوانح احمدی" (نئے ایڈیشن کا نام حیاتِ سید احمد شہید) کو اس وقت لکھا جب انگریز مجاہدین کی مخالفت میں جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اور تحریک جہاد انتہائی مقہور تھی حتیٰ کہ مجاہدین کو دار و رسن اور قید و بند کی ایسی ایسی لرزہ خیز صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جن کے تصور ہی سے ۔ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریز کی انتہائی کوشش تھی کہ تحریک کو مکمل طور پر کچل دیا جائے اور مجاہدین کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ ایسے نازک ترین لمحات میں مولانا تھانیسری مرحوم نے تحریک کی سرگزشت کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے منصۂ شہود پر جلوہ گر کرنے کا عزم کر لیا۔ مبادا کہ اس مقدس تحریک اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ اسلام کے سب سے زیادہ درخشاں باب کے حالات طاقِ نسیاں کی زینت ہو جائیں۔ اس وقت یہ حالات و کوائف مستند روایات کی صورت میں محفوظ تھے جن کا مولانا تھانیسریؒ اور تحریک سے وابستہ کئی دیگر بزرگوں کو عرفی تواتر کی حیثیت سے علم تھا یا غیر مطبوعہ مکاتیب و مخطوطات تھے جو عقیدت مندوں کے پاس موجود تھے۔ مولانا مرحوم ایسے دور اندیش، ہمدرد اور سراپا خلوص انسان کے لیے عجب مخمصہ کا عالم تھا اگر آپ حقائق کو من وعن، بلا کم و کاست بیان کرتے تو پھر سے قید و بند کی تنہائیاں اور زنجیر و سلاسل کی سختیاں چشم براہ تھیں مگر ان سے تو آپ قطعاً خائف نہ تھے لیکن اس بات کا زبردست امکان تھا کہ حکومت ان کی اشاعت میں رکاوٹ ڈال دے گی یا تمام مواد ضبط کر کے اپنے قبضہ میں کر لے گی اور یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے حالات کے ان تقاضوں کے پیش نظر، جہاں تک ممکن ہوا واقعات میں لچک پیدا کر کے حکومت کی دستبرد سے اسے محفوظ کرنے کی کوشش کی تاکہ جس قدر ممکن ہو اس مقدس تحریک کے کوائف ضبطِ تحریر میں آجائیں بنا بریں اس سلسلہ میں آپ سے کچھ فروگزاشتیں ہوگئیں۔ غرضیکہ اس صورتِ حال میں آپ نے "سوانح" لکھی اور فروگزاشتوں کے سلسلہ میں آپ معذور رہے۔

پیام شاہجہان پوری نے اپنی کتاب "شہادت گاہِ بالاکوٹ" میں مولانا تھانیسریؒ کے ان ہوشربا مصائب کو مقدمہ بنا کر یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ جو انسان اتنے بڑے مصائب میں ثابت قدم رہا وہ اب کیسے مصلحت کا شکار ہو سکتا تھا لہٰذا ان کا موقف صحیح ہے کہ جہاد انگریزوں کے نہیں بلکہ سکھوں ہی کے خلاف تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پیام صاحب پس منظر کے ان حالات سے بے خبر ہیں جنہیں راقم نے بیان کیا ہے۔ البتہ مجھے شبہ ہے کہ ان کی "قادیانی ذہنیت" یہاں کارفرما نہ ہو کیوں کہ مرزائی اس بات کو قطعاً برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے مربی و محسن انگریز بہادر سے کوئی برسرپیکار رہو اور یہ کیوں نہ ہو جب کہ خود مرزا صاحب[۲۹] نے اپنے آپ کو انگریز کا خود کاشتہ پودا "تسلیم کیا ہے[۳۰]۔ اور اپنے کو گورنمنٹ کی خیر خواہی اور تائید میں یگانہ، بے نظیر و بے مثیل اور انگریزی گورنمنٹ کے لیے بطور تعویذ اور پناہ (قلعہ) کے قرار دیا[۳۱] ہے اور خود اپنے اور اپنی جماعت کے لیے سلطنتِ برطانیہ کو اپنی جائے پناہ تسلیم کیا[۳۲]۔ یہ مرزا غلام احمد ہی تھا جس نے جہاد ایسے مقدس فریضہ کو انگریز کی حمایت میں اندھے ہو کر حرام اور منسوخ قرار دے دیا اور انگریز سے دشمنی رکھنے والوں کو سخت جاہل، نافہم ملّا، دشمنِ خدا، منکرِ نبی، سخت نادان حرامی، بدکار، نالائق، ظالم، چور، قزاق (ذرا "نبوت" کی زبان "فیض ترجمان" اور "کوثر و تسنیم" میں دھلی ہوئی زبان ملاحظہ فرمائیے") اور نامعلوم کن کن خطابات "سے نوازا ہے اور یہ آنجہانی مرزا ہی تھا جس نے انگریزی گورنمنٹ کی حمایت و وفاداری میں پچاس ہزار کے قریب کتابیں رسائل اور اشتہارات تالیف و طبع کرنے کا دعویٰ کیا[۳۳] اور کہا کہ یہ تحریری ذخیرہ اگر جمع کیا جائے تو اس سے پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں[۳۴]۔

جب کبھی بھی انگریزوں اور مسلمانوں میں کوئی تصادم ہوا تو امتِ مرزائیہ نے مسلمانوں کی بجائے انگریزوں کی تائید و حمایت کی اور ان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگیں بلکہ یہ تو مسلمانوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر جشن منانے میں ذرہ برابر بھی شرم و حیا محسوس نہیں کرتے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اوّل میں ترکوں کو شکست ہوئی تو اس پر قادیانی امت کا تبصرہ درج ذیل تھا۔

"حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں ...... کہ گورنمنٹ میری تلوار ہے
پھر ہم احمدیوں کو اس فتح (فتح بغداد) پر کیوں خوشی نہ ہو، عراق، عرب
ہو یا شام، ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں ...... دراصل
اس کے محرک خدا تعالیٰ کے وہ فرشتے تھے جن کو گورنمنٹ کی مدد کے
لیے خدا نے اتارا تھا"[۳۴]۔

اسی طرح ۲۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں کو جب مکمل طور پر شکست سے دوچار ہونا پڑا تو امتِ مرزائیہ نے قادیان میں جشن منایا، زبردست چراغاں کیا اور گھی کے چراغ جلائے اور اس موقع پر "الفضل" نے لکھا۔

"یہ پُر لطف اور مسرت انگیز نظارہ بہت مؤثر اور خوش نما تھا اور
اس سے احمدیہ پبلک کی اس عقیدت پر خوب روشنی پڑتی ہے، جو
اسے گورنمنٹ برطانیہ سے ہے"[۳۵]۔

مرزا جی تو انگریز بہادر کے لیے مخبری بھی کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی گویا "منصب نبوت" میں شامل تھا۔ لیکن ان تمام امور پر حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بھلا جس "نبی" نے اپنی بعثت کا مقصد ہی انگریزوں کی تائید و حمایت بتایا ہو، اس کے ان "کارہائے نمایاں" پر تعجب کیوں؟ مرزا جی آنجہانی نے لکھا ہے۔

"اس نے مجھے اپنے قدیم وعدے کے موافق ...... آسمان سے بھیجا۔
تا میں ...... حضور ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کے نیک اور بابرکت مقاصد کی
اعانت میں مشغول ہوں۔ اللہ نے مجھے بے انتہا برکتوں کے ساتھ چھوا
اور اپنا مسیح بنایا تا وہ ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کے پاک اغراض کو خود آسمان سے
مدد دے"[۳۶]۔

جب آنجہانی مرزا جی نے اپنی بعثت کا مقصد ہی انگریزوں کی تائید و حمایت بتایا اور ان کا اور امتِ مرزائیہ کا کردار ہی یہ ہے جس کی ادنیٰ سی جھلک ان مذکورہ سطور سے معلوم ہو سکتی ہے تو پیام صاحب کو، جو کہ امتِ مرزائیہ کے ایک فرد ہیں ہم مجبور سمجھتے ہیں۔ لیکن ایمان کے

کے ساتھ اگر خدا تعالیٰ نے ان سے کلی طور پر عقل بھی سلب نہیں کر لی، تو انہیں غور کرنا چاہیئے کہ انبالہ کیس میں مولانا تھانیسری کو عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ کیا یہ مقدمہ رنجیت سنگھ کی عدالت میں پیش تھا؟ مولانا مرحوم کو یہ سزا کس سنگھ نے دی؟ مولانا نے اس کیس کی تفصیلات "تواریخ عجیبہ" المعروف بہ "کالا پانی" کے نام سے لکھی ہیں جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا کیس انگریزی گورنمنٹ نے مرتب کیا تھا اور جس قدر ممکن تھا زیادہ سے زیادہ سخت انتقامی سزائیں دیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تحریک انگریزوں کے خلاف ہی نہ تھی تو پھر کیس کیا اور انتقامی سزائیں کیوں؟

سید صاحبؒ کا موقف

یہ بات اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی تو نہیں ہے جتنا اسے الجھا دیا گیا ہے سیدھی سی بات ہے ہم تحریک جہاد کے امیر حضرت سید صاحبؒ سے پوچھتے ہیں کہ حضرت آپ کا موقف کیا تھا؟ آپ صرف سکھوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے یا انگریزوں کے بھی؟ چنانچہ آپ کے ملفوظات، اعلانات اور مکتوبات کی روشنی میں آپ کا جو موقف واضح ہو کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے۔

ہر گاہ بلادِ اسلام در دستِ کفار لیام افتد بر جمیع اہل اسلام عموماً و مشاہیر حکام خصوصاً واجب و مؤکد می گردد کہ سعی و کوشش در مقابلہ و مقاتلہ آنہا بجا آرند تا وقتیکہ بلادِ مسلمین را از قبضۂ ایشاں بر آرند و الا آثم و گنہگار می شوند و عاصی و ستمگار، از درگاہِ قبول مردود می گردند و از ساحتِ قرب مطرود گلے

جب اسلامی بلاد پر کافر مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور مشاہیر حکام پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان کافروں کے خلاف اس وقت تک مقابلہ و مقاتلہ کے لیے سعی و کوشش جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد انکے قبضہ سے واپس لے لیے جائیں ورنہ مسلمان گنہگار ہونگے انکے اعمال بارگاہِ ایزدی میں مقبول نہ ہونگے اور وہ خود قرب حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔

" اگر سید صاحب کے عمل جہاد کی بنا یہی اصل تھی تو کیا عالمگیر اعظم کی وسیع سلطنت میں سے صرف وہی حصہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر غیر مسلموں کے قبضے میں گیا تھا، جو دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے درمیان تھا اور جس پر رنجیت سنگھ حکمران تھا؟ کیا باقی پورے ملک پر مسلمان بدستور فرمانروا تھے؟ اس کا جواب ہر شخص نفی میں دے گا۔ اس سے بدرجہا بڑے اور اہم تر علاقے پر بلا واسطہ یا بالواسطہ انگریز مسلط تھے اور انہوں نے سب کچھ یا تو مسلمانوں سے چھینا تھا یا ان لوگوں سے لیا

تھا جو کچھ مدت پیشتر مسلمانوں سے چھین چکے تھے یہ تمام علاقے بے شائبہ ریب "بلاد اسلام" تھے۔ پھر کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس واضح اساس عمل کے ہوتے ہوئے سمجھا گیا اور سمجھایا گیا کہ سید صاحبؒ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے۔[۳۸]

یہ اقتباس مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی شہرۂ آفاق تصنیف "سید احمد شہید" سے نقل کیا گیا ہے اسے اور اس کے ماقبل و بعد کا بغور مطالعہ فرمایئے اور پھر خدارا انصاف سے کہیئے کہ پیام شاہجہانپوری کا یہ لکھنا کہاں تک مبنی بر حق و صداقت ہے کہ :-

مولانا غلام رسول مہر راقم الحروف کے ذاتی مہربان اور اس کے لیے بے حد قابلِ احترام ہیں موصوف بھی ان اصحاب میں شامل ہیں جن کا خیال ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کا رُخِ جہاد انگریزوں کی طرف تھا بلاشبہ مولانا نے بڑی قابلیت سے اپنا موقف درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایک کمزور اور بے جان مقدمہ کو دنیا کا قابل سے قابل وکیل بھی نہیں جیت سکتا یہی صورت اس معاملے کی ہے مولانا کی قابلیت اور تبحر علمی سے انکار گناہ ہے لیکن انہوں نے جس مقدمہ کی پیروی کی ہے وہ مقدمہ ہی بے جان ہے اس لیے ان کے علم و فضل پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ وہ مشین ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں جس کا کوئی پُرزہ درست نہیں اس کی مثال وہی ہے کہ اگر سر چھپاؤ تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیر چھپاؤ تو سر کھل جاتا ہے۔ مولانا مہر نے سید صاحبؒ کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف ثابت کرنے میں اپنی تمام قابلیت صرف کر دی مگر چونکہ یہ مقدمہ ہی کمزور تھا اس لیے اس کی کمزوریاں چھپ نہ سکیں۔[۳۹]

پیام صاحب یہاں دجل و تلبیس کی انتہا کر رہے ہیں حضرت مہر مرحوم کی تعریف کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے دل میں حضرت مرحوم کا بڑا احترام ہے لیکن درحقیقت یہ ان کی تعریف نہیں بلکہ زبردست تنقیص کر رہے ہیں۔ پیام صاحب غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مولانا

مہر مرحوم کو گویا معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ یہ مقدمہ کمزور اور بے جان ہے یہ تو انہیں "الہام" ہوا ہے حالانکہ سید صاحبؒ کے مذکورہ مکتوب اور اس پر مولانا مہر مرحوم کے تبصرہ کو پڑھ لینے کے بعد ادنیٰ سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ مہر صاحبؒ ایک کمزور اور بے جان مقدمہ کی پیروی کر رہے ہیں یا ایک مضبوط اور جاندار مقدمہ ان کے پیش نظر ہے اگر یہ مقدمہ کمزور ہوتا تو حضرت مہر ایسا عالم و فاضل، جن کے علم و فضل، تبحر علمی اور قابلیت کا پیام صاحب کو بھی اعتراف ہے اس کی پیروی کیوں کرتا؟ یہ مقدمہ ـــ جس کی ایک شق اس وقت زیر بحث ہے ـــ اس قدر مضبوط اور قوی تھا کہ حضرت مہر مرحوم نے اس کا فیصلہ قریباً دو ہزار صفحات ـــ سید احمد شہید، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین ـــ میں اس قدر احسن پیرایۂ بیان میں لکھا ہے کہ دنیا عش عش کر اٹھی اور اس نے حضرت مرحوم پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیام صاحب اپنے نبی کے طرز تحریر کو اپنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ مرزا جی کا بھی یہی اسلوب تھا کہ پہلے ایک انسان کی تعریف کرو تاکہ لوگ مطمئن ہو جائیں اور پھر اپنی مطلب براری کے لیے نشتر لگاؤ۔ مزید وضاحت کے لیے یہاں ایک مثال بھی عرض کر دیتے ہیں مرزا غلام احمد قادیانی ایک مقام پر لکھتا ہے :-

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست اور فہم تمام اُمت کی مجموعی فراست اور فہم سے زیادہ ہے بلکہ اگر ہمارے بھائی جلدی سے جوش میں نہ آئیں تو میرا تو یہی مذہب ہے جس کو دلیل کے ساتھ پیش کر سکتا ہوں کہ تمام نبیوں کی فراست اور فہم آپ کی فہم و فراست کے برابر نہیں ہے

اتنی عبارت پڑھنے کے بعد ایک سادہ لوح مسلمان ششدر رہ جاتا ہے کہ وہ دجال و کذاب متبنی جس نے سرور دنیا و دیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر آرے چلائے اور آپؐ کی ردائے ختم نبوت کو چھیننے کی ناپاک جسارت کی اسے آپ کی اس فہم و فراست سے کیا سروکار؟ لیکن اس کے متصل بعد کی عبارت ذیل۔

گر پھر بھی بعض پیش گوئیوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

خود اقرار کیا ہے کہ میں نے ان کی اصل حقیقت سمجھنے میں غلطی کھائی ہے[۱۴۱] ..... الخ

جب ہم پڑھتے ہیں تو حیرانی ختم ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مرزا جی اپنی خانہ ساز نبوت کا ڈھونگ رچانے اور اپنی خرافات (بزعم خویش پیش گوئیاں، جو جھوٹی ثابت ہوئیں) پر پردہ ڈالنے کے لیے اس قسم کے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ کبھی تو کہہ دیا کہ نبی کو بھی پیشگوئی کی اصل حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور کبھی انبیاء کرام کی پیش گوئیوں کو معاذ اللہ جھوٹا ثابت کرنے کے لیے من گھڑت قصے لکھ دیئے۔ الغرض پیام صاحب بھی یہاں اپنے "نبی" کے اسی طرز نگارش کا اتباع کر رہے ہیں اور جب تک وہ قادیانیت کی منحوس عینک اتار کر نہیں دیکھیں گے انہیں کبھی نظر نہیں آسکتا کہ مہر مرحوم نے یہ مقدمہ جیتا ہے یا نہیں؟

سید صاحبؒ کے موقف کی مزید وضاحت کے لیے اُن کے مکتوب کا جز انہوں نے شاہ بُخارا کی طرف ارسال فرمایا اور جس سے کچھ سطور ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں، یہ حصہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

نصاریٰ انکو ہیدہ خصال و مشرکین بد مآل بر اکثر بلادِ ہندوستان از لب دریائے اباسین تا ساحلِ دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہ راہ باشد، تسلّط یافتند و دام تشکیک و تزویر بنا بر اخمال دینِ ربِ خبیر بر یافتند و تمامی آں اقطار بہ ظلمات ظلم و کفر مشحون گردانیدند[۱۴۲]	نصاریٰ و مشرکین ہندوستان کے اکثر بلاد پر دریائے سندھ سے ساحلِ بحر تک قابض ہو گئے ہیں اور یہ چھ ماہ کی مسافت ہے (اگر پیدل چلنا ہو) انہوں نے خدا تعالیٰ کے دین کو ختم کرنے کے لیے تشکیک و تزویر کا جال پھیلا رکھا ہے اور ان تمام علاقوں کو ظلم و کفر کی ظلمتوں سے بھر رکھا ہے۔

یہ تو تسلیم کہ مشرکین سے مراد تو سکھ اور مرہٹے وغیرہ ہو سکتے ہیں لیکن نصاریٰ سے انگریزوں کے سوا کون مراد ہو سکتا ہے؟ سید صاحب شاہِ بخارا کو مزید لکھتے ہیں۔

کفار فرنگ کہ بر سر ہندوستان تسلّط یافتند نہایت تجربہ کار و ہوشیار و حیلہ باز و مکّار اند۔ اگر بر اہلِ خراسان بیایند بہ سہولت	جو انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ بہت زیادہ تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکّار ہیں اگر اہلِ خراسان پر چڑھائی

تمام جمیع بلاد آنہارا بہ دست آرند باز حکومتِ آنہا بولایت آنجناب متصل گردد و اطراف دارالحرب بہ اطراف دارالاسلام متحد شود" [۳۴]

کر دیں تو سہولت سے ان کے ملک پر تسلط جما لیں گے پھر ان کی سلطنت کی حدیں آپ کی حکومت سے مل جائیں گی اور دارالحرب اور دارالاسلام کے اطراف متحد ہو جائیں گے۔

اس میں بھی کفار فرنگ سے مراد انگریز ہی ہیں، سکھوں اور مرہٹوں وغیرہ کو تو فرنگی نہیں کہا جاتا اور پھر سید صاحبؒ نے ان کے تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکار وغیرہ جو اوصاف بیان کیے ہیں یہ بھی سکھوں کے بجائے انگریزوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ سید صاحبؒ نے شاہ محمود دُرّانی بن تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی والئ ہرات کو بھی دعوتِ جہاد دیتے ہوئے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:۔

اقامتِ جہاد و ازالۂ بغی و فساد در ہر زمان و ہر مکان از اہم احکام حضرت رب العباد است خصوصاً دریں جزو زمان کہ وقت شورش اہل کفر و طغیان بہ حدے رسیدہ کہ تخریب شعائر دین و افساد حکومتِ سلاطین از دستِ کفرۂ متمردین و بغات بہ وقوع آمدہ و ایں فتنۂ عظیم تمام بلاد ہند و سندھ و خراسان را فرا گرفتہ پس دریں صورت تغافل در مقدمۂ استیصال کفرۂ متمردین و تساہل در باب سرزنش باغیانِ مفسدین از اکبر معاصی و اقبح آثام است۔ بناءً علیہ ایں بندۂ درگاہ حضرت الٰہ از وطن مالوفہ خود برخاستہ در دیار ہند و سندھ و خراسان دورہ سیر نمودہ و مومنین آں اقطار و مسلمین آں

جہاد قائم کرنا اور بغی و فساد کو مٹانا ہر زمانہ اور ہر مقام میں خدا تعالیٰ کا نہایت اہم حکم رہا ہے خصوصاً اس زمانے میں جب کہ کافروں اور سرکشوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر بگاڑے جا رہے ہیں اور مسلمان بادشاہوں کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ عظیم فتنہ ہند، سندھ اور خراسان کے علاقوں میں چھا گیا ہے اس صورت میں سرکش کافروں کی بیخ کنی سے غفلت اور مفسد باغیوں کی سرزنش سے تساہل بہت بڑا اور قبیح گناہ ہے اس بناء پر یہ خدا تعالیٰ کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہند و سندھ اور خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنوں اور

دیار را بہ ایں معنی ترغیب کردہ[44] مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔

اس مکتوبِ گرامی میں سید صاحبؒ ہند، سندھ اور خراسان میں غیر مسلموں کی سرکشیوں اور بغاوتوں کا ذکر فرما رہے ہیں اور اس میں تو پنجاب کا ذکر تک بھی نہیں جہاں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ اس مکتوب میں اگرچہ مولانا جعفر صاحب تھانیسری نے ہند کی بجائے پنجاب کا نام ہی لیا ہے لیکن یہ ترمیم ان کی طرف سے اس مصلحت کے پیشِ نظر تھی جس کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے ایک اور مکتوب میں سید صاحبؒ گوالیار کے ہندو راؤ کو لکھتے ہیں۔

بیگانگانِ بعید الوطن ملوک زمین و زمن
گردیدہ اند و تاجرانِ متاع فروش
بہ پایۂ سلطنت رسیدہ امارت امرائے
کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد
کردہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ
چوں اہلِ ریاست و سیاست در زاویۂ
خمول نشستہ اند لاچار چندے از اہلِ فقر
و مسکنت کمرِ ہمت بستہ ایں جماعت ضعفاء
محض بناء بر خدمتِ دینِ ربِ العالمین برخاستہ
اند، ہرگز ہرگز از دنیا دارانِ جاہ طلب نیستند
...... وقتیکہ میدانِ ہندوستان از
بیگانان و دشمنان خالی گردید و تیر سعی
ایشاں بر ہدفِ مراد رسیدہ آئندہ مناصب
ریاست و سیاست بہ طالبین آں مسلم
باد[45]

وہ بیگانے جن کا وطن بہت بعید ہے، بادشاہ
بن گئے جو تاجر سامان فروش تھے، انہوں نے
سلطنت قائم کر لی بڑے بڑے امیروں کی امارتیں
اور رئیسوں کی ریاستیں خاک میں ملا دی گئیں
ان کی عزت اور اعتبار چھن گیا جو لوگ اہلِ ریاست
و سیاست تھے وہ گوشۂ گمنامی میں بیٹھ گئے آخر
کچھ فقیروں اور مسکینوں نے کمرِ ہمت باندھی ہے اور
ضعیفوں کی یہ جماعت محض رب العالمین کے دین
کی خدمت کے لیے اٹھی ہے یہ لوگ ہرگز ہرگز
دنیا دار، جاہ طلب نہیں ہیں جب ہندوستان کا
میدان بیگانوں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے
گا اور کمزور لوگوں کی کوشش کا تیر نشانۂ مراد
کو لگ جائے گا تو آئندہ کے لیے ریاست و
سیاست کے منصب، طالبوں ہی کو مبارک
ہوں۔

غور فرمائیے کہ یہ دور سے آئے ہوئے بیگانے کون تھے جو تجارت کرتے کرتے حکومت کے مالک بن گئے؟ کیا یہ انگریز نہ تھے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ۱۵۷۹ء میں جب طامس سٹیفن

نامی ایک انگریز پہلے پہل برِصغیر میں آیا اور اس نے یہاں کی زرخیزی، اشیائے صرف کی ارزانی اور دیگر حالات کا اپنے خطوط میں اس قدر دلکش انداز میں نقشہ کھینچا کہ اس سے انگریزوں کے اس اشتیاق کو اور بھی مہمیز لگ گئی، جو ان علاقوں میں تجارت کی وجہ سے پرتگیزوں کی خوشحالی دیکھ کر انہیں بھی یہاں آنے کے لیے بے قرار کر رہا تھا۔ چنانچہ ۱۵۸۷ء میں برطانیہ کے بحری بیڑے نے سپین کے بحری جہازوں کو تباہ کر دیا اور اس سے انگریزوں کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے اور انہوں نے برِصغیر میں تجارت کا عزم صمیم کر لیا۔ ۱۵۹۹ء میں لندن کے چند تاجر پیشہ لوگوں نے ملکہ الزبتھ سے برِصغیر میں تجارت کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کی جسے قبول کر لیا گیا۔ انہی تاجروں نے مل کر ۱۶۰۰ء میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی، جس کا نام "ایسٹ انڈیا کمپنی" رکھا گیا۔ کمپنی نے ابتداء میں ملایا کی طرف توجہ کی مگر ولندیزیوں کی شدید مخالفت کے پیشِ نظر انہیں وہاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، چنانچہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ برِصغیر پاک و ہند کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے مبذول کر دی غرضیکہ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریز ابتداً برِصغیر میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے لہٰذا سید صاحبؒ کا یہ فرمانا کہ "بیگانگانِ بعیدالوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ اند و تاجرانِ متاع فروش بہ پایۂ سلطنت رسیدہ" صراحتہً انگریزوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ تو بعیدالوطن تھے اور نہ تاجرانِ متاع فروش۔

حضرت سید صاحبؒ کے ایک مریدِ خاص اور تحریک کے شاعر جناب مومنؒ[۴۹] کے ایک فارسی نعتیہ قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان کے پڑھنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزوں کے خلاف جہاد بھی پروگرام میں شامل تھا۔ مومن فرماتے ہیں۔

ایں عیسویاں بہ لب رسانند ۔۔۔ جانِ من و جانِ آفرینش

مگزار کہ پائمال گردیم ۔۔۔ زاں سیم سرانِ آفرینش

تا چند بہ خواب ناز باشی ۔۔۔ فارغ ز فغانِ آفرینش

مومن شدہ ہم زبانِ عرفیؔ ۔۔۔ از بہر امانِ آفرینش

"برخیز کہ شورِ کفر برخاست

اے فتنہ نشانِ آفرینش"

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ چونکہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں کو جہاد کی طرف توجہ دلائی تھی اس لیے ہم ذیل میں آپ کے ایک فتویٰ کو بھی نقل کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے موقف کی زبردست تائید ہوتی ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکم روساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری است و مراد از اجراء احکام کفر اینست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و باج وعشور اموال تجارت وسیاست قطاع الطریق وسراق وفیصل خصومات و سزائے جنایات، کفار بطور حاکم باشند آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ، عیدین و اذان و ذبح بقر، تعرض نہ کنند نہ کردہ باشند لیکن اصل اصول ایں چیزہا نزد ایشاں بہباء و ہدر است، زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مے نمائند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و در نواح نمے تواند آمد و برائے منفعت خود از واردین و مسافرین وتجار نمے مانند اعیان دیگر مثلاً شجاع الملک و ولائتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمے توانند شد و ازیں شہر تا

اس شہر میں امام المسلمین کا حکم بالکل جاری نہیں ہے یہاں تو عیسائی حکمرانوں کا حکم بلا دغدغہ جاری ہے اور انکا حکم جاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ ملکداری، انتظام رعیت خراج، باج عشر و مالگزاری اموال تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات مقدمات کے تصفیہ اور دیگر جرائم کی سزاؤں وغیرہ کے نافذ کرنے میں یہ لوگ بطور خود حاکم ہیں ہندوستانیوں کے ان کے متعلق کوئی دخل نہیں بیشک نماز جمعہ عیدین، اذان اور گائے کے ذبح وغیرہ چند احکام اسلام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور آزادی کی بنیاد ہے وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں عوام کی شہری آزادی ختم ہو کر رہ گئی ہے کوئی مسلمان یا ذمی ان کے پاسپورٹ کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آمد و رفت کی اجازت بھی شہری آزادی کی بناء پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی وجہ سے ہے اور اسکے برعکس ممتاز حضرات مثلاً

کلکتہ عمل نصاریٰ ممتدست۔ آرے در چنپ و راست مثل حیدر آباد، لکھنؤ و رامپور احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحت و اطاعت مالکان آن ......
...... الخ

شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر ان شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتہ تک انہی کی عملداری ہے بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، رامپور میں چونکہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے اس لیے وہاں ان کے احکام جاری نہیں ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے اس فتویٰ کا حاصل یہ ہے کہ اب جبکہ صورتِ حالات یہ ہے کہ قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائی حکمرانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ مذہب کا احترام ختم کر دیا گیا ہے اور شہری آزادیوں سے شہریوں کو محروم کر دیا گیا ہے تو مسلمانوں پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ ان "رؤسا نصاریٰ" کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیں کیونکہ اس مذکورہ صورت کے پیشِ نظر ملک دارالحرب بن چکا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے فتویٰ میں بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کو دارالحرب ثابت کیا ہے[۱۸]۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے شاہ صاحبؒ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

امام عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے فتویٰ دیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقت کے قبضہ میں جا چکے ہیں، ان قطعات میں اگرچہ برائے نام سلطانِ دہلی کا دخل مانا جاتا ہے، لیکن وہ سب کے سب دارالحرب ہیں۔ امام عبدالعزیزؒ کے نزدیک سلطانِ دہلی کی برائے نام حکومت ملک کو دارالاسلام نہیں بنا سکتی، چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو زبردست قوتیں موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ یا تو یہاں سے ہجرت کر جائیں یا دشمن سے لڑ کر اپنی نئی حکومت بنائیں ہر وہ شخص جو دارالحرب میں رہتا ہو، اس کا یہ مذہبی فرض ہے دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت کا نظام دشمنوں کی غالب طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تو یہ فرض عام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے ملت

اسلامیہ کا اس سے تغافل برتنا اور اس معاملہ میں کچھ نہ کرنا شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ جب یہ حالت ہو تو مسلمانوں کے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ دشمنوں کے غلبہ کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا ارادہ کرے۔ اور پھر جیسے جیسے حالات پیش آتے رہیں اسی لحاظ سے اجتماعی نظام قائم کرتا رہے[۴۹]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحؒ کے اس فتویٰ اور حضرت سید صاحبؒ کے اس مکتوب پر ایک بار پھر نظر کیجئے، جس میں فرماتے ہیں کہ "جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور مشاہیر حکام پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ و مقاتلہ کی کوششیں اس وقت تک جاری وساری رکھیں جب تک کہ ان علاقوں کو ان سے واپس نہیں لے لیا جاتا۔" تو اس سے جہاد کی بنیاد و اساس واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے اور جب عملِ جہاد کی یہ واضح اساس پیشِ نظر ہو تو ذرہ بھر سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس نتیجہ پر بآسانی پہنچ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے قبضہ سے صرف وہی علاقہ تو غیر مسلموں کے قبضہ میں نہیں گیا تھا جو سندھ اور ستلج کے درمیان تھا اور جس پر رنجیت سنگھ تسلط جمائے ہوئے تھا؟ بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ وسیع اور سرسبز و شاداب علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن چکے تھے جو کہ مشرقی طرف ستلج سے اراکان، مغربی طرف کاٹھیاواڑ اور گجرات اور جنوبی جانب راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے تو پھر انہیں واپس لینے کے لیے جہاد کیوں نہیں؟ تمام دلائل سے قطع نظر اگر صرف یہی ایک نکتہ غور و فکر کی گرفت میں آجائے تو انسان اس نتیجے پر بخوبی پہنچ سکتا ہے کہ حضرت امام صاحبؒ اور سید صاحبؒ کا جہاد کن کے خلاف تھا۔ لیکن ہم نے ان قیاسات پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ اپنے موقف کی تائید میں ٹھوس دلائل بھی بہم پہنچائے ہیں تاکہ مسئلہ زیرِ بحث بخوبی منقح و مہذب ہو جائے۔ بریلوی مکتبِ فکر کے مولانا احمد رضا خاں نے بھی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ :—

امام الطائفہ (امام محمد اسمٰعیل شہید، مؤلف) نے ترغیبِ جہاد کے ضمن میں لکھا۔ "ہندوستان دریں جزو زمان کہ ۱۲۳۳ھ یک ہزار و دصد و سی

ورسوم ست الکثرش دارالحرب گردیدہ ؏[۵۰]

اسی طرح مولانا شاہ احمد حسن صاحب کانپوری نے بھی لکھا ہے :-

"سنہ ۱۲۴۳ھ میں بسبب ضعف سلطنت کے ایک شخص نے کہ نام اس کا اسمٰعیل تھا، ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔"[۵۱]

یہ دونوں بزرگ حضرت امام صاحبؒ سے زبردست مخالفت رکھنے والے، بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ امام صاحبؒ کے نزدیک ہندوستان دارالحرب تھا جبکہ آپ کے نزدیک ہندوستان دارالحرب تھا تو پھر جہاد ایک مخصوص علاقہ میں کیوں ؟

دعوت جہاد

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ جب اپنے پیرو مرشد کی معیت میں سنہ ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ء) کو فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد واپس وطن تشریف لائے، تو ان کے فرمان کے مطابق جہاد کے لیے دعوت و تنظیم میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ بھی سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہتے تھے اور اس سلسلہ میں آپ کی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں ان کے طوفانی دوروں کا اندازہ لگائیے کہ شوال سنہ ۱۲۳۹ھ میں جب شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات ہوئی تو یہ دونوں بزرگ دہلی میں تھے جناب امیر شاہ خاں صاحبؒ نے تو مولانا عبدالقیوم صاحب اور اپنے استاد میاں جی محمدی صاحبؒ سے سن کر صراحت کی ہے کہ حج سے واپسی کے بعد دہلی میں چھ مہینے تک قیام رہا۔ اس عرصہ میں حضرت امام صاحبؒ گلی کوچوں میں اور مولانا عبدالحی صاحبؒ مسجدوں میں وعظ ارشاد فرمایا کرتے تھے[۵۲]۔ لیکن دورے کرتے کرتے سنہ ۱۲۴۱ھ تک کانپور پہنچ گئے۔ حضرت امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جس سوز و سازِ رومی اور تب و تابِ رازی سے نوازا تھا اس کا مختصر سا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ کی تقریر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی۔ جس کی متعدد مثالیں ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں۔ اب جو آپ نے جہاد کے مسائل کو موضوعِ سخن بنایا تو اس سے بھی لوگوں نے خاطر خواہ اثر قبول کرتے ہوئے آپ کی آواز پر لبیک کہا بلکہ سرسید کے الفاظ میں "آپ کے صیقلِ تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفّا اور مجلّا ہو گیا اور اس طرح سے راہِ حق میں سرگرمِ عمل ہوئے کہ بے اختیار چاہنے لگے کہ سر اُن کا راہِ خدا میں فدا ہو اور جان اُن کی اعلائے لوائے دینِ محمدی میں صرف ہو"[۵۳]۔

اور یہ آپ کی ان مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا جو آپ نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑنے بلکہ خواب خرگوش میں مدہوش قوم کو ہوش میں لانے کے سلسلہ میں انجام دیں اور یہ صرف آپ کی پونے دو سال کی دعوت و تبلیغ کا نتیجہ تھا کہ قوم کی مردہ رگوں میں خونِ حیات گردش کرنے لگ گیا، وہ خون جو کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے میدانِ کارزار کو لالہ زار بنا کر حیاتِ جاوداں کے لیے بڑا ہی بے قرار ہوتا ہے غرضیکہ انتہائی قلیل عرصہ میں غازیانِ صف شکن اور مجاہدینِ کفن بر دوش کی ایک جماعت تیار ہو گئی، جو راہِ خدا میں اپنا تن، من، دھن نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھی۔ بڑے غور و فکر کے بعد صوبہ سرحد کو مرکز بنا کر، یہاں سے جہاد کا آغاز کیا گیا۔

روانگی

جب بڑے غور و فکر کے بعد سرحد کو مرکز بنا لینے کا فیصلہ کر لیا گیا، تو حضرت امام صاحبؒ، امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ اور دیگر رفقاء کی معیت میں ۷، جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ (۱۷، جنوری ۱۸۲٦ء) کو مقدس فریضۂ جہاد کے ادا کرنے کی نیت سے رائے بریلی سے سوئے سرحد روانہ ہو پڑے۔ روانگی کے وقت مجاہدینِ اسلام کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ نہ تھی کیوں کہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ فی الحال اسی تعداد پر اکتفاء کیا جائے گا اور سرحد میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد اگر ضرورت محسوس ہوئی تو باقی مجاہدین کو بھی بلا لیا جائیگا قافلہ کی سرسری گروپ بندی اگرچہ رائے بریلی سے روانگی سے قبل ہی کر لی گئی تھی مگر گوالیار پہنچنے کے بعد باقاعدہ طور پر پانچ جماعتیں تشکیل دے دی گئیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ **جماعتِ خاص** :۔ یہ جماعت سفر و حضر میں قلب لشکر تھی اس کے امیر مولانا محمد یوسف صاحب پھلتیؒ تھے۔ سید صاحبؒ کی رفاقت کا شرف بھی اسی جماعت کو حاصل تھا

۲۔ **مقدمۃ الجیش** :۔ یہ جماعت سب سے آگے ہوتی تھی۔ اس کے سرعسکر حضرت امام صاحبؒ تھے۔

۳۔ **میسرہ** :۔ اس جماعت کو امیر سید محمد یعقوب صاحبؒ تھے۔ آپ کو جب ضروری کاموں کے سلسلہ میں ٹونک میں چھوڑ دیا گیا تو شیخ بڈھن نے آپ کی نیابت کے فرائض انجام دیئے

۴۔ **میمنہ** :۔ اس جماعت کے امیر امجد خاں رئیس گنگنہ تھے۔

۵۔ **ساقۃ الجیش** :۔ یہ گروپ گاڑیوں اور چھکڑوں کے ساتھ رہتا تھا اور اس کے

امیر اللہ بخش خاں موڑ انوی ؒ بنائے گئے تھے۔

حضرت امام صاحب ؒ، مقدمۃ الجیش کی قیادت کے علاوہ عام تنظیمی و تبلیغی امور کی کفالت اور باربرداری کے انتظام کے فرائض بھی انجام دیتے تھے باربرداری کے سلسلہ میں سید محمد یعقوب بھی آپ کے معاون تھے اس جماعت بندی کے بعد جو اصحاب شامل ہوتے انہیں امجد خاں کی جماعت میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ غازیانِ راہِ حق کا یہ مقدس گروہ اسلاف کی روایات کو زندہ اور حکایات کو تابندہ کرتے ہوئے۔ رائے بریلی سے بندھیل کھنڈ، گوالیار، ٹونک، اجمیر، صحرائے مارواڑ، عمرکوٹ، حیدر آباد، شکار پور، کوئٹہ، قندھار، غزنی اور کابل وغیرہ سے ہوتا ہوا، دس مہینے میں تین ہزار میل کی مسافت طے کرنے کے بعد نومبر ۱۸۲۶ء کے اواخر میں پشاور پہنچ گیا۔ اس طویل سفر میں تپتے ہوئے بے آب و گیاہ صحرا بھی آئے اور بہت بڑے بڑے دریا بھی، سنگلاخ گھاٹیوں کو بھی طے کرنا پڑا اور دشوار گزار، پرخطر اور خارزار وادیوں کو بھی، پھر قیامت خیز گرمی اور بھوک پیاس کی شدت سے پیٹ میں اٹھتے ہوئے قراقر اس پر مستزاد، متواتر سفر اور اکثر و بیشتر مجاہد سواری سے محروم غرضیکہ راہِ عشق کے وہ کون سے امتحان تھے جنہوں نے قدم قدم پہ ان کے دامن کو نہ تھاما ہو مگر یہ جانباز تھے کہ مصیبتوں کی موجوں سے بے حال ہوتے ہوئے، کفر کی طاقتوں اور خاشاک غیر اللہ کو، تعداد کی قلت اور سامان حرب کی کمی سے بے نیاز ہو کر زورِ حق سے پامال کرنے جا رہے تھے۔ بڑی سے بڑی آزمائش بھی ان کے پایۂ استقلال میں جنبش پیدا نہ کر سکی، اپنی دھن کے پکے اور عزم کے سچے دیوانہ و مستانہ وار سوئے منزل رواں دواں رہے۔ چشم فلک ان کے جوشِ جنوں کو دیکھ کر حیران تھی، میدانِ جنگ ان کے قدموں کی آہٹ سے لرز اٹھا اور خود آلام و مصائب، عزم کے ان کوہِ گراں بہادروں کی ہیبت کے سامنے دم بخود تھے۔ گویا زبانِ حال کہہ رہی تھی سے

بڑھے چلو مجاہدو، تمہیں سے قوم کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ ان "عاشقانِ پاک طینت" کے سب سے بڑے دشمن اور متعصب انگریز مؤرخ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر (W. W. HUNTER) نے درج ذیل الفاظ میں انہیں خراجِ تحسین

پیش کیا ہے :-

"وقت گزرتا گیا لیکن جب بھی وہ دیکھتے کہ ان کی تحریک تباہ ہو رہی ہے تو وہ خاک سے جہاد کا علم بلند کر دیتے، وہ اپنی حفاظت سے بے نیاز تھے، ان کی زندگی داغوں سے پاک تھی۔ ان کے سینے میں ایک شعلہ فروزاں تھا کہ انگریز کافروں کا تختہ الٹ دیا جائے اور جہاں تک روپیہ اور رنگروٹ فراہم کرنے کے لیے ایک مستقل نظام قائم کرنے کا تعلق تھا وہ اس میں بڑے ماہر تھے پٹنہ کے خلیفہ اس فرقہ میں ایک نمونے کی شخصیت کے مالک تھے ان کی زیادہ تر تعلیمات اغلاط سے پاک تھیں انہوں نے ہزار ہا ہموطنوں کو خدا تعالیٰ کے ایک بہتر تصور سے آشنا کیا اور انہیں ایک زیادہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر ابھارا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک میرے تجربے کا تعلق ہے اس فرقے کے سب سے زیادہ روحانی اور کم از کم خود غرض نمونے کی نمائندگی صرف وہابی مبلغ ہی کر سکتا ہے ایک وہابی کے سامنے ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ دین محمدی کی تطہیر کا عظیم الشان کام سر انجام دیا جائے۔ اس راستے پر گامزن ہوتے ہوئے وہ نہ کسی سے ڈرتا ہے اور نہ کسی پر رحم کر سکتا ہے۔ زندگی میں اس کا راستہ واضح اور بیّن ہے اور کسی قسم کی تنبیہہ یا سزا اسے اس راستے سے ہٹانے پر مجبور نہیں کر سکتی ہے[۹۵]"

جنگ اکوڑہ

یہ لشکر اسلام نومبر ۱۸۲۶ء کے اواخر میں پشاور پہنچا تھا اور وہاں پر تین چار دن قیام کرنے کے بعد چارسدہ روانہ ہو گیا ادھر بدھ سنگھ بھی اپنے لشکر سمیت خیر آباد پہنچ چکا تھا مجاہدین اسلام چارسدہ سے ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء (۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ) کو خویشگی پہنچ گئے اور ۱۹ دسمبر کو نوشہرہ میں قدم رنجہ ہو گئے بدھ سنگھ اس وقت تک خیر آباد کو خیر باد کہہ کر اکوڑہ میں داخل ہو چکا تھا، جو کہ نوشہرہ سے جنوبی طرف سات آٹھ میل کی مسافت پر دریائے لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے۔ دشمن چونکہ بالکل قریب تھا اس لیے سید صاحبؒ نے مجاہدین کو حکم دیا کہ ہتھیار نہ اتاریں، کھانے پینے سے جلد فراغت حاصل کر لیں اور چار چوبند چوکس رہیں۔ سکھ لشکر کی تعداد اس وقت سات سے دس ہزار کے درمیان تھی جب کہ

مجاہدین صرف ڈیڑھ ہزار تھے سکھوں کے پاس ہر قسم کے اسلحہ کی فراوانی تھی اور ان کے پاس آٹھ توپیں بھی تھیں لیکن مجاہدین میں سے سب کے پاس بندوقیں بھی نہ تھیں۔ مجاہدین اور سکھوں کے درمیان یہ پہلی معرکہ آرائی تھی لہذا ان مذکورہ حالات کو سامنے رکھ کر طریقۂ جنگ کے متعلق مشورہ کیا گیا بڑے غور و فکر کے بعد طے پایا کہ سکھ لشکر پر شب خون مارا جائے بعض روایات میں ہے کہ سید صاحبؒ اس سے قبل ہی دربارِ لاہور کو درج ذیل اعلام نامہ بھیج چکے تھے، جسے حضرت امام صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا :۔

یا تو تم اسلام قبول کرو۔ اس وقت ہمارے برابر ہو جاؤ گے اور ہم بجائے جنگ و جدال کے، ہر طرح تمہاری اعانت کریں گے کسی کو جبراً اسلام میں داخل کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اگر تم کو بخوشی اسلام قبول کرنا منظور نہ ہو تو دوسری شرط یہ ہے کہ تم اپنے وطن و مذہب پر قائم رہ کر ہماری اطاعت اختیار کر کے جزیہ دینا قبول کرو اس حالت میں بھی جب تک تم مطیع رہو گے ہم تمہارے جان و مال کی حفاظت مثل اپنے جان و مال کے کریں گے اور اگر یہ دونوں امر مذکورہ بالا تم کو منظور نہ ہوں تو پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، اور یہ بھی یاد رکھو کہ گو ہم اس وقت تعداد میں تھوڑے ہیں مگر ملک یاغستان اور سارا ہندوستان راہِ خدا میں جان دینے کو تیار ہے اور ہم لوگ موتِ شہادت کو ایسا دوست رکھتے ہیں جیسا کہ تم شراب[۵۸] کو۔"

جب قاصد نے دربارِ رنجیت سنگھ میں پہنچ کر یہ نامہ دیا تو اس کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے نہایت بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاصد کی پٹائی کرائی اور پھر دھکے دے کر دربار سے نکلوا دیا اور نامہ کا کچھ جواب نہ دیا۔ قاصد نے واپس پہنچ کر سید صاحبؒ کی خدمت میں تمام ماجرا کہہ سنایا سید صاحبؒ فرمانے لگے ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اب ہم روزِ محشر خدا تعالیٰ کے ہاں مسئولیت سے بچ جائیں گے۔

بہر کیف شبخون کا فیصلہ کرنے کے بعد تمام جماعتوں کے سپہ سالاروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی

اپنی جماعت میں سے نہایت بہادر، مستعد اور چوکس جوانوں کی فہرست تیار کریں۔ تاکہ اسے سامنے رکھ کر شبخون کے لیے مناسب لشکر ترتیب دیا جا سکے۔ سپہ سالاروں نے ارشاد کی تعمیل کی اور سید صاحبؒ نے نوسو رعنا، کڑیل اور جیالے جوانوں کو منتخب فرما لیا۔ حضرت امام صاحبؒ کا اس فوج کی کمان کرنے کا ارادہ تھا مگر سید صاحبؒ نے اللہ بخش مورانویؒ کے ذمہ یہ کام سپرد کر دیا اور حضرت امام صاحبؒ کو ایک چاق و چوبند دستہ دے کر دریائے لنڈہ کے کنارے پر متعین کر دیا تاکہ بوقت ضرورت کمک لے کر میدان میں پہنچ جائیں یا اگر سکھ فرار ہو کر اس طرف سے گزریں تو انہیں تہ تیغ کر دیا جائے۔

مجاہدین نے نصف شب کے قریب دریائے لنڈہ کے مغربی کنارے سے منزل مقصود کی طرف روانگی شروع کی۔ روانگی سے قبل ہر ایک نے ایک دوسرے سے کہا سنا معاف کرایا۔ سید صاحبؒ کے حکم کے مطابق روانگی سے پہلے ہر ایک مجاہد نے گیارہ گیارہ مرتبہ سورۂ قریش تلاوت کرکے اپنے اوپر دم بھی کیا۔ سکھ لشکر نے اکوڑہ سے باہر کھلے میدان میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا مجاہدین میں سے ایک کو لشکر گاہ کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا گیا، جب وہ واپس آیا تو اس کی راہنمائی میں مجاہدین نے پیش قدمی کی اور قلیل سی مدت میں لشکر کے اس حصے تک پہنچ گئے، جہاں اکثر سکھ خواب خرگوش میں مدہوش پڑے تھے۔

سکھ لشکر کے گھڑیال نے جب تین بجے الارم بجایا، مجاہدین اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے سکھ لشکر گاہ میں گھس گئے اور ایک ایک مجاہد نے اپنی شمشیر براں کی ضرب بے نہار سے آٹھ آٹھ دس دس سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عبدالمجید آفریدیؒ نے چودہ سکھوں کو واصل جہنم کیا پھر ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ جب مولانا امیر الدین ولایتیؒ کو معلوم ہوا کہ ان کی تلوار ٹوٹ گئی ہے تو انہوں نے فوراً انہیں ایک تلوار دے دی کیونکہ ان کے پاس اس وقت دو تلواریں تھیں۔ خاں صاحبؒ نے اس کے ساتھ بھی کئی اور سکھوں کو موت کی نیند سلا دیا اور آخر کار خود بھی جام شہادت نوش فرما گئے۔ اسی طرح ایک اور غازی ہدایت اللہ نے برچھی کے ساتھ سات سکھوں کو خاک و خون میں تڑپنے پر مجبور کر دیا علی ہذا القیاس دیگر تمام غازیان صف شکن نے بھی شجاعتوں اور بسالتوں کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اکوڑہ کی یہ جنگ ۲۰ جمادی الاولی ۱۲۴۲ھ (مطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء) چہار شنبہ اور پنجشنبہ کی درمیانی شب

لڑی گئی اور سوا چار بجے سے چھ بجے صبح تک جاری رہی۔ اس جنگ میں بعض غازیوں کے جوشِ شجاعت میں شبخون کے حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے نقصان بھی ہوا۔ چھتیس ہندوستانی اور چھیالیس قندھاری غازی جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ سکھوں کا نقصان اس سے کئی گنا زیادہ تھا۔ کم از کم سات سو سکھ میدانِ جنگ میں کام آئے اور جو زخمی ہوئے وہ اس سے کہیں زیادہ تھے۔ سکھوں پر مجاہدین کی جانبازی و جوانمردی کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ بے ساختہ اعتراف کر رہے تھے کہ "سکھاں ایں چنیں مقاتلاں دیدہ و شنیدہ نہ شد" یعنی ایسے جوانمرد نہ کہیں دیکھے اور نہ سنے۔ اہلِ سرحد پر بھی اس جنگ کا خوشگوار اثر پڑا وہ مجاہدین کی بہادری سے بے پناہ متاثر ہوئے اور مختلف جماعتوں اور قافلوں کی شکل میں سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعتِ جہاد کر کے پرچمِ اسلام کے نیچے جمع ہونے لگے۔

جنگِ اکوڑہ میں شبخون بڑا کامیاب رہا تھا لیکن یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس جنگ میں مجاہدین کا جو نقصان ہوا وہ زیادہ تر اہلِ سرحد کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے اصل کام چھوڑ کر سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے یورش کی شدت میں کافی کمی واقع ہو گئی تھی۔

بیعتِ امامت جہاد

سرحد پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ نظم و جمعیت سے بالکل ناواقف ہیں اور مجاہدین کا ساتھ جہاد کے بلند مقاصد کے پیشِ نظر نہیں بلکہ حصولِ مال و زر کے سبب سے دیتے ہیں جیسا کہ جنگِ اکوڑہ میں اس کا تجربہ ہوا۔ نظم و جمعیت کے فقدان کے علاوہ وہاں کے خوانین و رؤسا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رقابتیں بھی رکھتے تھے۔ ان حالات میں ایک بلند نصب العین کی تکمیل ناممکن تھی اس لیے حضرت امام صاحبؒ نے سرحد پہنچنے کے بعد وہاں کے علماء اور خوانین کے ساتھ گفتگو کی اور انہیں ایک مرکزی نظام کی اہمیت کا قائل کر لیا اور انہیں سمجھایا کہ جب تک ہم ایک پرچم کے نیچے جمع نہیں ہو جاتے اس وقت تک کامیابی ناممکن ہے، چنانچہ سرحد کے رؤسا اس بات پر متفق ہو گئے کہ جہاد کے لیے ایک امام یا امیر کا انتخاب ضروری ہے اور اس منصبِ جلیل کے لائق "صرف حضرت سید احمدؒ کی ذاتِ گرامی ہے"، چنانچہ ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء) کو جمعرات کے دن ہنڈ کے "تالاب کے کنارے" ساداتِ کرام، علماءِ عظام، مشائخ ذوی الاحترام، امرائے عالی مقام و

سائر خواص وعوام" نے سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعتِ امامتِ جہاد کی ۔ اس کامیابی کا تمام تر سہرا حضرت امام محمد اسمٰعیلؒ کے سر ہے ۔

جنگِ شیدو

شیدو صوبہ سرحد کا ایک مشہور گاؤں، اکوڑہ سے قریباً چار میل جنوب کی طرف واقع ہے ۔ مجاہدین نے سکھوں کے خلاف یہاں جو لڑائی لڑی وہ جنگِ شیدو کے نام سے معروف ہے یہ جنگ تحریکِ جہاد کے سلسلہ میں نہایت اہم تھی اس کی وجہ سے تحریک پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے لیکن ہم جنگ کی تمام جزئیات کی تفصیل بیان نہیں کریں گے کیونکہ ہمارا مقصود تو صرف ان امور کو ذکر کرنا ہے، جن کا تعلق براہِ راست حضرت امام صاحبؒ سے ہے۔ اس جنگ میں پشاور کے سرداروں نے مجاہدین سے غداری کی اور یار محمد خاں نے حضرت سید صاحبؒ کے کھانے میں زہر ملا دیا کیونکہ وہ خفیہ طور پر سکھوں سے ساز باز کر چکا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے فوج کو میدانِ جنگ میں ایسے مقام پر کھڑا کیا تھا جہاں سے وہ آسانی کے ساتھ راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا چنانچہ اس نے لڑائی میں بھی کوئی حصہ نہ لیا۔ جب مجاہدین نے شجاعت کے جوہر دکھانا شروع کیے اور سکھوں کے چھکے چھوٹنے لگے اور ان کی جمعیت منتشر ہونے لگی تو اس بیدرد نے راہِ فرار اختیار کی بلکہ سازش کے تحت کئی آدمیوں نے اس کے فرار کو شہرت دینا شروع کر دی جس کی وجہ سے تمام لشکرِ اسلام بے چینی، بے ترتیبی اور پریشانی کا شکار ہو گیا چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس جنگ میں چھ ہزار غازیانِ حزب اللہ نے جامِ شہادت نوش فرمایا ۔

جس رات یار محمد خاں نے حضرت سید صاحبؒ کے کھانے میں زہر کی آمیزش کی آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور بار بار غشی کے دورے پڑنے لگے تھے جب رات کو لڑائی کے لیے تیار ہو جانے کا نقارہ بجا تو حضرت امام صاحبؒ آپ کے خیمہ میں تشریف لائے تو آپ کو بے ہوش پایا۔ امام صاحبؒ نے آپ کی حفاظت کا بندوبست کیا، ہاتھی پر سوار کیا، ساتھ ہودے میں خود بھی بیٹھ گئے اور میدانِ جنگ سے دور لے جانے کے لیے چل پڑے سید صاحبؒ پر بدستور غشی کے مسلسل دورے پڑ رہے تھے ۔ امام صاحبؒ کو آپ کے بچانے کا فکر بڑی شدت سے دامن گیر تھا۔ چنانچہ آپ کے انہماک کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب مجاہدین نے آپ

کو دُرّانیوں اور اہلِ سمہ کے فرار کی وجہ سے مسلمانوں کی شکست کی خبر دی تو آپ حیرانی کے عالم میں فرمانے لگے۔ "چہ می گوئی؟ مسلمانان فتح یاب اند" (تو کیا کہتا ہے؟ مسلمان تو کامیاب ہیں) جب اس نے دُرّانیوں اور اہلِ سمہ کے فرار ہونے کے متعلق بتایا تو امام صاحبؒ پر پہلی مرتبہ حقیقت حال منکشف ہوئی۔

سیّد صاحبؒ مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھے سارے لشکرِ اسلام میں صرف ایک ہی ہاتھی تھا جس پر اب سیّد صاحبؒ اور امام صاحب سوار تھے سکھوں نے اس ہاتھی کے تعاقب کا خاص اہتمام کیا اور یہ شاید یار محمد خاں کی مخبری کی وجہ سے تھا۔ امام صاحبؒ نے سکھوں کے ارادہ کو بھانپ لیا اور انہوں نے سیّد صاحبؒ کو گھوڑے پر سوار کرا دیا اور خود ہاتھی پر ہی سوار رہے اس سے مقصود یہ تھا کہ سکھ سمجھیں گے کہ ہاتھی پر سیّد صاحبؒ ہی سوار ہیں حالانکہ وہ اس اثناء میں خطرے سے دُور نکل جائیں گے چنانچہ جب سیّد صاحبؒ دُور چلے گئے تو امام صاحبؒ ہاتھی سے اُتر پڑے اور قریب کے غازیوں کو ساتھ لے کر پشاور کی طرف پیدل چل پڑے۔

حضرت امام صاحبؒ کی یہ جانبازی و جانثاری آپ کے اعمالِ صالحہ میں سے ایک عملِ عظیم ہے اور آپ کی شانِ ایثار کی ایک بہترین مثال! جزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین احسن الجزاء۔

ہزارہ میں تنظیمی سرگرمیاں

مجاہدین کی قدوسی جماعت جب ہزارہ پہنچی تو ان دنوں یہاں کی سیاسی صورتِ حال نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ خوانین ہزارہ باہمی اختلاف و انتشار اور سر پھٹول کا شکار تھے۔ اٹک رائے کے رئیس ہاشم خاں نے جب کمال خاں کو اپنی تلوار کا نشانہ بنایا تو محمد خاں ترین نے کمال خاں کے وارثوں کی نصرت وحمایت شروع کر دی، ہاشم خاں کو مجبوراً اپنی مدد کے لیے راولپنڈی کے سکھ گورنر مکھن سنگھ کو صدا دینا پڑی وہ فوراً پانچ صد سوار لے کر ہزارہ آ گیا۔ بس اس سے ہزارہ میں سکھوں کا تصرف اور تسلط شروع ہو گیا اور ہزارہ کے افق پر تیس پینتیس سال تک ظلم و استبداد کے بادل چھائے رہے اور سرزمینِ ہزارہ خونِ ناحق سے لالہ زار بنتی رہی۔ اس وقت ہزارہ میں سکھوں کی طرف سے درندگی اور بہیمیت کے مظاہرہ کی تفصیل مقصود نہیں بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ

تھے وہ حالات جب فرشتوں اور قدوسیوں کی طرح نیک اور مہربان مجاہدینِ اسلام حضرت سیّد احمدؒ اور حضرت امام صاحبؒ کی راہنمائی میں مشعلِ نور بن کر ہزارہ پہنچے اور اُن کی بدولت صوبہ سرحد کی یاس انگیز شب دیجور میں امید کا سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تو ہزارہ کے تمام تباہ حال رؤسا اور خوانین نے رابطہ قائم کر کے مجاہدین کے دامنِ عاطفت میں پناہ لینا شروع کی۔ یہ سرداران ہزارہ باہمی آویزش کی وجہ سے تباہ ہوئے تھے ورنہ صرف انہی کو متحد اور منظم کر کے ہزارہ میں ایک مضبوط ترین محاذ قائم ہو سکتا تھا اور دوسری طرف کشمیر کی طرف بھی پیش قدمی کی جا سکتی تھی۔ والئ چترال سلیمان شاہ نے بھی سیّد صاحب کی خدمت میں پیغام بھیجا تھا کہ اگر آپ کشمیر کا رخ کریں تو میں بھی اپنی فوج کے ساتھ آپ کی مدد کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر سیّد صاحبؒ پکھلی (ہزارہ) کی جانب جہاد کے انتظام کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ پکھلی کی طرف مجاہدین کو روانہ کرنے کی تجویز جب پختہ ہو گئی تو سیّد صاحبؒ نے حضرت امام صاحبؒ کی قیادت میں ڈیڑھ سو غازیوں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دے کر روانہ فرمایا۔ مولوی خیر الدین شیرکوٹیؒ[60] اور ملا شاہ سید جبیرؒ[61] منگی بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ سیّد محمد مقیم[62] اور ملا شاہ سیّدؒ اس مہم میں حضرت امام صاحبؒ کے نائب بنا دیئے گئے تھے۔ فتح محمد خاں پنجتاری بھی اس لشکر میں شامل تھے تاکہ راستہ میں راہنمائی کے فرائض سر انجام دیتے جائیں۔ حضرت امام صاحبؒ نے پنجتار سے نکلنے کے بعد پہلی رات ٹوپی اور دوسری کھبل میں بسر فرمائی وہاں سے مجاہدین کو امب روانہ فرما دیا اور آپ ملا شاہ سیدؒ اور دیگر رفقاء کی معیت میں ستھانہ تشریف لے گئے۔ والیانِ ستھانہ سیّد اعظم شاہ اور سید اکبر شاہ نے آپکا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے حضرت امام صاحبؒ نے ان کے سامنے جہاد کے عنوان پر ولولہ انگیز خطاب فرمایا اور سیّد صاحبؒ کی طرف سے بیعت لی۔ آپ نے ان سے امب چلنے کے لیے کہا مگر انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ فی الحال مشکل ہے پھر جب آپ بلائیں گے تو حاضر ہونے میں کوئی عذر پیش نہیں کریں گے۔ البتہ اخوند زادہ اسمٰعیل[63] آپکے ساتھ ہو گئے اور آپ کا اشارہ بھی زیادہ تر انہی کی طرف تھا۔ سیّد اکبر شاہ نے آپ کو روساء پکھلی کے متعلق خلوت میں بتایا کہ ان میں سے عنایت اللہ خاں (خانِ خیل) کمال خاں (اگروری) عبد الغفور

خان (اگروری) اور ناصر خان[۴۴] (بھٹ گرامی) کے سوا اکثر و بیشتر نفاق پیشہ معلوم ہوتے ہیں لہذا ان پہ اعتماد کرتے ہوئے قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔

حضرت امام صاحبؒ ستھانہ سے فارغ ہوئے تو رات کو امب تشریف لے گئے۔ سردار پائندہ خاں نے بستی سے باہر آکر خوش آمدید کہا اور اپنی رہائش سے دور مجاہدین کے لیے اقامت گاہ متعین کر دی۔ پنجتار میں سید صاحبؒ کے سامنے ہی یہ طے کر لیا گیا تھا کہ پائندہ کی رفاقت میں دریا کی مشرقی جانب سے پیش قدمی کر کے سکھوں کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا جائے گا لیکن حضرت امام صاحبؒ نے جب یہاں امب میں پائندہ خاں سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ ساتھ دینے پہ آمادہ نہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے ارادہ کو نہ بدلا۔ یہاں سے منزل مقصود آٹھ میل کی مسافت پہ تھی اگر آپ امب ہی سے دریا عبور کرتے تو دشمن سے جھڑپ کا امکان تھا لیکن آپ جنگ کے آغاز سے قبل مخلص مسلمانوں کی تنظیم از بس ضروری سمجھتے تھے لہذا آپ نے امب سے تین میل کے فاصلے پہ واقع چھتر بائی کے گھاٹ کا رخ کر لیا اور قبل ازیں روانگی او تمان زئی، امان زئی، جدون اور پنج بہار کی طرف اپنے خطوط اور سید صاحبؒ کی طرف سے مہری اعلام نامے دے کر ایلچی روانہ فرما دیئے۔

عبورِ دریا

چھتر بائی میں صرف ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس سے جملہ مجاہدین دن بھر میں دریا عبور نہیں کر سکتے تھے اور مصلحت کے پیش نظر یہ حضرت امام صاحبؒ کو پسند نہ تھا کہ رات کو نصف مجاہدین دریا کے اس طرف اور نصف اس طرف ہوں اس لیے مجاہدین کی ایک جماعت کو آپ نے چھتر بائی کے ایک دوسرے بالائی گھاٹ کی طرف روانہ فرما دیا کہ وہ وہاں سے دریا عبور کریں کیوں کہ اس گھاٹ پہ دو کشتیاں تھیں چنانچہ دونوں جماعتوں نے رات ساحلِ دریا پہ بسر کرنے کے بعد بوقتِ صبح دریا کو عبور کیا اور براستہ بروڈی، تنگا بانی پہنچ گئے یہاں سے بھی حضرت امام صاحبؒ نے گرد و نواح میں جہاد کے دعوت نامے ارسال فرمائے مختلف علماء نے حاضر ہو کر سات آٹھ سو آدمیوں کی پیشکش کی مگر آپ نے فرمایا کہ ابھی ضرورت نہیں جب ضرورت محسوس ہوگی انہیں بلا لیں گے البتہ مجاہدین کی تیاری میں فرق نہیں آنا چاہیے مولانا غلام رسول مہر صاحبؒ نے حضرت امام صاحبؒ کی عسکری صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

مولانا کی دقیقہ سنجی اور امعانِ نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ایک ایک چیز اور ایک ایک مصلحت پر گہری نظر تھی ۔ چونکہ راستہ سنگلاخ پہاڑیوں میں سے تھا اور میدانی علاقے کے باشندے اسے بہ آسانی طے نہیں کر سکتے تھے ، اس لیے سید صاحبؒ کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ اس طرف صرف آزمودہ کار غازی بھیجے جائیں جو طی مسافت میں ہر قسم کی مشقتیں ضبط و صبر کے ساتھ برداشت کر سکیں ، سواری کے عادی یا محتاج نہ ہوں اور انہیں امام کی نسبت انقیادِ کلّی اور اذعانِ جبلّی کا مرتبہ حاصل ہو ۔ ساتھ ہی گزارش کی کہ غازیوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک ایک ، دو دو ، تین تین روز کے وقفے سے بھیجا جائے اس میں کئی مصلحتیں تھیں مثلاً چھوٹی جماعتوں کے لیے دریا پار اترنا آسان تھا کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے میں دِقّت پیش نہیں آسکتی تھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے جیش آتے رہتے تو عام مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب ہوتی اور ان پر یہ اثر پڑتا کہ پیچھے بہت بڑا لشکر ہوگا جو چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں بٹ کر آ رہا ہے ، اس لیے حوصلہ مندی سے ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے دشمن ہر دوسرے تیسرے روز لشکروں کی آمد کا ذکر سنتے رہتے تو ان پر دہشت اور ہیبت طاری ہوتی[۶۵] ۔"

شیر گڑھ میں اگرچہ جا تو نام نے جو کہ پائندہ خاں کا جمعدار تھا مجاہدین کی تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تاہم وہاں زیادہ عرصہ تک قیام کرنا قرینِ مصلحت نہیں تھا اس لیے حضرت امام صاحبؒ نے رُستم اگردر عبدالغفور خاں کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور اگردر کی طرف روانہ ہو گئے عبدالغفور اپنی علالتِ طبع کے سبب خود تو نہ آسکا البتہ اس نے اپنے بھائی کمال خاں کو استقبال کے لیے بھیج دیا آپ نے رات ککلئی میں بسر کی اور اگلے روز عبدالغفور خاں کی اقامت گاہ پر قدم رنجہ فرمایا اسی مقام پر ارسلان خان ، احمد خاں پکھلی والا اور حیدر شاہ وغیرہ خوانین نے حضرت امام صاحبؒ کی زیارت کی اور آپ کے دستِ مبارک پر حضرت سید صاحبؒ کی امامت کی بیعت کی ۔ اس کے

بعد آپ نے گڑھی شمڈرہ کو دیگر گڑھیوں کی نسبت زیادہ مناسب خیال کرتے ہوئے، غازیوں کے قیام کے لیے تجویز فرما دیا۔ اور وہاں سے کلکئی روانہ ہوگئے اور کمال خاں کے ذمہ لگایا کہ وہ کلکئی پہنچ کر غازیوں کو شمڈرہ پہنچا دے۔ اور ملا سید شاہ کو ان قبائل میں جہاد کی تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ اخوند زادہ ملا اسمٰعیل کو بھی قبل ازیں آپ نے اطراف میں ترغیب جہاد کے لیے بھیجا ہوا تھا انہوں نے پیغام بھیجا کہ جب تک اور لشکر نہیں آئے گا یہاں کے لوگ جہاد میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پھر قریباً اسی مضمون کے خطوط سید محمد نصیر، ناصر خاں اور سید محمد علی شاہ کی طرف سے موصول ہوئے۔ حضرت امام صاحبؒ نے دوبارہ عبدالغفور خاں، احمد خاں، سید حیدر شاہ اور ارسلان خاں وغیرہ رؤسا سے گفتگو کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ سب گفتار کے غازی ہیں اور ان کے دل ایمانی غیرت وحمیت اور اخلاص و وفا سے یکسر خالی ہیں۔

ایک اور پریشانی

آپ کلکئی واپس تشریف لائے تو ایک اور مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ مجاہدین کے خزانچی کے پاس روپے اور اشرفیاں تھیں، روپے ختم ہوگئے اور اشرفیاں استعمال میں لانے کا موقعہ آیا تو اہل اگرور نے اشرفیوں کے عوض غلہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں ان کے نرخ کا علم نہیں تھا اور وہ اس وقت تک غلہ ادھار دینے کے لیے بھی آمادہ نہ تھے جب تک رؤسا میں سے کوئی انہیں اشارہ نہ کر دیتا ادھر انہوں نے یہ سیاسی فائدہ اٹھانا چاہا کہ اگر مجاہدین حبیب اللہ خاں کی حمایت پر آمادہ ہیں تو انہیں ہر سہولت بہم پہنچائی جا سکتی ہے ورنہ نہیں لیکن حضرت امام صاحبؒ مجاہدین اسلام کو صرف حبیب اللہ خاں کے لیے استعمال ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے اس تکلیف کی وجہ سے اکثر مجاہدین پریشان ہوگئے اور بعض نے واپس جانے کا مشورہ دیا سید محمد مقیم نے یہ رائے دی کہ فوراً جنگ شروع کر دینی چاہیے لیکن حضرت امام صاحب نے حلم اور حسن تدبیر کے دامن کو اس نازک موقع پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور خواجہ محمد حسن ہنسوری کو اشرفیاں دے کر سربلند خاں کے پاس بھیج دیا تاکہ ان کی وساطت سے ان کے عوض روپے حاصل کر سکیں۔

ادھر ارسلان خاں ایک جماعت کے ساتھ حبیب اللہ خاں کی امداد کے لیے جا رہا تھا۔

اس نے کہا کہ اگر آپ میں سے بھی کسی کو جہاد اور ایک مظلوم مسلمان کی مدد کا شوق ہے تو وہ بھی تیار ہو جائے، اس کے زادِ راہ اور دیگر اخراجات کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ سید محمد مقیم اور کئی لوگوں نے اجازت طلب کی اگرچہ انہیں اجازت دینا خلافِ مصلحت تھا لیکن سید صاحبؒ نے ان کی دلداری کی تاکید کی ہوئی تھی اس لیے امام صاحبؒ نے انہیں اجازت دے دی۔ چالیس غازی آپ کے پاس رہ گئے اور باقی سب ارسلان کے ساتھ چلے گئے۔ آپ اپنے پاس رہنے والے غازیوں کو لے کر ارسلان خاں کی اقامت گاہ، جسی کوٹ تشریف لے گئے۔ اب آپ نے اخوند زادہ محمد اسمٰعیل، ملا شاہ سید اور چند دیگر غازیوں کو ساتھ لے کر سربلند خاں تنولی سے ملاقات کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے اس کے پاس دو دن قیام فرمایا اور گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ سربلند خاں کا اصل مقصد پائندہ خاں تنولی پر غلبہ حاصل کرنا ہے اور بس، اگر مجاہدین کو سکھوں کے مقابلہ میں فتح و نصرت حاصل ہو تو یہ لوگ ساتھ دیں گے ورنہ نہیں۔ البتہ محمد علی شاہ کے ساتھ دینے کی صورت میں یہ بھی تعاون پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ سربلند خاں اور پائندہ خاں میں کئی نسلوں سے باہمی عداوت تھی اس لیے سربلند خاں کا اصل مقصود اپنے دشمن کا خاتمہ تھا لیکن حضرت امام صاحبؒ کی تمنا یہ تھی کہ سکھوں کے مقابلہ میں تمام مسلمان شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جائیں۔ آپ نے صورتِ حال سے حضرت سید صاحبؒ کو مطلع کرتے ہوئے لکھا:-

۱۔ دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر پائندہ خاں کی حکومت ہے گھاٹ اس کے قبضہ میں ہیں اگر دراس کے تابع ہے اگر اس سے رشتہ منقطع کر لیا جائے تو غازیوں کے لیے آمد و رفت میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

۲۔ پائندہ خاں تمام خوانینِ ہزارہ سے حشمت و شوکت میں بڑھا ہوا ہے۔ اسے مخالف بنا کر بعض دوسرے خوانین کی موافقت حاصل کرنا بالکل غلط ہوگا۔

۳۔ پائندہ خاں، حبیب اللہ خاں اور خوانینِ اگرور کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم ہے اور ہمارے غازی حبیب اللہ کی امداد کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے اور پائندہ خاں کے درمیان رابطۂ اتحاد منقطع ہو چکا ہے تو غازیوں کو مضرت پہنچانے کے درپے ہو جائیں یا کم از کم ان کی موافقت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

۴۔ زبردست خاں حوالی کشمیر کے بڑے رؤسا میں سے ہے وہ حبیب اللہ خاں کا قدیمی دوست ہے ممکن ہے حبیب اللہ خاں کے ذریعے سے زبردست خاں کے ساتھ ربط وضبط پیدا ہو جائے۔

ان مذکورہ وجوہ کے پیش نظر پائندہ خاں سے تعلقات منقطع کرنا غیر مناسب اور مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے حضرت امام صاحبؒ نے اسے پسند نہ فرمایا۔

خوانین ہزارہ میں سے آپ سر بلند خاں، سعادت خاں، احمد شاہ خاں احمد خاں شاہی خاں وغیرہ سے ملے البتہ ناصر خاں، حسن علی خاں اور محمد علی شاہ سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن تمام کے متعلق آپ کا تاثر وہی تھا جو ہم قبل ازیں ذکر کر آئے ہیں۔ کہ اگر مجاہدین کو سکھوں کے مقابلے میں فتح ونصرت ہو تو یہ بھی ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں ورنہ نہیں۔ آخر کار آپ "جویاں ستورہ" (ضلع ٹیکری) میں فروکش ہوئے سر بلند خاں نے خط لکھوا کر ناصر خاں اور سید محمد علی شاہ کی طرف ارسال فرمایا۔ اپنی طرف سے بھی ایک غازی کے ہاتھ انہیں اور ان کے اعزہ و اقارب کو خطوط بھیجے۔ ملا عصمت اللہ کو دلشی قوم اور ایک شخص کو ساداتِ کوائی کی طرف بھی بھیجا فرماتے ہیں۔

"اگرچہ خدا کے فضل سے حصولِ مقصود کی اُمید ہے لیکن ان اضلاع میں لشکر بھیجنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ یہ قدم وقت سے پہلے اٹھا لیا گیا بہتر یہ تھا کہ میں چند ساتھیوں کو لے کر آتا۔ تمام دیہات میں پھیر پھر کر جہراً اور سراً دعوتِ جہاد دیتا۔ جب رؤسا تیار ہو جاتے تو لشکر کی جگہ متعین کر کے غازیوں کو یہاں بلاتا۔ یا یہ مناسب تھا کہ زبردست لشکر بھیج کر تمام خوانین و رؤسا کی موافقت سے قطع نظر کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کی جاتی۔ خیر جو کچھ واقع ہوا، اسی کو باعثِ خیر سمجھنا چاہیے۔ اگر سید محمد مقیم کامیاب واپس آئے تو امید ہے کہ حصولِ مقصد کی صورت جلد پیدا ہو جائے گی ورنہ کچھ دیر لگے گی، اس موقع پر واپس آجانا بھی مضر ہے اور تامل و تدبر کے بغیر کام میں

ہاتھ ڈالنا خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔"

معرکہ ڈمگلہ

قبل ازیں ذکر کیا جاچکا ہے کہ اکثر و بیشتر مجاہدین ارسلان خاں کے ساتھ حبیب اللہ خاں کے بیٹے کو سکھوں کے محاصرہ سے نجات دلانے کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور حضرت امام صاحبؒ کے پاس صرف چالیس مجاہد رہ گئے تھے۔ آپ چند رفقاء کی معیت میں "جوریاں ستور" (ٹیکری) میں تشریف لے گئے اور عبداللہ خاں کو امیر مقرر کر گئے۔ اسی دوران غازیوں کے ڈمگلہ پر حملہ کرنے کی خبر مشہور ہو گئی۔ اس لیے ہزارہ کے حکمران ہری سنگھ نے بھول سنگھ کی قیادت میں تین ہزار آدمیوں کو مجاہدین کے مقابلہ کے لیے بھیج دیا۔ پھر مزید تین ہزار آدمی بھول سنگھ کی مدد کے لیے بھیج دیے حضرت امام صاحبؒ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے بھی سکھوں کو سبق سکھانے کا عزم صمیم کر لیا، چنانچہ سکھوں کے اس چھ ہزار کے عظیم لشکر کے مقابلہ میں مجاہدین تعداد میں بہت کم تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ شبخون مارا جائے۔

حضرت امام صاحب درہ بھوگڑ منگ کے سامنے، ڈمگلہ سے تین میل کی مسافت پر واقع مقام شنکیاری کے قریب ٹھہر گئے اور سید محمد مقیم رامپوریؒ کی قیادت میں غازیوں کی جماعت کو، جو کہ ایک سو افراد پر مشتمل تھی، ڈمگلہ کی طرف روانہ فرما دیا پھر جب چودہ پندرہ سو مقامی لوگ بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹیؒ، سید محمد مقیمؒ کے مشیر و نائب مقرر کیے گئے تھے۔ دیگر ہتھیاروں کے علاوہ مجاہدین کو بارود سے بھرے ہوئے نل بھی دیئے گئے اور انہیں ہدایت کی گئی کہ سکھ لشکر گاہ میں سب سے پہلے نل پھینکے جائیں اور پھر چھاپہ مارا جائے۔ اس اثناء میں بھی اگر کہیں سکھ مجمع نظر آئیں تو نل پھینک کر انہیں منتشر کیا جائے۔

سید محمد مقیمؒ بڑی سج دھج اور شان سے غازیوں کی قیادت فرماتے ہوئے سوئے منزل رواں ہوئے لیکن افسوس کہ مقامی لوگوں نے بزدلی دکھائی اور ڈمگلہ پہنچتے پہنچتے پندرہ سولہ سو میں سے صرف تین چار سو رہ گئے۔ تاہم سید موصوفؒ نے کسی پریشانی کا اظہار نہ کیا بلکہ عزم و ہمت کا پیکر بنے ہوئے آگے ہی بڑھتے گئے حتیٰ کہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

جس وجہ سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں!

حضرت امام صاحبؒ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے سب سے پہلے بارود بھرے نل سکھ لشکرگاہ میں پھینکے اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ چار پائیوں کی مدد سے خار بندی میں سے گزر کر، سکھ لشکرگاہ میں سب سے پہلے قدم رنجہ ہونے کی جرأت بھی اس جانباز سپہ سالار نے کی انہوں نے قدم رکھتے ہی اس زور سے نعرۂ تکبیر لگایا کہ سکھوں پر پریشانی کا عالم طاری ہوگیا اور وہ سراسیمہ ہو کر مختلف ٹولیوں کی شکل میں جمع ہونے لگے، جوں ہی ان کی کوئی جماعت نظر آتی مجاہدین اس پر نل پھینک کر منتشر کر دیتے اور جب وہ بھاگنے لگتے تو مجاہدین قرابینوں سے انہیں خاک و خون میں لوٹا دیتے غرضیکہ ان جانبازوں نے شجاعتوں اور بسالتوں کے ایسے ایسے جوہر دکھلائے کہ بقول سید جعفر علی نقوی ؒ:-

"رستم و اسفندیار کی داستانیں فراموش ہوگئیں اور وہ لوگ اس طرح سکھوں کے ہجوم میں گھستے تھے، جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے۔
تین چار حملوں میں انہیں (سکھوں کو) لشکر سے باہر نکال دیا۔"[۶۸]

اب مفرور مقامی لوگوں نے بھی میدان میں آنا شروع کیا۔ اس لیے نہیں کہ جہاد میں شریک ہو جائیں بلکہ اس لیے کہ مالِ غنیمت اٹھا کر بھاگ جائیں۔

سکھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے گھاس پھوس کے چند چھپروں کو آگ لگا دی۔ آگ کی روشنی میں انہیں معلوم ہوگیا کہ مجاہدین تعداد میں بہت کم ہیں اور مقامی لوگ مال و اسباب لوٹ کر فرار ہو رہے ہیں؛ چنانچہ وہ پھر منظم ہو کر میدان میں آنے لگے مولانا خیرالدین شیرکوٹیؒ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک جماعت کے ساتھ سکھوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور دوسرے غازیوں کو حکم دیا کہ زخمیوں کو اٹھا کر باہر نکل جائیں کیونکہ اس وقت مقابلہ نہ کرنا ہی قرینِ صواب تھا جب تمام غازی باہر نکل گئے تو مولانا شیرکوٹیؒ بھی آہستہ آہستہ باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ سکھوں پر اس قدر ہیبت طاری تھی کہ انہیں تعاقب کی جرأت نہ ہوئی اس معرکہ میں عبدالخالق محمد آبادی اور سید لطف علی کے علاوہ چند دیگر مجاہدین نے بھی جامِ شہادت

نوش فرمایا۔ چند زخمی ہوئے جن میں سپہ سالار سید محمد مقیم بھی تھے لیکن اس کے برعکس سکھ دو تین سو کی تعداد میں داخلِ جہنم ہوئے۔

جنگِ شنکیاری

مجاہدین کی ایک بڑی جماعت جب ڈمگلہ میں شبخون میں مصروف تھی حضرت امام صاحبؒ کو شنکیاری کے مقام پر اچانک ایک جنگ پیش آگئی۔ آپ کے جانباز رفقاء دو روز سے نانِ جویں تک کو ترس گئے تھے اب تیسرے روز جو انہیں کچھ سامانِ خورد و نوش میسر آیا تو اس سے اپنی گرسنگی کا علاج کرنے لگے کچھ مجاہد کھانے سے فراغت حاصل کر چکے تھے اور کچھ ابھی تک مصروف تھے کہ سکھوں کا ایک گروہ گڑھی شنکیاری سے باہر نکلا۔ حضرت امام صاحبؒ نے جب انہیں دیکھا تو آپ نے سمجھا کہ یہ جنگ کی نیّت سے آرہے ہیں۔ آپ نے فوراً مجاہدوں کو مورچے پکڑ کر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ شاہینیں اور بندوقیں چلنے لگیں، سکھ جب کچھ اور قریب آگئے تو غازیوں نے قرابینوں کو استعمال میں لانا شروع کر دیا اور جب بالکل قریب آگئے تو غازیوں نے اپنی شمشیروں کو بے نیام کر لیا۔ غازیوں کی شمشیروں کی جھنکار اور ان کی ضرب بے زنہار سے سراسیمہ ہو کر سکھ میدان سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

سکھ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہ اچانک پکار اٹھا، "ارے بزدلو! یہ تعداد میں بہت تھوڑے ہیں، تم ڈر کر کیوں بھاگے جا رہے ہو؟ چنانچہ وہ پھر لوٹ آئے۔ حضرت امام صاحبؒ کے ساتھ اس وقت صرف بارہ مجاہد تھے، تمام ہمالہ بن کر میدان میں جم گئے، عزیمت اور استقامت کے ان پہاڑوں نے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ سکھوں کو مار مار کر کشتوں کے پشتے لگا دیئے حضرت امام صاحبؒ اور آپ کے مٹھی بھر ان جانبازوں نے بے دریغ جسم و جان کی بازی لگاتے ہوئے تاریخ اسلام کے صفحات پر شجاعت و جوانمردی کی ایسی مثالیں رقم کر دیں جو رہتی دنیا تک جگمگاتی اور قافلۂ اہلِ حق کے دلوں کو گرماتی رہیں گی۔

سکھوں کی گولیاں موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ جن کی وجہ سے حضرت امام صاحبؒ کی قبا چھلنی ہو گئی۔ لیکن آپ کے پایۂ استقامت میں قطعاً جنبش نہ آئی۔ آپ نے

مورچے میں پناہ لی اور نہ جنگ رو کی بلکہ سینہ تان کر میدان میں جمے رہے۔ امجد خاں نے خود آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے سُن کر روایت کیا ہے کہ :-

"شنکیاری کی جنگ میں سکھ ہم سے بہت قریب آ گئے تھے۔ ایک سکھ تلوار لے کر میری طرف بڑھا، میں نے گولی سے اسے ٹھنڈا کر دیا پھر بندوق بھرنے لگا۔ اس اثناء میں دُوسرا سکھ آ گیا اسے بھی مار دیا۔ تیسری بار بندوق بھر رہا تھا تو میری انگلی پر گولی لگی اور ہاتھ بندوق کے پیالے سے ہٹ گیا۔ میں نے اس حالت میں بھی بندوق چلا دی۔ ایک اور سکھ مارا گیا۔ چوتھی مرتبہ بندوق بھرنے کا ارادہ کیا تو بارود لہو سے تر ہو گئی۔ چوتھا سکھ مجھ پر حملے کی غرض سے بڑھا مجھے یقین ہو گیا کہ اب زندہ بچنے کی کوئی صُورت نہیں میں نے خالی بندوق کا مُنہ اس کی طرف پھیر دیا۔ وہ گھبرا کر بھاگ گیا[۹]"

حضرت امام صاحبؒ کی جو انگلی مبارک زخمی ہوئی، وہ چھنگلی تھی۔ آپ اسے رفقاء کو دکھا کر مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری "انگشتِ شہادت" ہے۔ آہ! سے

هل انت الا اصبع دميت

وفى سبيل الله ما لقيت

سیّد جعفر علی نقویؒ، جو کہ آپ کے کاتبِ خاص تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ بہترین انگشتِ شہادت ہے۔ آپ نے فرمایا "ہاں اگر اللہ تعالیٰ قبول فرما لیں تو بہترین ہے، ورنہ بہت سی ضربیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہوتی"۔

اس جنگ میں حضرت امام صاحبؒ نے اپنی خداداد شجاعت کے خُوب خُوب جوہر دکھائے اور بہت سے سکھوں کو داصلِ جہنم کیا، اس معرکہ میں دو اڑھائی سو سکھ مقتول ہوئے جب کہ چھ سات مجاہدوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور دس زخمی ہوئے۔

ڈمگلہ اور شنکیاری کی ان جنگوں کی وجہ سے سکھوں پہ دہشت کا عالم طاری ہو گیا۔

کمال خانؒ اور ناصر خانؒ نے تجویز پیش کی کہ اب اگر وہ جا کر طمانیت قلب کے ساتھ مزید اقدام کے متعلق غور و فکر کرنا چاہیئے۔ حضرت امام صاحبؒ نے تجویز پسند فرمائی چنانچہ واپسی کے موقع پر شنکیاری، بلغہ، خاکی، بیرکھنڈ اور ملک پورہ کے قریب سے گزرے جب سکھوں کی کوئی گڑھی قریب آتی تو حکم دیتے کہ زور سے نقارہ بجا کر دشمنان اسلام کو خبردار کردو کہ اگر کوئی مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو میدان میں آجائے۔ اوگی میں آپ نے آٹھ روز قیام فرمایا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ سکھوں کی گڑھیوں پر شبخونوں کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ اسی اثناء میں سید صاحبؒ کا حکم پہنچا کہ ہندوستان سے بہت سے غازی آگئے ہیں لہٰذا آپ تشریف لے آئیں۔ آپ کلکئی، شیر گڑھ، ننگا پانی اور بروٹی سے ہوتے ہوئے دریا پر پہنچ گئے اور وہاں سے امب، ستھانہ، کھبل اور ٹوپی سے ہوتے ہوئے پنجتار تشریف لے آئے۔

جنگ اوتمان زئی

پنجتار سے نکلنے کے بعد مختلف مقامات کے دورے کرتے ہوئے حضرت امام صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ جب دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر سوات زیریں کے مشہور مقام خہر کی طرف جا رہے تھے تو درانیوں کی طرف سے ایک لشکر مقابلے کے لیے ادھمکا، لیکن یہ حضرات انہیں طرح دیتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ابھی تک خہر میں ہی مقیم تھے کہ خبر ملی کہ درانیوں کا چار ہزار کا لشکر اپنے توپ خانہ سمیت دریائے لنڈہ عبور کر کے اوتمان زئی میں ڈیرے ڈال چکا ہے اور مجاہدین سے برسر پیکار ہونے کے لیے موقع کی تلاش میں ہے۔

جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو امیر المجاہدین حضرت سید صاحبؒ نے بھی کوئی اقدام کرنے سے قبل [illegible] کرام اور خوانین سے مشورہ کیا۔ غور و فکر کے بعد طے پایا کہ اوتمان زئی میں موجود لشکر سے معرکہ آرائی کے بجائے پشاور کا رخ کرنا چاہیئے تاکہ فتنہ و فساد اور بغاوت کی جڑوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ لیکن ابھی ٹوٹی ہی پہنچے تھے کہ اوتمان زئی پر شبخون مارنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا؛ چنانچہ حسب ضرورت مجاہدین میں ساز و سامان حرب کے علاوہ، ایک سیر آٹا، ایک پاؤ گھی اور ایک پاؤ گڑ فی کس کے حساب سے سامان خورد و نوش بھی تقسیم کر دیا گیا۔ پورے لشکر کے دو فریق

بنا دیئے گئے، جن میں سے ایک کی قیادت کے فرائض سیّد صاحبؒ انجام دے رہے تھے اور دوسرے کی قیادت کے فرائض امام صاحبؒ۔

سیّد جعفر علی نقویؒ نے لکھا ہے کہ لشکرِ اسلام بوقتِ عصر ٹوپی سے روانہ ہوا۔ باہر نالے پر پہنچ کر نفوسِ قدسیہ پر مشتمل یہ جماعت نمازِ عصر کے لیے صف آرا ہوئی۔ سیّد صاحبؒ نے امامت کے فرائض سرانجام دیئے۔ نماز سے فراغت کے بعد سیّد صاحبؒ نے امام صاحبؒ کی جماعت کو الوداع کیا اور ایک ایک نمازی سے مصافحہ فرمایا۔ امام صاحبؒ کی جماعت کو دشمن کے میمنہ پر شب خون مارنا تھا جب کہ میسرہ سیّد صاحب کی جماعت کے لیے تھا۔ دونوں جماعتوں کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ درّانیوں میں سے جو شخص ہتھیار سے تمہارا مقابلہ کرے اسے قتل کر دو، جو کوئی امان طلب کرے اسے چھوڑ دو اور جو راہِ فرار اختیار کرے اس کا تعاقب مت کرو۔ حضرت امام صاحبؒ اپنی جماعت کی قیادت کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے اور اپنی جماعت کو لے کر بڑی دانائی سے درّانی لشکرگاہ کے میمنہ پر پہنچ گئے۔ جہاں سے صرف ایک گولی کی مار کا فاصلہ تھا، آپ نے اپنے جانباز رفقاء کو تاکید فرما دی کہ جب تک میں گولی نہ چلاؤں تم میں سے کوئی بھی نہ چلائے۔ وہاں سے صرف ان غازیوں کو ہمراہ لے کر، جن کے پاس سواری کا انتظام تھا، آپ آگے بڑھے، جب عین دشمن کے لشکر پر پہنچ گئے تو سنتری نے آپ کو دیکھ کر آواز دی کہ کون ہے؟ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نے دوسری بار آواز دی مگر آپ پھر بھی نہ بولے۔ اس نے تیسری بار آواز دی۔ جب تیسری بار بھی اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے گولی چلا دی اور چیختا چلاتا ہوا کہ سیّد صاحبؒ کے غازی آ گئے اپنے لشکر کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت امام صاحبؒ نے بلند آواز سے نعرۂ تکبیر لگایا اور غازیوں کو حملہ کا حکم دے دیا۔ آپؒ تمام لشکر سے آگے تھے۔ درّانی گولہ انداز نے توپ داغنی چاہی۔ امام صاحبؒ تمام ساتھیوں سمیت زمین پر بیٹھ گئے۔ اس تدبیر سے توپ کا گولہ غازیوں کے سروں کے اوپر سے گزر گیا اور کسی قسم کا نقصان نہ ہوا۔ پھر آپ نے اس مستعدی سے حملہ کیا کہ دوسری بار گولہ چلنے سے قبل ہی گولہ انداز کو تہ تیغ کر دیا اور توپ اپنے قبضہ میں لے لی۔ تمام درّانی میدانِ جنگ سے فرار ہو کر ایک ٹیلے پر پناہ گزین ہو گئے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ نے لکھا ہے کہ :-

"گولہ انداز نے مہتابی روشن کر کے چاہا کہ توپ چلائے۔ مولانا (امام صاحبؒ) نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹ کر فرمایا کہ توپ کا منہ دُرّانیوں کے لشکر کی طرف پھیر دو۔ اس نے مارے خوف کے آپ کے حکم کی تعمیل کی اس کے بعد آپ نے دوسری توپ پر بھی قبضہ کر لیا اور گولہ انداز کو تلوار سے قتل کر دیا۔"[۲]

"سید صاحبؒ کو اطلاع ملی تو اس فتح پر بارگاہِ الٰہی میں دوگانہ شکر ادا کیا۔ توپیں اس ٹیلے کے سامنے نصب کرا دیں۔ جن پر دُرّانی جمع ہو گئے تھے غازیوں کو دو حصوں میں بانٹ کر صبح کی نماز ادا فرمائی۔ خیال تھا کہ دُرّانی جمع ہو کر حملہ کر دیں گے سید صاحبؒ نے جا بجا چار مورچے بنوا کر غازیوں کو ان میں بٹھا دیا اور اس تواتر سے باڑھیں مارنے کی تاکید کر دی، کہ دُرّانیوں کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی پھر خود توپ کھنچوا کر ایک اونچی جگہ لائے، بھروائی، خود نشست باندھی اور میرزا حسین بیگ کو حکم دیا کہ اب گولے پھینکو، پہلے ہی گولے سے دو سوار گرے۔ دُرّانی ٹیلے سے اُتر کر پیچھے کی طرف جا بیٹھے"۔

"دن بھر لڑائی جاری رہی خدا کے فضل سے کسی غازی کے خراش تک نہ آئی پاس تالاب تھا غازی اسی پر وضو کرتے اور دو جماعتوں میں بٹ کر نمازیں پڑھتے رہے۔ مغرب کے وقت دُرّانیوں کی طرف سے گولیوں کی شدید بارش شروع ہو گئی اس وقت تک شاہینیں بھی انہوں نے فراہم کر لی تھیں۔ اب یہ تجویز پیش ہوئی کہ دشمن پر بائیں جانب سے حملہ کیا جائے ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ میرزا حسین بیگ نے توپ سے گولے پھینکنے شروع کیے دُرّانیوں کے نقصانِ جان کا حال تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن پھر ان کی شاہینوں سے کوئی گولہ نہ آیا"۔[۲]

اس جنگ میں حضرت امام صاحبؒ نے اپنی خداداد شجاعت و جوانمردی کا خوب مظاہرہ

فرمایا۔ اپنے سے چار گنا زیادہ لشکر کو شکستِ فاش دی۔ اس کی توپوں اور دیگر سامانِ حرب کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا، بے شمار دُرانیوں کو اپنی شمشیرِ بُرّاں سے قتل کرتے ہوئے کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے اور بے شمار مالی نقصان سے بھی دشمن کو دوچار ہونا پڑا اور لُطف یہ کہ حزبِ محمدؐ اور اللہ کے سپاہیوں میں سے کسی کو بھی کوئی تکلیف نہ پہنچی مگر افسوس کہ ایسی بے مثال فتح و نصرت کے باوجود آستین کے سانپ عین وقت پر ڈس گئے۔ سردار عالم خاں رئیس اوتمان زئی اور اہلِ خیبر نے یہاں بھی میر جعفر کا سا کردار ادا کیا اور دُرّانیوں سے مل گئے۔ اس وجہ سے اب پشاور کی طرف پیش قدمی کرنا ناممکن تھا اور بغیر اس کے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کہ مجاہدین واپس چلے جائیں اور کسی مناسب موقع کا انتظار فرمائیں۔

اب میدانِ جنگ سے غازیوں کو حفاظت کے ساتھ واپس لے جانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ سیّد صاحبؒ نے چند غازیوں کو مورچوں میں بٹھا کر باقی تمام کو درختوں کے اس جھنڈ میں جمع ہونے کا حکم دیا جو اوتمان زئی سے دو تین فرلانگ کی مسافت پر تھا۔ جب اکثر و بیشتر مجاہد اس جھنڈ میں جمع ہو گئے تو سیّد صاحب نے پچاس آدمیوں کو روک لیا اور باقی تمام کو حضرت امام صاحبؒ کی قیادت میں جلالہ روانہ فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد مورچہ میں پناہ گزین غازیوں کے پاس سیّد اکبر شاہ محمدؒ کو بھیجا اور انہیں بھی بُلا لیا جب تمام واپس آ گئے تو پھر خود سیّد صاحبؒ بھی واپس تشریف لے آئے۔ دوسری طرف دُرانی شب خون کے خوف سے تمام رات کانپتے رہے۔ جب سورج طلوع ہوا تو بستی کے لوگوں نے دُرّانیوں کو بتایا کہ غازی تو واپس چلے گئے ہیں لیکن ان پر خوف و ہراس اس قدر طاری تھا کہ انہیں دوپہر تک بستی کے قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ وہ یہی سمجھتے رہے کہ غازی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔ نامعلوم کب ہم پر ٹوٹ پڑیں؟

اس جنگ کے بعد سیّد صاحبؒ نے امام صاحبؒ کے مشورہ سے میاں جی محی الدین چشتی[۵] کو نو آدمیوں[۶] کے ہمراہ ایک نامہ[۷] دے کر امیرِ بخارا کے پاس روانہ فرمایا اور ایک قرآن مجید مُطلّا بطور ہدیہ بھی بھیجا۔

بیعتِ شریعت

سیّد صاحبؒ اور امام صاحبؒ نے جب سرحد کو قدوم میمنت لزوم سے نوازا تو انہیں یقین تھا کہ اہلِ سرحد دیگر

مسلمانانِ ہند کی نسبت تدین اور اسلام کے لیے جانثاری میں آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن دو سال بعد ہی یہ خوش فہمی غلط ثابت ہوئی اور معلوم ہوگیا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی محض رسمی ہے اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اہلِ سرحد کا ایک اجتماع بلا کر انہیں احکامِ شریعت کی پابندی اور غلط رسم و رواج کے ترک کی تلقین کی جائے۔ اجتماع کے انعقاد کے لیے جب مناسب جگہ کے انتخاب کا مسئلہ زیرِ غور آیا تو فتح خاں رئیس پنجتار اور اشرف خاں رئیسِ زیدہ نے اپنے اپنے علاقے میں اجتماع منعقد کرنے کی پیش کش کی، چنانچہ پنجتار کو زیادہ مناسب خیال کرتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ یہاں اجتماع منعقد کیا جائے۔

یہ اجتماعِ عظیم یکم شعبان ۱۲۴۴ھ (۶ فروری ۱۸۲۹ء) بروز جمعۃ المبارک منعقد ہوا جس میں زعماء، خوانین اور اکابر کی کثیر تعداد کے علاوہ قریباً دو ہزار علماء کرام اور اتنے ہی ان کے تلامذہ نے شرکت فرمائی۔ افتتاحی تقریر سید صاحب کی تھی اور آپ کے بعد امام صاحبؒ نے نہایت ولولہ انگیز اور ایمان خیز خطاب فرمایا۔

" غالباً ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۲۹ء) کو جمعہ کے دن پھر ایک اجتماع ہوا جو فتح خاں کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا۔ خان نے ان سب کو بیعتِ شریعت کی ترغیب دی اور انہوں نے بہ طیبِ خاطر نظامِ اسلامی کی پابندی قبول کر لی۔ پھر مختلف علاقوں کے لیے سید صاحبؒ نے قاضی مقرر فرما دیئے۔ مولوی سید محمد حبّان کو قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ ملا قطب الدین ننگرہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا۔ اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر ہو گئے۔ وہ قریہ بہ قریہ اور دیہ بہ دیہ دورہ کرتے رہتے جہاں کوئی امر خلافِ شرع پاتے، اس کا انسداد کرتے۔[۷۹]"

اس بیعت کے خاطر خواہ نتائج ثابت ہوئے اگرچہ کتبِ تاریخ تمام تفصیلات بیان کرنے سے تو خاموش ہیں تاہم متفرق روایات سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برکات و حسنات کے اعتبار سے یہ بیعت کس قدر نتیجہ خیز ثابت ہوئی مثلاً محمد جعفر تھانیسریؒ لکھتے ہیں۔

" ان تمام علاقوں میں جن کے باشندوں نے یہ عہد کیا تھا، کوئی مرد و عورت

سے بے نمازی نہ رہا اور تمام تنازعے اور مقدمے از روئے شرع محمدی قاضیوں کے فیصل ہونے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ملک رشک عرب ہو گیا۔ چوری چکاری، زناکاری اور قتل و خون وغیرہ جرائم کا نام نہ رہا۔ شریعت پر چلنے کی برکت سے لوگوں کے دلوں میں ایسا ایمان اور اخلاص پیدا ہوا کہ انہوں نے خود شکرِ اسلام کو اپنی پیداوار کا عشر (دسواں حصہ) دینا قبول کر لیا۔"

مجاہدین نے چونکہ ہنڈ کے بجائے پنجتار کو اپنا مرکز بنایا جس کی وجہ سے فتح خاں رئیس پنجتار کی عزت میں اضافہ ہوا لیکن رئیس سرحد خادے خاں کو یہ اعزاز پسند نہ آیا بلکہ وہ آتش حسد میں یہاں تک جل اٹھا اور احکام و قوانینِ شریعت کے نفاذ سے اسے یہاں تک نفرت و عداوت پیدا ہو گئی کہ اس نے مجاہدین کے خلاف سکھوں سے ساز باز کرنے میں بھی ذرہ بھر تامل نہ کیا۔ سید صاحبؒ ابھی غور ہی فرما رہے تھے کہ کیا طریق اختیار کیا جائے، اسی دوران آپ کو معلوم ہوا کہ خادے خاں لڑائی کے انتظام مکمل کر کے اشرف خاں رئیس زیدہ سے برسرپیکار ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔ سید صاحبؒ نے امام صاحبؒ کو دو سو مجاہدین کے ہمراہ مصالحت کے لیے روانہ فرما دیا۔ آپ جب مانیری پہنچے تو شاہ منصور کی طرف سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ آپ فوراً وہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اشرف خاں اپنے لشکر کی معیت میں زیدہ کی طرف رختِ سفر باندھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ خان بھائی! یہ لڑائی کیوں؟ ہم تو حضرت سید صاحبؒ کے حکم سے مصالحت کے لیے آئے ہیں۔" اشرف خاں نے کہا۔ ہم تو سید صاحب کے فرمان کے مطابق اپنی گڑھی میں اقامت پذیر تھے کہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی خادے خاں بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت میدان میں آ گیا بامر مجبوری ہمیں بھی دفاع کرنا پڑا لیکن ہم ابھی تک اپنی سرحدوں پر بھی پہنچنے نہ پائے تھے کہ خادے خاں کے لشکر کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آنا شروع ہو گئی۔ ہم نے بھی جواب دیا کچھ مدت لڑائی کے بعد خادے خاں کے ساتھی میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کر گئے۔ اور خدا تعالےٰ کے فضل سے ہم ہر تکلیف سے محفوظ و مصئون رہے مگر افسوس کہ یہ نیک بخت و خوش اخلاق اور مجاہدین

سے کے ساتھ اُلفت و محبت رکھنے والا رئیس مسرت و شادمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جا رہا تھا کہ شاہ منصور کے قریب پہنچ کر گھوڑا گر گیا اور زین کا ہرنا خاں صاحب کے سینہ میں پیوست ہو کر جان لیوا ثابت ہوا۔ میت کو زیدہ سے جایا گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خادے خاں بھی وہاں پہنچ کر شریکِ جنازہ ہوا۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد تمام لوگ مسجد میں جمع ہوئے، تو امام صاحبؒ نے آپ کے محامد و مناقب بیان فرمائے اور پھر مغفرت کے لیے دعا فرمائی۔

خادے خاں کو نفرت و عداوت نے اس حد تک پہنچا دیا کہ اس نے مجاہدین کے خلاف سکھوں سے امداد کی درخواست کر دی۔ سکھوں نے اس کی درخواست کو قبول کیا اور اس کی امداد کے لیے ایک بہت بڑا لشکر بھیج دیا۔ یہ لشکر فرانسیسی جنرل انٹورا کی زیرِ کمان، راستے میں واقع دیہاتوں میں ظلم و تشدد کا بازار گرم کرتے ہوئے پہلے حضرو پہنچا۔ مولانا تھانیسریؒ نے فرانسیسی جنرل انٹورا کی فوج کشی کی تفصیل، ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

سردار خادے خاں کے حسب الطلب سکھوں کی فوج کا ایک فرانسیسی جنرل انٹورا صاحب مع فوج کثیر کے پہلے "حضرو" پہنچا۔ سردار خادے خاں ایک گھوڑا اور باز اور چند کتے معمولی نذرانے لے کر حضرو میں اس کے پاس حاضر ہوا اور دیگر خوانینِ سمہ کی شکایت کر کے درخواست کی کہ حضور دریائے اباسین عبور کر کے ملک سمہ میں رونق افروز ہوں اس وقت سب سردارانِ سمہ اطاعت اختیار کریں گے۔ انٹورا صاحب دریائے اباسین سے عبور کر کے اول ہنڈ ریاست خادے خاں میں آیا اور وہاں سے پنجتار تک آنے کا قصد کیا۔ انٹورا صاحب کے ساتھ تقریباً دس پندرہ ہزار فوج اور توپیں اور شاہینیں تھیں۔ جب سید صاحبؒ کو اس کے آنے کی خبر پہنچی تو آپ نے ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان جہاں سے پنجتار میں آنے کی راہ تھی ایک دیوار طویل تقریباً قد آدم تیار کرا کے اس میں مورچے اور برج بنوائیں اس دیوار کی تیاری میں خندق مدینہ کی طرح خود سید صاحبؒ اپنے ہاتھوں سے کام کیا کرتے تھے۔

جب یہ دیوار تیار ہو گئی تو جا بجا ہندوستانی اور قندھاری آدمیوں کے اس پہ پہرے مقرر کیے گئے۔ ایک رات کو سو سواران حسایہ نے خبر دی کہ لشکر کفار درہ کوہ تک آ پہنچا

سکھوں کی آمد کی خبر آگ کے شعلے اور دھواں ہوتا تھا۔ جس قدر وہ آگے بڑھتے تھے گاؤں اور بستیوں کو پھونکتے اور مسجدوں اور مدرسوں کو گراتے جاتے تھے چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور لنگ وغیرہ پرانے ظالموں کی راہ کی علامت بھی مؤرخوں نے یہی آگ اور دھواں لکھی ہے اور ہماری مہذب سرکار نے بھی ملک یاغستان کے واسطے آتش زدنی کا وہی چنگیز خانی قاعدہ اختیار کر رکھا ہے۔

اللّٰھم زد فزد"

جب پنجتار پر سکھوں کے حملہ کا خطرہ شدت اختیار کر گیا تو قریباً نو سو مجاہدین بھی مقابلہ کے لیے تیار تھے سید صاحبؒ نے مولانا خیر الدین شیر کوٹی کو تین سو مجاہدین کا قائد بنا کر درہ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا تھا، جو کہ درہ سے باہر خیمہ زن ہو گئے تھے۔ حضرت امام صاحبؒ نے آیۃ بیعت الرضوان کی تلاوت فرما کر نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایسا معرکۃ الآرا خطاب فرمایا کہ ہر ایک کا دل چاہنے لگا کہ وہ اسی قسم کی بیعت کر کے جانثاری کا مظاہرہ کرنے، چنانچہ چند لمحات بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ہزار ہا آدمیوں نے سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور کفار کے مقابلہ میں شجاعت و جوانمردی کے خوب خوب جوہر دکھانے کے عزم کا اظہار کیا۔ سکھوں کی فوج مجاہدین کے مغربی طرف دو اڑھائی کوس کے فاصلہ پر تھی جنرل انٹورا نے دوربین سے جب لشکر اسلام کا جائزہ لیا تو اس پر غازیانِ اسلام کے رعب و دبدبہ کے باعث ہیبت طاری ہو گئی۔ اس نے فوراً خادوسے خاں کو بلا کر کہا کہ "تو نے مجھے دھوکہ دیا ہے کہ پنجتار میں تھوڑے آدمی ہیں۔ اب یہ ٹڈی دل لشکر کہاں سے آ گیا؟ مجھ میں تو اس کے مقابلے کی تاب نہیں۔" لیکن حملہ نہ کرنے کی صورت میں اسے رنجیت سنگھ کی طرف سے باز پرس کا بھی خطرہ تھا اس لیے وہ بادلِ نخواستہ پہاڑ سے نیچے اترا اور فوج لے کر نئی دیوار کو گرانے کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا احمد بیگؒ دیوار کی نگرانی کے لیے متعین تھے انہوں نے پہاڑ پر چڑھ کر مجاہدین کو سکھوں کے اس حملہ سے باخبر کیا۔ سید صاحبؒ نے گولہ انداز اور افسر شاہین کو، لشکر کفار کی یلغار کو روکنے کے لیے گولے اور شاہینیں چلانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی لشکر اسلام نے بڑی متانت اور وقار کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی۔ مجاہدین کے جوش و خروش کو دیکھ کر جنرل انٹورا اور اس کے ساتھیوں نے راہِ فرار ہی میں عافیت محسوس کی اور میدان سے بھاگنا شروع

کر دیا۔ مجاہدین نے درہ کے انتہا تک ان کا تعاقب کیا اور کئی بھاگتے سکھوں کو واصل جہنم کر دیا۔

اگرچہ وقتی طور پر سکھوں کا خطرہ ٹل گیا اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو فتح و نصرت نصیب ہوئی لیکن سازشوں اور شرارتوں کے خاتمہ کے لیے سید صاحبؒ نے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی جس میں امام صاحبؒ کے علاوہ کئی دوسرے اکابر نے بھی شرکت فرمائی اس مجلس میں سب سے پہلے جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد اور اہمیت و عظمت پر سید صاحبؒ نے روشنی ڈالی اور سردار یار محمد خاں اور خادے خاں کی سازشوں کا دکھ بھرے لہجے میں ذکر کیا۔ سید صاحب کی اس تقریر کو سن کر سردار فتح خاں نے تجویز پیش کی کہ " آپ سمہ کے علماء اور سادات و خوانین کا ایک اجتماع بلا کر یہی باتیں بیان فرمائیں۔ چونکہ وہ لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر چکے ہیں لہذا ان کی معاونت سے اس سلسلہ میں ضرور کوئی مؤثر اقدام کیا جا سکتا ہے۔" سید صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ یہاں کے رئیس ہیں، لہذا ہماری طرف سے، آپ دعوت نامے ارسال فرما دیں؛ چنانچہ جمعۃ المبارک کے دن کا تعین کر کے جگہ جگہ آدمی بھیجے گئے، جس کے نتیجہ میں تین ہزار سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ پنجتار کی بستیوں کے لوگوں نے اشیاء خورد و نوش جمع کر کے امام صاحبؒ کے پاس پہنچا دیں کیوں کہ دعوت کا اہتمام بھی آپ کے سپرد تھا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا، قاضی احمد اللہ میرٹھی نے خطبہ پڑھا۔ نماز کے بعد سید صاحبؒ نے تقریر فرمائی، جس میں آپ نے پہلے تو حصولِ معاش کے لیے لوگوں کی مساعی لیکن فریضہ جہاد سے غفلت کا ذکر کیا، پھر دار الحرب ہند سے ہجرت کر کے دار الامان میں جا کر کفار سے جہاد کرنے کے حکم کا تذکرہ فرمایا اور اسی ضمن میں رنجیت سنگھ نے مسلمانوں پر آلام و مصائب کے جو پہاڑ توڑے، ان کی طرف بھی اشارہ کیا۔ پھر آپ نے خاص طور پر علماء سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

"آپ لوگوں نے ہمیں جگہ دی، ہمارے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی آپ کے مشورے کے مطابق اس مقام سے جہاد شروع ہوا۔ اب آپ مساعی جمیلہ سے دست کش ہو رہے ہیں، حالانکہ آپ کو وارث الانبیاء کہا گیا ہے اس کا سبب کیا ہے۔"[۸۵]

سید صاحبؒ کی اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا، آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے اور دل میں اسلامی حمیت کے دریا رواں ہو گئے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد دُعا فرمائی اور پھر امام صاحبؒ سے تقریر فرمانے کے لیے کہا اور لوگوں سے بھی کہا کہ آپ جو فرمائیں اسے بھی ذرا سُنیئے، اگر کسی کے دل میں شک ہو تو اسے صاف کر لیا جائے۔ حضرت امام صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے خطابت کا خصوصی ملکہ عنایت فرمایا ہوا تھا۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے آپ نے اپنے مخصوص فصیح و بلیغ انداز میں جب خطابت کے جوہر بکھیرنا شروع کیے تو گویا سامعین میں سے ہر ایک کی زبان پر فیضی کا یہ شعر رقص کرنے لگا۔

چہ جادوئیست ندانم بطرزِ گفتارش
کہ بازبستہ زبانِ سخن طرازاں را

آپ نے اپنی اس تقریر میں یہ آیۂ مبارکہ

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ"[۸۶]

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسُول کی اطاعت کرو، اور اپنے میں سے صاحب امر لوگوں کی بھی۔

کی انتہائی شرح و بسط کے ساتھ تفسیر فرمائی۔ پھر علماء سے استفسار کیا کہ کیا اس آیت شریفہ کی رُو سے امام کی اطاعت فرض نہیں؟ سب نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر آپ نے فرمایا! باغی کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ سب نے اسے باغی قرار دیا۔ پھر آپ نے بغاوت کے سلسلے میں شرعی احکام کے متعلق استفتاء پیش فرمایا تو تمام علماء نے فتویٰ دیا کہ باغیوں کی سزا قتل ہے اور اس فتویٰ پر اپنی مہریں بھی ثبت کر دیں۔ پھر امام صاحبؒ نے علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"سارا قصور آپ کا ہے، اس ملک کے تمام خوانین آپ کے تابع فرمان ہیں لیکن آپ لوگ اظہارِ حق میں مداہنت سے کام لیتے رہے ہیں، ورنہ یہ خرابی پیدا نہ ہوتی"[۸۷]

پھر آپ نے نہایت عجز و الحاح کے ساتھ دُعا فرمائی تمام لوگ اس میں شریک تھے علماء کے فتویٰ کی روشنی میں جب خادے خان کا قلق و اضطراب اور اپنی مشؤمیت کا احساس بڑھ

گیا تو وہ مجلس سے اٹھ کر چلا گیا اور اپنے احوال کی اصلاح کے بجائے وہ اور بھی زیادہ باغیانہ رویہ اختیار کرتا گیا۔ عصر کی نماز کے بعد اکثر مہمان رخصت ہو گئے، جو ٹھہرے ان میں خادے خاں بھی تھا۔ سید صاحبؒ نے رات کو اور پھر جب صبح رخصت ہو رہا تھا، اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ قطعاً راہِ راست پر نہ آیا۔

جنگِ پنجتار

جنرل ونٹورا جب میدانِ جنگ سے فرار ہو کر لاہور گیا تو دربار میں اس پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا چنانچہ اس نے اپنی شکست کے داغ کو مٹانے کے لیے پنجتار پر دوبارہ حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں ادھر خادے خاں اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ایک دن شب گرد سواروں نے نماز فجر کے وقت دشمن کے درہ پر پہنچ جانے کی خبر دی۔ نماز سے فراغت کے بعد سید صاحبؒ نے بھی مجاہدین کو تیاری کا حکم دے دیا۔ دن روشن ہوا تو صوابی و مانیری کی طرف دھوئیں کے اٹھتے ہوئے بادل نظر آنے لگے جو کہ سکھوں کی غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کی غمازی کر رہے تھے۔ سید صاحبؒ نے مرزا احمد بیگ کو نعل کلئی والی دیوار کی طرف بھیجتے ہوئے حکم دیا تھا کہ سکھ لشکر جب درے کے اندر آ جائے اس سے مقابلہ نہ کیجئے بلکہ دائیں طرف سے پہاڑ پر چڑھ جانا ہو گا۔ جب سکھوں کا لشکر مجاہدین سے برسرِ پیکار ہو جائے تو تم نے عقب سے حملہ کرنا ہو گا۔ اس جنگ میں مجاہدین کی تعداد نو سو کے قریب تھی جب کہ لشکر کفار دس ہزار کے لگ بھگ تھا۔

حضرت امام صاحب نے موقع و محل کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے آیت بیعتِ رضوان کی تلاوت کی پھر اس بیعت کے فضائل نہایت مؤثر و دل نشین انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس وقت سب صاحب جو حاضر ہیں، حضرت امیر المومنین کے دستِ مبارک پر اس نیتِ خالصہ سے بیعت کریں کہ ان شاء اللہ زندہ جان آج ہم مقابلۂ کفار سے نہ ہٹیں گے یا ان کو مار کر فتح پائیں گے یا اسی میدان میں شہید ہو جائیں گے۔ اس میں جو صاحب بہ مشیت ایزدی شہید ہوں گے، شہادتِ کبریٰ کا درجہ پائیں گے۔ اور جو زندہ بچیں گے وہ اعلیٰ مراتب کے غازی ہوں گے۔"[88]

سب سے پہلے آپ نے بیعت کی، پھر ان غازیوں نے جو سید صاحبؒ کے قریب تھے۔ جو غازی آپ تک نہیں پہنچ سکتے تھے انہوں نے ان غازیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے جنہوں نے سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست میں ہاتھ دے رکھے تھے اسی طرح دیگر تمام غازیوں نے بھی بیعت کر لی۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے ننگے سر اور انتہائی خشوع و خضوع اور عجز و الحاح کے ساتھ دُعا فرمائی جس کی تاثیر سے تمام عاشقانِ پاک طینت پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مولانا مہر مرحوم کے الفاظ میں سنیئے

"راوی کہتا ہے کہ اس دُعا کی تاثیر و برکت سے سب پر ایسا عالم طاری ہو گیا ہر ایک اپنی ہستی سے گزر چکا تھا۔ تمام بھائی کمال تپاک اور اشتیاق سے ایک دوسرے کے گلے مل مل کر خطائیں معاف کرانے لگے۔ دنیوی علائق کا ہر نقش ان کے صفحاتِ قلوب سے محو ہو چکا تھا۔

ایک دوسرے کو وصیّت کرتے تھے تو یہ نہیں کہ ہمارے بال بچوں کا خیال رکھنا یا اقربا کو سلام پہنچانا یا ہماری جائیداد کو سنبھالنا اور یادگاریں قائم کرنا، حاشا! ثم حاشا!! وہ قدوسی رضائے باری تعالیٰ میں اس طرح گم ہو چکے تھے کہ عالم ناسوت کے ساتھ گویا ان کا رشتہ ہی باقی نہیں رہا تھا سب کی زبانوں پر صرف ایک توحید اور ایک پیام تھا اور وہ یہ کہ بھائیو! ہم شہید ہو جائیں یا زخموں سے چُور ہو کر گر پڑیں، ہمیں اٹھانے یا سنبھالنے سے بے پروا ہو کر فرصت و مہلت کے لمحے کو صرف آگے بڑھنے، لڑائی جیتنے اور دشمن کو مار بھگانے کے لیے وقف رکھنا۔

اللہ اللہ! للّٰہیت کے یہ گہرہائے شب چراغ تھے جنہیں سید صاحبؒ آج سے سوا سو برس پیشتر ظلمت زار ہند سے نکال کر سرحد لے گئے تھے کہ شاید ان کی جلا سے یہ سرزمین از سرِ نو منوّر ہو جائے"[۵۹]

ادھر جنرل ونٹورا سلیم خاں سے مڑتا ہوا تو تالی کے قریب پہنچ گیا اور اس نے تو تالی کے ٹیلے پر چڑھ کر دُوربین سے گرد و نواح کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اگرچہ مجاہدین کی تعداد اڑھائی تین ہزار

سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ونٹورا کو یوں محسوس ہوا کہ دونوں طرف کے ٹیلوں پر مجاہدین کا ایک انتہائی عظیم الشان لشکر جرار فروکش ہے؛ چنانچہ یہ منظر دیکھ کر بادلِ نخواستہ اس نے اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خادے خاں نے جنرل ونٹورا کو یقین دلا رکھا تھا کہ مجاہدین کی کسی بڑی جماعت سے مقابلہ نہیں ہوگا کیوں کہ پنجتار میں وہ انتہائی معمولی تعداد میں ہیں۔ مجاہدینِ اسلام کی ہیبت و شوکت سے مرعوب ہو کر جب اسے اڑھائی تین ہزار کی تعداد بھی ایک بہت بڑی تعداد نظر آنے لگی تو وہ خادے خاں سے بہت خفا ہوا بالآخر جب ونٹورا نے اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دے دیا تو اسلامی فوج بھی برات کی طرح خوش خوش آگے بڑھی سکھ فوج کے ابتدائی دستے دفاعی دیوار کو پیوندِ خاک کرنے کے ناپاک عزم سے آگے بڑھے۔ امیر المومنین حضرت سید صاحبؒ نے میرزا حسین بخش کو شاہینوں سے سکھ لشکر پر گولے پھینکنے کا حکم دیا۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بیٹھے ہوئے اللہ کے سپاہی بھی اب نیچے اتر آئے اور تمام لشکرِ اسلام میدان میں جم کر کھڑا ہو گیا۔ سکھ بار بار ان کی ہمت کی مضبوط و مستحکم چٹان سے ٹکرائے اور ہر بار پیچھے ہٹ گئے۔ مجاہدین کے تابڑ توڑ حملوں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا پہاڑوں کا ایک ایک پتھر حرکت میں آ گیا ہے۔ ونٹورا نے غازیوں کی شجاعت کو دیکھا تو اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا اس معرکہ میں دو سکھ واصلِ جہنم ہوئے اور حزبِ محمدؐ میں سے کسی کے خراش تک نہ آئی۔ سید صاحبؒ کو مجاہدین کی فتح و نصرت اور سکھوں کی میدان سے پسپائی کا علم ہوا، تو وہی کیا جو اللہ والے کیا کرتے ہیں یعنی اپنے رب کے حضور جھک گئے اور شکرانے کے دو نفل ادا فرمائے ادھر ونٹورا کے دل پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ وہ فوراً لاہور بھاگ گیا۔

تنگی پر شبخون

خادے خاں کا رویہ اگرچہ انتہائی مایوس کن تھا، تاہم سید صاحبؒ اس کے راہِ راست پر آ جانے کے ہی متمنی تھے سید صاحبؒ نے ایک قاصد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ پنجتار میں آ کر مجھ سے ملاقات کرو۔ خادے خاں نے جواب دیا کہ میں پنجتار کے بجائے سلیم خاں میں آ سکتا ہوں۔ سید صاحبؒ نے اسے بھی تسلیم فرمالیا اور تین سو غازیوں کو ہمراہ لے کر تشریف لے گئے۔ خادے خاں چار یا پانچ دن کے بعد ساٹھ سواروں اور چار سو پیادوں کے ساتھ آیا۔ ملاقات کے لیے جگہ کا تعین ہوا تو سید صاحب جانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن کئی

دیگر اصحاب اور حضرت امام صاحبؒ نے اختلاف کیا اور خود جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ سید صاحبؒ نے اجازت عنایت فرمادی تو حضرت امام صاحبؒ ایک سو غازیوں کے ہمراہ مقررہ جگہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تو آپ نے تین آدمیوں کو خادے خاں کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا کہ مولانا تین چار آدمی لے کر آجائیں۔ لیکن غازیوں نے اصرار کیا کہ آپ تین چار ساتھیوں کے ساتھ نہ جائیں کیوں کہ خادے خاں بڑا عیار آدمی ہے لیکن آپ نے ان تمام ساتھیوں کو سمجھا کر مطمئن کر دیا کہ آپ کسی قسم کے اندیشہ میں مبتلا نہ ہوں خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا۔ بہرکیف حضرت امام صاحبؒ تین چار رفقاء کی معیت میں خادے خاں کے پاس تشریف لے گئے اور جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

حضرت امام صاحب! خان بھائی! آپ سے یہ توقع نہ تھی کہ اپنے مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں سکھوں کو لے آئیں گے۔ آپ نے یہ بہت بُرا کیا ہے۔ یہ تو بغاوت کے مترادف ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ آپ اپنے اس کیے پر ندامت کے آنسو بہائیں اور بارگاہِ ایزدی میں توبہ کریں۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اللہ غفور رحیم ہے وہ گناہوں پر قلم عفو پھیر دے گا ورنہ ذلت و رسوائی کے بغیر کچھ نصیب نہ ہوگا۔

خادے خاں! مولانا خفا نہ ہونا۔ ہم لوگ رئیس و حاکم ہیں سید بادشاہ کی طرح کوئی ملّا مولوی نہیں اور ہمارا اور سید صاحبؒ کا راستہ الگ الگ ہے ہم پٹھان لوگ سید بادشاہ کی شریعت پہ ہرگز ہرگز نہیں چل سکتے۔ لہٰذا جو کچھ ہمارے خلاف کرنا چاہیں ضرور کریں۔

الغرض اس گفتگو کے بعد خادے خاں کی طرف سے مکمل مایوسی ہو گئی۔ ادھر چند روز کے بعد خوانین کے مختلف قبائل کے لوگوں نے سید صاحبؒ کے پاس آکر شکایات کیں کہ جب سے ہمارے علاقوں میں درانی در آئے ہیں، ان لوگوں نے ہمارے امن و چین اور سکون کو غارت کر دیا ہے۔ اگر آپ کچھ مجاہدین کو روانہ فرما دیں تو بستی پر آپ کا قبضہ کرا دیں گے اور اس طرح پشاور کے راستہ سے رکاوٹ بھی دور ہو جائے گی۔ سید صاحبؒ نے اس سلسلہ میں دیگر خوانین سے بھی

مشورہ کیا۔ تمام نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ سید صاحبؒ نے امام صاحبؒ کی قیادت میں تین سو مجاہدوں کا لشکر ترتیب دے کر تنگی کی طرف روانہ فرما دیا یاد رہے ارباب بہرام خاںؒ اور مولانا امیر الدین ولایتیؒ بھی اس سفر میں امام صاحبؒ کے ہمراہ تھے بوقت عشاء یہ قافلہ روانہ ہوا ایک مسافت میں یہ سفر ناممکن تھا اس لیے صبح کے وقت ایک نالے پر پڑاؤ ڈال دیا گیا اطلاع کے لیے دو آدمیوں کو عصر کے وقت تنگی بھیج دیا گیا اور باقی مجاہد اندھیرا ہونے پر روانہ ہوئے جب تنگی بالکل نزدیک آگیا تو گاؤں کے لوگوں کو بھیجا گیا جو کہ ہمراہ تھے انہیں کچھ فاصلے پر چار زرہ پوش سوار ملے ان سے گفتگو کے بعد حضرت امام صاحبؒ اور آپ کے معاونین ارباب بہرام خانؒ اور مولانا امیر الدین ولایتیؒ کو ساتھ لے گئے اس وقت یہ انکشاف ہوا کہ ایک گروہ پہلے فیصلہ پر کاربند نہیں رہا بلکہ اس کے خلاف درانیوں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہے اگر ان حالات میں حملہ کیا جائے تو ان لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جو درانیوں کے مخالف ہیں۔ حضرت امام صاحبؒ یہ صورتِ احوال دیکھ کر انتہائی رنجیدہ ہوئے۔ کچھ احباب نے اہل تنگی سے سختی سے پیش آنے کا مشورہ دیا لیکن ارباب بہرام خانؒ اور مولانا ولایتی صاحبؒ نے سب کو روک دیا کیونکہ یہ احباب سرحد کے رسم و رواج سے واقف تھے اس لیے انہوں نے خیر و عافیت کے ساتھ بستی میں جانے کی اجازت دے دی۔ اور لشکرِ اسلام بھی وہاں سے بخیریت واپس آگیا یہ ۱۵ محرم ۱۲۴۵ھ (۱۷ جولائی ۱۸۲۹ء) کا واقعہ ہے۔

تسخیرِ قلعۂ ہنڈ

خادے خاں کے کردار کی ادنیٰ سی جھلک گزشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے یعنی اس نے سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ بیعت کو توڑ کر بغاوت کی بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی برگشتہ کرنے کی کوشش کی، سکھوں سے ساز باز کر کے انہوں مسلمانوں کے مقابلہ میں لے آیا ان سفاکوں نے صدہا گاؤں نذرِ آتش کر دیئے، مساجد و مدارس کو تباہ و برباد کر دیا اور دیگر بے شمار تباہیوں اور بربادیوں سے نہتے مسلمانوں کو دوچار کر دیا واقعہ تنگی کے بعد مجاہدین کے سامنے اب تین راستے تھے۔

(۱) موت پر بیعت کر کے سردارانِ پشاور سے لڑائی۔

(ب) خادے خان کی سرکوبی۔

(ج) ستھانہ کے بجائے پنجتار میں نئے مرکز کا قیام۔

غور و فکر کے بعد طے پایا کہ سب سے پہلے منافق خادے خان کی تعذیب و تادیب کے سامان فراہم کر کے اس کے خرخشے کو مٹا دیا جائے اور ہمیشہ کے لیے اس سے نجات حاصل کر لی جائے اس مقصد کے لیے پانچ سو بہادر مجاہدین کا انتخاب کیا گیا۔ اس حزب الٰہی کی قیادت کی سعادت بھی شیرِ خدا حضرت امام صاحبؒ کو نصیب ہوئی اور جناب ارباب بہرام خانؒ کو ہی نائب امیر متعین کیا گیا۔ اس معرکہ میں "سُنتِ توریہ" پر خوب عمل کیا گیا۔ سید صاحبؒ اور امیر و نائب امیر کے علاوہ کسی دوسرے مجاہد کو قطعاً اس بات کا علم نہیں تھا کہ کس طرف کا قصد ہے؟ اس لشکرِ اسلام کو روانہ کرتے ہوئے سید صاحبؒ نے بلند آواز کے ساتھ فرمایا۔ آپ گڑھی امان زئی ہو کر جائیں ہم بھی آپ کے پیچھے پنجتار آتے ہیں۔ سامانِ خورد و نوش خچروں پہ اور سیڑھیاں و قلابے وغیرہ شلیتوں میں لپیٹ کر اونٹوں پر سوار کرا کے بھیجنے کا بندوبست کر دیا گیا۔ عوام اور مجاہدین آخر وقت تک یہی سمجھتے رہے کہ پنجتار ہی منزلِ مقصود ہے حضرت امام صاحبؒ بازار (ستھم) اور گڑھی امان زئی کے راستہ ترکئی پہنچے اور ارباب بہرامؒ خان شیوہ سے ہو کر ترکئی پہنچے۔ ترکئی سے ہنڈ کا فاصلہ گیارہ بارہ میل تھا۔ حضرت امام صاحبؒ نے غازیوں کو فوراً دو وقت کا کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور مغرب کے بعد ترکئی سے پنجتار جانے کے قصد کا اظہار فرمایا تاکہ ترکئی کے باسیوں میں سے بھی کسی کو کوئی شُبہ لاحق ہونے کا احتمال نہ رہے۔ دو میل کی مسافت پر نمازِ عشاء ادا کی گئی۔ پھر گھوڑے وغیرہ کے سواروں کو پنجتار کی طرف بھیج دیا اور امام صاحبؒ خود ہنڈ کے اس بھتے کی طرف روانہ ہوگئے۔ جس طرف دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہاں سے ہنڈ سات کوس کی مسافت پہ تھا۔ میدانی علاقہ تھا۔ جہت و سمت کا علم تھا اور نہ آبادی کا اور پھر شبِ دیجور کی ظلمت اس پہ مستزاد۔ خادے خان کے برادرِ عم زاد محمد بیگ خان راہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ لیکن کچھ مسافت طے کرنے کے بعد وہ بھی راستہ بتانے سے معذور ہوگئے اگست کا مہینہ تھا اور موسمِ گرما کی شدت اپنے جوبن پہ، اگرچہ رات کا وقت تھا تاہم پیاس کی شدت سے حلق کانٹا ہوئے جاتے تھے اور سب سے زیادہ یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر صبح سے پیشتر

ہنڈ نہ پہنچا گیا تو مقصد فوت ہو جائے گا جب چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی اور رات کا بہت تھوڑا حصّہ باقی رہ گیا تو مناسب یہ سمجھا گیا کہ صبح ہونے سے قبل کسی ایسے مقام پر پہنچ جانا چاہیے، جہاں تمام دن چھپ کر گزارہ کر لیا جائے اور حملہ اگلی رات تک ملتوی کر دیا جائے۔ اس تصفیہ کے بعد مجاہدین مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ امام صاحبؒ بھی پہلے تو ایک جگہ پر ٹھہر گئے۔ لیکن پھر ایک جہت کا تعین کر کے توکلاً علی اللہ اس طرف چل دیئے۔ اللہ پر توکل رنگ لایا اور اتفاق سے ایک ایسا راہ گیر مل گیا جو ہنڈ کی طرف بخوبی راہنمائی کر سکتا تھا؛ چنانچہ صبح کاذب کے وقت آپ اپنے ڈیڑھ سو غازیوں کی جماعت کے ہمراہ ہنڈ کے تالاب پر پہنچ گئے۔

یہ تالاب ہنڈ کے قریب ہی صرف ایک گولی کی زد پر تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد آپ نے اپنے باقی ساتھیوں کا انتظار شروع کر دیا اور یہ اس لیے بھی کہ سیڑھیاں وغیرہ انہی کے پاس تھیں اور ان کے بغیر قلعہ کی دیواروں کو پھاندنا بہت دشوار تھا۔ بڑی دیر کے انتظار کے بعد جب ان کی طرف سے مایوسی ہو گئی اور ادھر سپیدۂ سحر بھی نمودار ہونے کے لیے بے قرار تھا تو اس عظیم سپہ سالارِ اسلام نے ایک جدید پلان (۱۸۲۷ء) تشکیل دیا وہ یہ کہ آپ نے ان ڈیڑھ سو غازیوں کو، جو آپ کے ہمراہ تھے پانچ دستوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک دستہ اپنے پاس رکھا اور باقی چار کا شیخ ولی محمد کو قائد بنایا اور انہیں حکم دیا کہ آپ انہیں لے کر قلعہ کے دروازہ کے باہر کے دو طرفہ گنّے کے کھیتوں کو مورچے کے طور پر استعمال کیجیے۔ جب دروازہ کھول دیا جائے تو بندوقیں چلا کر فوراً اندر داخل ہونے کی کوشش کیجیے۔ ہم بھی بندوقوں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فوراً پہنچ جائیں گے۔ شیخ ولی محمد نے تینوں دستوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھیتوں میں بٹھا دیا اور خود چوتھے دستے سمیت، دروازے کے قریب ہی کھیت کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ یہ انتظامات جب پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو قلعے میں سے ایک گدھے کے ہنہنانے کی آواز آئی، پھر مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی اس کے بعد قلعے کے اندر کے ایک آدمی نے چوکیدار سے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ چوکیدار نے جواب دیا کہ سید صاحبؒ کے حملے کی خبر تھی، اس لیے میں خاں کے حکم کے بغیر دروازہ کھولنے کی جسارت نہیں کر سکتا اس نے

کہا اب تو صبح کی اذان بھی ہو چکی ہے حملہ ہوتا تو رات کو ہوتا اب کیا ہو گا۔ چوکیدار نے مزید اطمینان کے لیے ایک آدمی سے مکان کی چھت پر چڑھ کر ادھر اُدھر دیکھنے کے لیے کہا لیکن ابھی تک تاریکی موجود تھی، اس لیے کیا نظر آ سکتا تھا؟ حضرت امام صاحبؒ اپنے دستے کے ہمراہ تالاب کے پاس اور باقی غازی گنے کے کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے۔ آخرکار دروازہ کھلا اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ آدمی اس طرف گیا جدھر کوئی غازی نہ تھا۔ شیخ ولی محمد صاحبؒ چونکہ قلعے کے دروازے کے بالکل قریب تھے اس لیے دروازہ کھلتے ہی آپ اندر داخل ہو گئے ملا قطب الدین نے فوراً قرابین چلا دی۔ جس کی آواز سن کر حضرت امام صاحبؒ اپنے رفقاء سمیت نعرۂ تکبیر بلند فرماتے ہوئے قلعہ کے اندر آ گئے۔ اسی لمحہ بکھرے ہوئے غازیوں کی ایک جماعت بھی آ پہنچی۔ جس کے نعرہ ہائے تکبیر سے در و بام لرز اٹھے حضرت امام صاحبؒ نے جب قلعہ میں قدم رکھا تو اعلان کرا دیا خبردار کوئی شخص باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جو لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہیں گے ہمیں ان سے کوئی سروکار نہ ہو گا ہم صرف خادے خاں کے لیے آئے ہیں۔

خادے خاں کو بعض لوگوں نے ایک رات پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ سید بادشاہ کا لشکر حملہ آور ہونا چاہتا ہے لہذا محتاط رہو۔ وہ یہ سن کر مضحکہ اڑانے لگا کہ نامرد اور بزدل لوگ اپنی عورتوں سے باتیں سن کر مجھے ستانے آ جاتے ہیں ورنہ سید بیچارے کی کیا ہستی ہے کہ ادھر کا رخ کرے وہ دردیش تو نانِ جویں تک کو ترستا ہے، میرے مقابلہ کی کیا تاب رکھتا ہے اسے دراصل یقین تھا کہ راستے میں واقع دیہات کے لوگ مجاہدین کو ادھر کا رخ کرتے دیکھ کر فوراً اس تک خبر پہنچائیں گے لیکن اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ موت کا آہنی شکنجہ جب کسی کی گردن کا حلقہ بننے والا ہو تو کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا اور نہ کوئی تدبیر کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

صبح سویرے ہی خواب خرگوش میں مدہوش خادے خاں کو جب قرابینوں کی آواز سنے بیدار کیا تو ہوش کے ناخن لینے کا وقت جا چکا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور سراسیمگی کے عالم میں اپنے آدمیوں کو کمربندی کا حکم دینے لگا، لیکن وہ تو پہلے ہی ڈر کے مارے اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے، اس کے بعد کیا ہوا؟ "وقائع احمدی"، "سوانح احمدی"،

"منظورۃ السعداء" اور "عبرۃ لاولی الابصار" وغیرہ کتب تاریخ میں جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں ان میں کچھ اختلاف ہے لیکن بہر آئینہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ خادے خاں غازیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد امام صاحبؒ نے قلعہ پر پہرہ لگا دیا تاکہ باہر سے کوئی شخص قلعہ میں نہ داخل ہو۔ اور ارباب بہرام خاں، شیخ ولی محمد وغیرہ کو بھیجا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر مستورات کو تسلی دے دو کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ خاں کا بڑا بیٹا تو کسی طرح راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا بھوسے والی کوٹھڑی میں چھپا ہوا تھا اس سے بھی کوئی تعرض نہ کیا گیا بلکہ اسے بھی حفاظت کے ساتھ زنان خانے میں بھیج دیا گیا۔ خاں کی لاش کو اس کے وارثوں کے مطالبہ پر ان کے سپرد کر دیا گیا، انہوں نے اسے قلعہ سے آٹھ نو سو قدم کے فاصلے پر آبائی قبرستان میں دفن کر دیا۔ خادے خاں کے اہل و عیال کو قطعاً کوئی تکلیف نہ دی گئی بلکہ انہیں رہا کر دیا گیا۔ قلعہ ہنڈ کی تسخیر غازیوں کی بے پناہ عسکری صلاحیتوں اور حضرت امام صاحبؒ کی بے مثال شجاعت وجوانمردی اور کمال تدبر وحسن تدبیر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس معرکے میں خادے خاں کے علاوہ صرف ایک اور آدمی مارا گیا تھا اور وہ ایک کسان تھا جو کہ ہل سے کر کھیتوں کو جا رہا تھا اس نے کسی غازی کو دیکھ کر شور مچانا چاہا تھا مگر عبداللہ خاں رامپوریؒ نے بجلی کی سی تیز رفتاری کے ساتھ کود کر اس کا کام تمام کر دیا۔ دشمن کے یہ دو آدمی مارے گئے مگر غازیوں میں سے کسی کے خراش تک بھی نہ آئی تھی۔ وللہ الحمد

جنگ زیدہ

قلعہ ہنڈ کی تسخیر کے بعد اس علاقہ میں مجاہدین کی مخالفت بہت بڑھ گئی، فتح کے بعد حضرت امام صاحبؒ ابھی تک قلعہ پر قابض تھے کہ خادے خاں کا بھائی امیر خاں سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ قلعہ ہنڈ مجھے مرحمت فرما دیجئے میں ہمیشہ احکام شریعت کا پابند اور آپ کا مطیع فرمان رہوں گا۔ ایک طرف تو یہ سید صاحبؒ کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلا رہا تھا اور دوسری طرف پشاور کے حاکم یار محمد خاں سے ساز باز میں بھی مصروف تھا؛ چنانچہ اس نے یار محمد کو بارہ ہزار روپیہ بطور رشوت ادا کرنے کے وعدہ پر اسے اپنی امداد پر آمادہ کر لیا۔ یار محمد سید صاحبؒ سے دشمنی رکھتا تھا۔ اس نے موقع کو غنیمت سمجھا اور چار سرداروں کی قیادت میں، امیر خاں کی ریاست

کے صدر مقام ہریانہ میں تین سو سواروں کو بھیج دیا کچھ عرصہ بعد خود یار محمد خاں بھی کچھ توپوں، چند شاہینوں، دو ہاتھیوں، بہت سے اونٹوں کے علاوہ ایک عظیم لشکر سمیت موضع ہریانہ میں آگیا ہریانہ میں داخل ہوتے وقت اس نے بڑے زور شور سے توپیں چلانے کا حکم دیا تاکہ ان کی آواز سن کر سید صاحبؒ کے معاونین پہاڑوں میں چھپ جائیں۔

نماز مغرب کے بعد سید صاحبؒ نے خاص خاص احباب و رفقاء کی میٹنگ بلائی اور جنگ کے متعلق مشورہ کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف تجاویز پیش ہوئیں لیکن کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہ ہو سکا آخر کار سید صاحبؒ فرمانے لگے "تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ صبح کو بستی کے کنارے قبرستان والے میدان میں مقابلہ ہوگا"۔ امام صاحبؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ آپ شہر پناہ کے مناسب مقامات پر پہرہ داروں کو متعین فرما دیجئے باقی مجاہدین کو آرام کرنے کی اجازت عنایت فرما دی لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ ذرا مستعد رہنا۔ عشاء کی نماز کے بعد سید صاحبؒ اور امام صاحبؒ نے کھانا تناول فرمایا۔ فراغت کے بعد امام صاحبؒ سے بھی آرام فرمانے کے لیے کہا گیا۔ لیکن ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ سید صاحبؒ نے آواز دی۔ ایک مجاہد حاضر ہوئے ان سے کہا میاں صاحبؒ (امام صاحبؒ) کو بلائیے۔ آپ تشریف لائے تو فرمایا کہ شبخون کی تجویز زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے اس لیے آپ بستی سے باہر گڑھی میں قیام فرمائیے ہم وہاں آدمیوں کو بھیج دیتے ہیں آپ گڑھی تشریف لے گئے تو سید صاحبؒ نے تین سو غازی اور چار سو ملکی روانہ فرما دیئے انگی کے وقت حسب معمول سید صاحبؒ نے ہر ایک کو گیارہ گیارہ دفعہ سورۃ قریش پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنے کا حکم دیا۔ امام صاحبؒ نے غازیوں کو گڑھی کے باہر میدان میں جمع کیا اور بڑے عجز و الحاح کے ساتھ دیر تک برہنہ سر دعائیں مصروف رہے پھر ایک رہبر کی راہنمائی میں سوئے منزل چل پڑے۔

گڑھی سے باہر قدم رنجہ ہوتے ہی امام صاحبؒ نے غازیوں اور ملکیوں کی الگ الگ جماعتیں تشکیل فرما دی تھیں۔ غازیوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کرکے ہدایت فرمائی کہ سب سے پہلے توپوں اور شاہینوں کی جگہ پر حملہ کیا جائے گا؛ چنانچہ جب توپوں سے گولہ باری ہونے لگی تو امام صاحبؒ نے غازیوں کی ایک جماعت کو دائیں اور دوسری کو بائیں جانب پیش قدمی کا حکم دیا۔

اور تیسری جماعت کی خود قیادت فرماتے ہوئے عین سامنے سے معرکۂ کارزار میں شجاعت و بسالت کے جوہر دکھانے لگے۔ اُدھر سے مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی لیکن چشمِ فلک نے یہ عجب نظارہ دیکھا کہ اسلام کے اس عظیم فرزند اور عظیم ترین جرنیل نے تھوڑی سی مدت میں دشمن کی پانچ توپوں پر قبضہ کر لیا چھٹی توپ وہاں سے کچھ دور تھی، وہ بڑی تیزی سے آگ اُگل رہی تھی، امام صاحبؒ نے چالیس پچاس بندوقچیوں اور قرابینچیوں کو اس کے عقب سے حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ انہوں نے نہ صرف توپ پر قبضہ جما لیا بلکہ دو گولہ اندازوں کو بھی گرفتار کر لیا تھوڑی دیر بعد یار محمد کا ایک مصاحب بھی غازیوں نے پکڑ لیا اور استفسار پر یار محمد کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ کنڈلوہ کی جانب متعین توپ کے پاس تھا اسے گولی لگی اور ساتھی اسے اٹھا کر میدان سے باہر لے گئے۔ غازیوں نے بھی توپ سے چند فائر کیئے پھر انہوں نے فائر بندی کر کے میدانِ جنگ کا جائزہ لینا شروع کیا تو اکثر و بیشتر خیمے خالی پائے۔ اگرچہ یقین ہو چکا تھا کہ فتح و نصرت نے غازیانِ اسلام کے قدم چوم لیے ہیں تاہم اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ یار محمد کہیں پھر حملہ نہ کر دے امام صاحبؒ نے غازیوں کو توپوں کے پاس ہی رہنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا مظہر علی عظیم آبادیؒ[۱۰۱] اور پیر خاں مولائی ہنڈ سے ستر اسی غازیوں کی مزید کمک لے کر آ گئے مگر مجاہدین نے تو پہلے ہی دشمن کے چھکے چھڑا دیئے تھے، انہوں نے بتایا کہ ہم نے راستہ میں یار محمد کے لشکریوں کو دیکھا کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہے تھے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اس نازک موقع پر قلعے کو چھوڑ کر آنا خلافِ مصلحت ہے لہٰذا آپ واپس تشریف لے جائیں۔

اس معرکہ میں مجاہدین کے ہاتھوں میں بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ امام صاحبؒ نے جب مالِ غنیمت ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا تو مندرجہ ذیل اشیاء جمع ہو گئیں: ایک ہاتھی، ساٹھ ستر اونٹ، قریباً تین سو گھوڑے، پندرہ سولہ شاہینیں، چھ توپیں اور بے شمار تلواریں اور بندوقیں، پلاؤ کی دیگیں، خشک میوہ کے ڈھیر، جوتے، بستر اور خیمے وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ کچھ خیموں سے عورتیں بھی برآمد ہوئیں جنہیں یار محمد کے سپاہی تعیش کے لیے زبردستی پکڑ لائے تھے۔ امام صاحبؒ نے انہیں فوراً ان کے گھروں میں بھیج دیا۔ یار محمد خاں بری طرح زخمی ہو گیا تھا، اسے اس کے آدمی جب میدانِ جنگ سے اٹھا کر لے گئے تو ابھی ہریانہ اور دو ڈھیر کے درمیان ہی پہنچے تھے کہ وہ فوت

ہو گیا۔ اس کی میت کو پشاور دفن کیا گیا۔ اس معرکہ میں مجاہدین صرف سات سو تھے جب کہ درانیوں کی فوج آٹھ دس ہزار تھی۔ دشمن کے سات بڑے بڑے سرداروں کے علاوہ قریباً تین سو سپاہی بھی مارے گئے جب کہ صرف دو مجاہدین نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اس کامیابی کا تمام تر سہرا حضرت امام صاحبؒ کے سر ہے کہ ان کی بے مثال شجاعت، حسن تدبیر اور عسکری صلاحیتوں کی بدولت اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بہت بڑی کامیابی سے سرفراز کیا۔ مولانا غلام رسول مہرؒ رقمطراز ہیں:-

> "اتنے تھوڑے نقصان کے ساتھ اتنے کثیر الانفار اور ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس لشکر کو ایسی سخت شکست دینا یقیناً ایک عظیم الشان کارنامہ تھا، جسے بڑے بڑے جرنیلوں کی بہترین فتوحات کے مقابلے میں بے تکلف فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی یگانہ صلاحیت قیادت اور مہارتِ فنونِ حرب کا اندازہ ہو سکتا ہے"

اب ایک بات تنقیح طلب باقی ہے کہ یہ معرکہ کس تاریخ کو پیش آیا۔ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ نے جنگِ زیدہ کی تاریخ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ بروز دوشنبہ ذکر کی ہے اور غالباً انہوں نے یہ "منظورہ" کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے لیکن اس روایت کی صحت مشکوک معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہفتہ ۵ ربیع الاول کو تھا یا ۱۲ کو اور ایسے کئی قرائن ملتے ہیں جن کے پیشِ نظر اس جنگ کی تاریخ ۵ ربیع الاول تو قرار دی جا سکتی ہے ۱۵ نہیں۔ مثلاً ۱۰ ربیع الاول کو سید صاحبؒ نے پشاور کے بعض مشہور علماء کی خدمت میں ایک مکتوب گرامی ارسال فرمایا، جس میں خادے خان اور یار محمد خان کے یکے بعد دیگرے قتل ہونے کا ذکر ہے، اسی طرح سلطان محمد خان کی طرف بھی ایک اعلام ارسال فرمایا اس پر ۸ ربیع الاول درج ہے۔ بنا بریں ۵ یا ۶ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ (۴ یا ۵ ستمبر ۱۸۲۹ء) کو جنگ زیدہ کی تاریخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۵ ربیع الاول کی تاریخ صحیح نہیں۔ مولانا غلام رسول مہرؒ کی بھی یہی تحقیق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

امب اور عشرہ کے معرکے جس طرح ریاست امب کشمیر کی طرف جانے

واسطے راستہ پر واقع ہونے کے باعث نہایت اہمیت کی حامل تھی، اسی طرح نواب پائندہ خاں تنولی والئی امب کی شخصیت بھی بہت اہم تھی یہ سکھوں سے کافی عرصہ سے برسرِ پیکار تھا ادھر سیّد صاحبؒ کے ساتھ بھی کچھ راہ و رسم پیدا کر چکا تھا۔ جنگِ زیدہ کے بعد سیّد صاحبؒ پکھلی کے مظلوم باشندوں کی مدد کا ارادہ رکھتے تھے دوسری طرف کشمیر کی طرف پیش قدمی کر کے وہاں کے مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم و استبداد کے طوفانِ بدتمیزی سے نکال کر امن و چین کے ساحل سے بھی آشنا کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں پائندہ خاں کی طرف سے تعاون ضروری تھا لیکن پائندہ خاں کے دل و دماغ کی صحیح کیفیت واضح نہیں تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی شکوک و اوہام میں مبتلا ہے اس لیے ضروری تھا کہ اس سے رابطہ قائم کر کے اس کے شکوک کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ جنگِ زیدہ کے بعد مجاہدین کھبل سے ہوتے ہوئے جب ستھانہ پہنچے تو سیّد صاحبؒ نے پائندہ خاں کی طرف پیغام بھیج کر ملاقات کا وقت اور مقام متعین کر لیا۔ روانگی سے قبل سیّد صاحبؒ نے امام صاحبؒ سے مشورہ کیا کہ زیادہ آدمیوں کا ہمراہ لے جانا سوءِ ظن کا موجب تو نہ بنے گا ؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اگرچہ زیادہ آدمیوں کا ساتھ لے جانا قرینِ صواب نہیں تاہم تمام آدمیوں کا ستھانہ میں چھوڑ جانا بھی قطعاً موزوں نہیں بلکہ مناسب یہ ہے کہ آپ تمام کو ساتھ لے چلیں اور مقامِ ملاقات سے تھوڑے فاصلے پر جن کو چاہیں ہمراہ لے لیں اور جن کو چاہیں چھوڑ جائیں۔
سیّد صاحبؒ نے امام صاحبؒ کے علاوہ گیارہ اور مجاہدین کو ساتھ لیا اور روانہ ہو پڑے۔ امام صاحبؒ نے از خود بطورِ احتیاط چوبیس آدمیوں کا انتخاب کر کے انہیں دریا کے کنارے کی اوٹ میں مقامِ ملاقات کے قریب جا کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر پائندہ خاں نے بھی دامنِ کوہ میں بہ غرضِ اسکا کے جنگل کے پاس پانچ سو پیادے چھپا رکھے تھے پائندہ خاں سے ملاقات کے بعد سیّد صاحبؒ پکھلی کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتے تھے امام صاحبؒ کو لشکر کا امیر اور مولانا خیر الدین شیر کوٹیؒ کو نائب امیر بنایا گیا۔ امام صاحبؒ نے پائندہ خاں کو اطلاع دی کہ ہم پکھلی جانا چاہتے ہیں اس لیے آپ کشتیاں تیار رکھیں۔ پائندہ خاں نے جواب دیا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ میں امیر المومنین کا فرمانبردار ہوں، لیکن اگر آپ لوگ میری ریاست میں سے گزریں گے تو ہزارہ کا گورنر ہری سنگھ مجھے تنگ کرے گا لہٰذا آپ کوئی اور راستہ اختیار کریں۔

امام صاحبؒ نے دوبارہ لکھا کہ ایک طرف تو آپ امیرالمومنین کی اطاعت کا اقرار کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے علاقہ سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے یہ کیسی اطاعت ہے؟ اگر آپ اپنے علاقے سے گزرنا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں تو ہم کسی دوسرے گھاٹ سے گزر جائیں گے لیکن اس صورت میں بھیٹ گلی سے گزرنا پڑے گا اور وہ بھی آپ کی ریاست میں ہے لہٰذا یہاں سے گزرنے کی اجازت دیجئے؟ پائندہ خاں نے جواب دیا کہ امب ہو یا بھیٹ میں اپنے کسی علاقے سے گزرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا ورنہ لڑائی ہو جائے گی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سید صاحبؒ کو صورتِ حال سے مطلع فرمایا تو سید صاحب نے خود پائندہ خاں کو خط لکھا۔ لیکن وہ نہ صرف اپنی ضد پہ بدستور قائم رہا۔ بلکہ اس نے لڑائی کی تیاری بھی شروع کر دی سید صاحبؒ پانیتی ہوتے ہوئے چنگئی تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر امام صاحبؒ کو امیر لشکر بنایا اور فرمایا کہ آپ لڑائی کی ابتداء نہ کریں فریقِ مخالف اگر جنگ کا آغاز کر دے تو پھر آپ اپنی حفاظت کے لیے مناسب اقدام کرنے کے مجاز ہوں گے پھر سید صاحبؒ نے دُعا فرمائی اور لشکر کو مداخیل کی طرف روانہ فرما دیا۔

امام صاحبؒ چنگئی سے روانہ ہو کر گباٹی میں ٹھہرے اور پھر وہاں سے دبگڑہ کی طرف چل پڑے دو سو غازیوں کو دبگڑہ چھوڑا اور باقی کو ساتھ لے کر فروسہ تشریف لے گئے پائندہ خاں نے عشرہ کی حفاظت کے لیے کوہ کنیرڑی پر مورچے بنوائے۔ اس طرح ستھانہ، فروسہ اور دبگڑہ میں فروکش غازیوں کے درمیان رشتۂ اتصال منقطع کرنا بھی اس کے لیے آسان تھا لیکن امام صاحبؒ بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ آپ پہلے ہی غازیوں کی ایک جماعت کو کوہِ کنیرڑی کی طرف روانہ فرما چکے تھے اس جماعت کا امیر آپ نے جناب ارباب بہرام خاں کو بنایا اور ساتھ ہی فرمایا کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو شیخ بلند بخت [۹۳]، مولانا امیرالدین اور امام خاں خیر آبادی [۹۴] بالترتیب امارت کے فرائض انجام دیں گے۔ اگر یہ تینوں حضرات بھی جامِ شہادت نوش فرما جائیں تو پھر مجاہدین اسلام کو اختیار ہو گا کہ وہ جسے پسند فرمائیں اپنا امیر منتخب کر لیں۔ اللہ اللہ سنتِ رسول کا کس قدر خیال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر امام صاحبؒ کو شاید وہ حدیثِ رسول یاد آ گئی ہو جو صحیح بخاری میں درج ذیل الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

عَنْ عبد اللہ بن عمرؓ قَالَ	حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ
اَمر رَسُولُ اللہ صَلّی اللہُ عَلَیہِ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ میں زید

وَسَلَّمَ فِي غزوة موتة زيد بن حارثة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان قتل زيد فجعفر و ان قتل جعفر فعبد الله بن رواحة قال عبد الله كنت فيهم في تلك الغزوة الحديث[95]

بن حارثہؓ کو امیر مقرر کرکے فرمایا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائے تو جعفرؓ (امیر ہو) اور اگر جعفرؓ شہید ہو جائے تو عبد اللہ بن رواحہؓ (امیر بنے) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں بھی اس غزوہ میں ان (غازیوں) میں تھا۔ الحدیث

الغرض امام صاحبؒ نے اس جماعت کو حکم دیا کہ وہ کنبر ڑی پر قبضہ کے بعد تم نے عشرہ کی طرف پیش قدمی کرنا۔ ستھانہ سے غازیوں کو بلانے کے لیے آپ نے سید احمد علی کو روانہ فرما دیا اور خود فروسہ سے پیش قدمی کا پروگرام بنایا۔ آپ کی یہ سکیم بھی فوجی نقطۂ نظر سے بہت خوب تھی پائندہ خاں کو جب علم ہوا کہ غازی کنبر ڑی پر تسلط جما چکے ہیں تو وہ بہت سٹپٹایا اور پریشان ہو کر اس نے صلح کا جال پھیلایا اور امام صاحبؒ کی طرف پیغام بھیج دیا کہ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور آئندہ فرمانبرداری کا وعدہ کرتا ہوں لہٰذا آپ میری غلطی معاف فرما دیں اور کل صبح پانچ سات ساتھیوں کے ہمراہ امب تشریف لے آئیں تاکہ گفت و شنید سے کوئی حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔ آپ پائندہ خاں کے اس پیغام سے بہت خوش ہوئے کیونکہ آپ اس سے لڑنے میں کوئی خوشی محسوس نہیں فرماتے تھے اور پھر سید صاحبؒ کا حکم بھی یہی تھا کہ حتی الامکان جنگ سے گریز کیا جائے۔ آپ نے واپسی کا ایک حکم غازیوں کو بھی بھیج دیا۔ رسالدار عبد الحمید اور سید اکبر شاہ ستھانویؒ کا خیال تھا کہ پائندہ خاں فریب دینا چاہتا ہے لہٰذا واپسی کے بجائے عشرہ کے میدان میں پہنچنا ہی زیادہ بہتر ہے لیکن قائد لشکر سید احمد علیؒ نے کہا کہ میں تو سپہ سالار اعظم کے حکم کی اطاعت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لہٰذا وہ واپس تشریف لے آئے اگلے دن امام صاحبؒ نے دس بارہ غازیوں کے ہمراہ امب جانے کا پروگرام بنا لیا لیکن رسالدار عبد الحمید خاں[96] اور سید اکبر ستھانوی کی بات درست نکلی۔ پائندہ خاں کو جب یقین ہو گیا کہ غازی صلح کے جال میں پھنس کر دگیڑہ، فروسہ، اور ستھانہ کو چھوڑ چکے ہیں تو اس نے کوہ کنبر ڑی کے غازیوں کے خاتمے کے لیے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک کو بھیٹ گلی میں فروسہ کے راستہ کی بندش اور دوسرے کو ستھانہ کے راستہ میں رکاوٹ کے لیے متعین کر دیا۔ یہ اس کے سوار لشکریوں کی تقسیم تھی

اسی طرح پیادوں کے بھی اس نے دو گروہ بنائے، ایک کے ذمہ کینر ڑی کی داہنی طرف اور دوسرے کے کینر ڑی کی بائیں طرف سے پیش قدمی تھی یہاں پر متعین غازیوں کے لیے یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ تمام راستے مسدود ہونے کے پیش نظر وہ ستھانہ یا فروسہ اطلاع بھی نہیں بھیج سکتے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ کھانے کے لیے ان کے پاس صرف مکئی تھی، اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے بھون کر کھایا، سجدۂ شکر ادا کیا اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے مقابلہ کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

پائندہ خاں کی فوج کے سپاہی کوہِ کینر ڑی کے دونوں جانب سے چڑھائی کر رہے تھے اور مجاہدین انہیں روکنے میں سرگرم تھے۔ ابھی ابتداً ہی تھی کہ چھ غازی خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئے معرکہ آہستہ آہستہ تیز ہوتا گیا لیکن غازیوں کی پوزیشن بھی بڑی نازک تھی مدد خاں نے بیس رفقاء کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر پائندہ خاں کے سپاہیوں کو روکنے کی اجازت طلب کی جو کہ انہیں دے دی گئی، ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سید ولادت علیؒ اور امام خاں خیر آبادیؒ بھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ان کی شہادت سے مجاہدین کو بڑا صدمہ پہنچا۔ ابھی تک پائندہ خاں کی فوج کا پلڑا بھاری تھا۔ اسی اثناء میں شیخ بلند بختؒ کچھ سپاہیوں کو لے کر ارباب بہرام خاںؒ کی اجازت سے مولانا شیر کوٹیؒ کے مورچے میں چلے گئے انہیں اور ان کے کچھ ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملایا اور پہاڑ کے پہلو سے پائندہ خاں کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ادھر قدرت نے کچھ غیبی امداد اس طرح بھی فرمائی کہ تھوڑی دیر بعد کچھ پنجابی اور قندھاری غازی بھی پہنچ گئے جن کو دیکھ کر فروسہ کے راستے پر متعین اور کینر ڑی کے دونوں طرف سے حملہ آور ہونے والے دستے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پائندہ خاں نے جب اپنے سپاہیوں کو مفقود ہوتے دیکھا تو خود بھی امب کی طرف دوڑ گیا اسے دوڑتے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بہت شور مچانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے بہت سے اور سپاہی بھی بھاگ گئے اور شنرہ پر غازیوں کا قبضہ ہو گیا۔ عشرہ کے بعد کوٹلہ میں بیٹھے ہوئے اور گولیاں چلانے میں مصروف، پائندہ خاں کے سپاہیوں کا شیر دل غازیوں نے صفایا کر دیا۔ شیخ ولی محمد کوٹلہ کے پہاڑ کے اوپر امب کی طرف جا رہے تھے کہ پائندہ خاں کی ان پر نظر پڑ گئی بس کیا تھا کہ دم دبا کر بھاگ گیا اور وہاں سے کئی میل کے فاصلہ پر چھتر بائی جا کر رکا۔

شیخ ولی محمد بوقت مغرب امب پہنچ گئے اور وہاں سے امام صاحبؒ کی خدمت میں پیغام

بھیجا کہ آپ رات کو سفر کی زحمت گوارا نہ فرمائیں بلکہ صبح تشریف لے آئیں؛ چنانچہ آپ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی جلوہ افروز ہوئے۔ اسی وقت گڑھی کے باشندوں نے پرچم مصالحت بلند کیا آپ نے شیخ بلند بخت اور شیخ ولی محمد کو دیگر آٹھ غازیوں کے ہمراہ بھیج دیا کہ دریافت کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں انہوں نے آکر رپورٹ دی کہ وہ امان اور اپنے سازوسامان سمیت وہاں سے نکل جانے کی اجازت چاہتے ہیں آپ نے انہیں ذاتی سامان لے کر چلے جانے کی اجازت دے دی پھر آپ نے دروازہ کھولا اور سامان کا جائزہ لیا اور پائندہ کے آدمیوں کو کشتیوں پر سوار کر کے دریا کے پار بھیج دیا اس طرح امب پر بھی غازیوں کا قبضہ ہو گیا پھر آپ نے رسالدار عبدالحمید خاں کو چھتر بائی روانہ فرما دیا کیونکہ خبر ملی تھی کہ وہاں کی گڑھی بھی خالی ہو چکی ہے اور آپ امب کے ضروری انتظامات سے فراغت کے بعد روانہ ہوئے۔

چھتر بائی کی گڑھی تو خالی ہو چکی تھی لیکن غازی چونکہ جلد نہ پہنچ سکے تھے اس لیے پائندہ خاں کے آدمیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ امب سے چھتر بائی کو زیریں اور پہاڑی دو راستے جاتے تھے۔ رسالدار عبدالحمید پہاڑی اور امام صاحبؒ زیریں راستے سے گئے اور وہاں مختلف مقامات پر آٹھ مورچے بنا لیے۔ محاصرہ اگرچہ بڑا مضبوط تھا لیکن گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ آپ نے امب سے توپ منگوائی، گولہ باری کی لیکن نتیجہ پھر بھی کچھ نہ نکلا آخر کار سید صاحبؒ کی خدمت میں صورتِ حال لکھ کر روانہ کی گئی نیز آپ سے امب تشریف لانے کی درخواست کی گئی تاکہ اس سلسلہ میں راہنمائی کر سکیں۔ سید صاحبؒ تشریف لائے تو آپ نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد شیخ بلند بخت کی قیادت میں پچیس تیس غازیوں کو پنجتار سے توپیں لانے کے لیے بھیج دیا۔

اس اثناء میں ایک افسوسناک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حافظ عبداللطیفؒ نے بطور خود غازیوں سے کہہ دیا کہ نماز عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہو گا۔ مجاہدین نے سمجھا کہ شاید یہ حضرت امام صاحبؒ کا حکم ہے حالانکہ آپ کو اس کا قطعاً علم نہ تھا۔ غازیوں نے حملہ کر دیا لیکن ناکام رہے، چند شہید اور کچھ زخمی ہوئے سید صاحبؒ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو حکم بھیج دیا کہ غازی چھتر بائی کو خیرباد کہہ کر کھبل بائی تشریف لے چلیں۔ امام صاحبؒ نے اڑھائی سو غازیوں کو مورچوں میں چھوڑا

اور باقی کھبل بائی بھیج دیئے۔ اس طرح آپ نے تمام کو احتیاط اور بڑی اچھی تدبیر سے خیرو عافیت کے ساتھ کھبل بائی پہنچا دیا۔ غازیوں نے یہاں کئی ماہ تک قیام فرمایا آخر پائندہ خاں بھی صلح پر آمادہ ہوگیا اور ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ کو اس نے تحریری طور پر معافی مانگ لی۔ الغرض امب اور عشرہ کے یہ سعرکے حضرت امام صاحبؒ کے کمالِ سپہ گری کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

امب میں قیام

امام صاحبؒ کے امب میں قیام کے زمانہ کے کئی واقعات کتبِ تاریخ و سیر میں ملتے ہیں آپ اور خود سید صاحبؒ مشکل امور میں سبقت کی کوشش فرماتے تھے تاکہ دیگر مجاہدین دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ وہ خود بھی خوشی خوشی کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

سید جعفر علی نقویؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک زنبورک کو امب سے چھتر بائی پہنچانے کا پروگرام تھا امام صاحبؒ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا کہ آؤ اسے مل کر اٹھائیں جب ہم نے اسے اٹھایا تو آپ نے اپنا مبارک کندھا نیچے کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بہت وزنی ہے لہٰذا مجھے اٹھانے کی اجازت عطا فرمایئے۔ آپ نے تسلیم نہ کرتے ہوئے خود ہی اٹھانے پر اصرار فرمایا! چنانچہ حکم کی تعمیل تو کر دی گئی لیکن وزن اس قدر زیادہ تھا کہ آپ برداشت نہ کر سکے اور پاؤں لڑکھڑانے شروع ہوگئے جب دوسرے غازیوں نے دیکھا تو چشم زدن میں پہنچے اور آپ کے مبارک کندھوں سے زنبورک لے لی۔ آپ نے فرمایا چونکہ تین کوس کی مسافت طے کرنا ہے اس لیے تمام بھائی باری باری اٹھائیں۔

سید عبدالرؤف[۹۸] ایک مرتبہ گھر چلے گئے جب واپس آئے تو امام صاحبؒ نے ذرا برہمی کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے سید صاحبؒ کے پاس شکایت کر دی آپ اس وقت مجلس میں ہی تشریف فرما تھے۔ ان کی شکایت کے جواب میں فرمایا کہ دنیا پرستوں کے نوکر افسر کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتے تو پھر یہ بغیر اجازت کیوں چلے گئے۔ پھر آپ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"کون کس کام کے لائق ہے، اس کا فیصلہ امام کے ہاتھ میں ہے جو لوگ میرے ساتھ رہیں گے، وہ مولوی ہوں یا ملّا۔ ان سے جہاد کا کام لینے میں رعایت نہ کروں گا۔ جہاد میں ملّا اور سید دونوں کو آگے رہنا چاہیئے۔"

ایک دفعہ سید صاحبؒ فرمانے لگے کہ مجھے تو محض اللہ کی رضا چاہیے۔ میں جنت کی بھی خواہش نہیں کرتا۔ میری تو بس یہی تمنا ہے کہ وہ مجھ سے راضی رہے اس سے غرض نہیں کہ وہ مجھے جنت سے جدا رکھے یا جنتیوں کا خادم بنا دے یہ سن کر حضرت امام صاحبؒ فرمانے لگے۔

"یہ بے شک بڑا بلند مقام ہے لیکن جنت سے اس قدر بے پرواہی نہ چاہیے اس لیے کہ جنت سے حق اور دوزخ سے باطل مراد ہے اور ایک مومن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ حق سے بے پرواہی کا اظہار کرے۔"

سید صاحبؒ نے فرمایا :-

"جب خدا تعالیٰ راضی ہو جائے گا تو بندے کو خود جنت میں داخل فرما دے گا۔ اصل مقصود تو اس کی رضا کا حصول ہے۔ جنت تو اس کی رضا کی ایک شاخ ہے۔"

امام صاحبؒ نے جواب دیا۔

"جی نہیں ! بلکہ جنت کی بہترین شاخوں میں سے رضا ایک شاخ ہے۔"

مولانا عبدالوہابؒ نے یہ آیت شریفہ پڑھی :-

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۹۹	مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اور کہا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رضا ایک دوسری چیز ہے، جنت جس کا ایک ثمرہ ہے۔

امام صاحب گویا ہوئے۔

۔ رضا چونکہ جنت کی ایک بہترین شاخ ہے اس لیے شرف و علوِ مرتبت کے پیشِ نظر اسے جنت سے الگ بیان کیا گیا۔

سید صاحب نے یہ فرما کر بات ختم کر دی کہ :۔

"میں تکلیف و راحت کا خواہاں نہیں میرا دل تو سراسر رضا کے خیال سے لبریز ہے۔"

اسی طرح ایک روز آپ نے "صبر" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے بڑے بڑے عجیب نکات بیان کیے مثلاً آپ نے فرمایا کہ :۔ "صبر کی دو قسمیں ہیں، بدنی اور نفسانی، بدنی کی پھر دو قسمیں ہیں ایک فعلی دوسری انفعالی، فعلی یہ ہے کہ انسان اعمال شاقہ بہ طیب خاطر ادا کرے۔ انفعالی یہ کہ اگر اس پر شدائد و مصائب آئیں تو ثابت قدم رہے۔

نفسانی کے بہت سے پہلو ہیں مثلاً :۔

۱۔ اگر انسان بطون و فروج کی شہوتوں سے محفوظ رہے تو اسے عفت کہتے ہیں۔

۲۔ اگر طلب فضول سے پرہیز کرے تو اس کا نام زہد و قناعت ہے۔

۳۔ اگر مصیبت کے وقت جزع فزع سے پرہیز کرے تو یہ معروف صبر ہوگا۔

۴۔ اگر حالتِ جنگ میں فرار سے باز رہے تو اسے شجاعت کہا جائے گا یہ بھی صبر نفسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔

۵۔ اگر غضب کی حالت میں انسان دوسرے کو مارنے یا بُرا بھلا کہنے سے باز رہے تو یہ حلم ہوگا۔

۶۔ کسی مہم کے سرانجام میں تحیّر و اضطراب سے محفوظ رہنے کو وسعتِ حوصلہ قرار دیں گے۔

۷۔ اظہارِ اسرار میں ضبط و صبر کو رازداری سے تعبیر کریں گے۔

اس طرح ثابت کر دیا کہ انسان کے اکثر محاسن و فضائل دراصل صبر ہی کے مختلف شیون و مظاہر ہیں۔"

ایک دن قابل اخوند زادہ نے آپ سے حرف مقطعات کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب میں یہ آیت شریفہ تلاوت فرما دی۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَۃِ وَ ابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِہٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ۔

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ قرآن کی متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں فتنہ پیدا کرنے کے لیے اور اس کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے حالانکہ اس کی ماہیت نہیں معلوم ہے مگر اللہ کو۔

سید صاحبؒ جب حسن زئی تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے درخواست کی کہ ہمیں عشر معاف فرما دیا جائے، آپ نے تالیف قلوب کرتے ہوئے معاف فرما دیا۔ امام صاحبؒ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے رؤسا کو جمع کر کے فرمایا:۔

"عشر بھی خمس و زکوٰۃ کی طرح شرعی حقوق میں سے ہے اور اس کی معافی کا امام صاحب کو بھی اختیار نہیں بلکہ امام بھی اگر زراعت پیشہ ہو تو اسے بھی عشر بیت المال میں جمع کرانا پڑے گا۔"

جب رؤسا کو معلوم ہو گیا کہ یہ ایک شرعی امر ہے تو انہوں نے بھی اسے خوشی خوشی تسلیم کر لیا۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ آپ سید صاحبؒ کا اس قدر احترام کیا کرتے تھے کہ بقول نواب وزیر الدولہ مرحوم :۔

حضرت ہادی ضال و غوی مولانا عبدالحی صاحبؒ و جناب عالم جلیل مولانا محمد اسمٰعیل علیہما الرحمۃ از بس کہ بعد ایت حضرت ہادی جلت عظمتہ، معرفت مقام قرب جناب امام ہمام دریافتہ بودند از کمال ادب رو بروی آنحضرت مانند نقش و صورت بے حس اند خود رفتہ سراپا مطیع و منقاد حسب فرمودہ آنحضرت

حضرت ہادی ضال و غوی مولانا عبدالحی اور جناب عالم جلیل مولانا محمد اسمٰعیلؒ کو اگرچہ سید صاحبؒ کے ہاں بہت قرب حاصل تھا تاہم وہ سید صاحبؒ کے سامنے بالکل بے حس و حرکت، از خود رفتہ و سراپا مطیع و منقاد تھے اور ان کی نشست و برخاست اور گفت و شنید تک بھی حضرت سید صاحب

احب کشف وشہود نشست و برخاست و گفت و شنود میکردند ﷺ کے حکم کے مطابق ہوتی تھی۔
لیکن چونکہ یہ ایک شرعی معاملہ تھا۔ اس لیے سید صاحبؒ کی بھی پرواہ نہ کی اور
بے باک ہو کر حق کا اظہار فرما دیا۔ قاضی سید محمد جانؒ کو جب ستمہ میں انتظامِ عشر کے لیے
میر بنا کر بھیجا گیا تو کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ انہیں بھی آپ کی حق گوئی و بے باکی کا یہ واقعہ یاد آ گیا
ہو جس کی وجہ سے انہوں نے آپ کو اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا اور کہا کہ اگر مجھ سے
ادانستہ کوئی فعل خدا اور رسولؐ کی رضا کے خلاف سرزد ہوا تو آپ اصلاح فرما دیں گے۔

جنگِ مردان

جب قاضی سید محمد جانؒ کے زیرِ امارت اور امام صاحبؒ کے زیرِ نگرانی تین سو سوار اور اڑھائی سو پیادہ غازیوں کا
قافلہ ستمہ میں نظامِ شریعت کے استحکام اور بالخصوص عشر کے انتظام کے لیے گیا تو ان حضرات
نے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے دن رات کام کیا۔ علاقہ کے مختلف مقامات کے دورے
کیے، لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعہ سمجھایا اور بہت سے خوانین کو جمع کر کے انہیں اصلاحِ
حوال کی طرف توجہ دلائی۔ ان میں مردان کا رئیس احمد خاں بھی تھا۔ اس نے جواب بھیجا کہ
یں آٹھویں دن ملاقات کروں گا، ادھر باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ احمد خاں پشاور کے
رانیوں سے ساز باز کر کے مجاہدین کے خلاف محاذ قائم کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے
مجاہدین نے بھی باہمی مشورے کے بعد مردان پر پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔
عشاء کی نماز کے بعد شبخون کی نیت سے غازیوں کا لشکر مردان کی طرف روانہ ہوا
جب مردان صرف ڈیڑھ کوس رہ گیا تو معلوم ہوا کہ دشمن کو حملہ کی اطلاع ہو چکی ہے امیر
لشکر قاضی صاحبؒ نے امام صاحبؒ اور دیگر اکابر سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہاں
تک تو اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا ہے۔ اب پیچھے لوٹ جانا نامناسب ہے اگر دشمن کے مطلع ہو
جانے کے باعث شب خون کے فیصلہ کے مطابق عمل ناممکن ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہم دن
کے وقت بھی دشمن سے ہاتھ دو چار کرنے کے لیے تیار ہیں اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف
سے ہمیں فتح و نصرت نصیب ہوگی۔ قاضی صاحبؒ بھی یہی چاہتے تھے لہٰذا وہ یہ بات سن
کر بہت زیادہ خوش ہوئے۔ اس اثناء میں ایک مخبر نے بتایا کہ گڑھی کے قریب ہی ایک کھلیان

میں چالیس پچاس آدمی بندوقیں لے کر بیٹھے ہیں۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادیؒ کو ایک جیش کے ساتھ ان کی طرف بھیج دیا۔ جب یہ پہنچے تو انہوں نے فوراً بندوقوں کو تان لیا۔ ادھر مولانا عظیم آبادی نے بھی ہلّہ بول دیا، جس کی تاب نہ لاتے ہوئے کھلیانوں میں بیٹھے ہوئے سپاہی راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس دوران مولانا کی ران پر بھی ایک گولی لگ گئی اور آپ زمین پر گر پڑے، رفقاء پوچھتے تو فرماتے تم چلو میں ابھی آتا ہوں وہ سمجھے شاید پاؤں میں کوئی کانٹا وغیرہ چبھ گیا ہے حتّٰی کہ امام صاحبؒ نے بھی دریافت فرمایا تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ آپ میرا خیال نہ فرمائیں۔ پہلے گڑھی کا فیصلہ مطلوب ہے۔ اگر فتح ہو جائے تو مجھے بھی دیکھ لینا کہ کس حال میں ہوں۔ جنگ مسلسل جاری رہی طلوعِ آفتاب کے دو گھڑی بعد قاضی صاحبؒ بھی جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ امام صاحبؒ کو علم ہوا تو فرمانے لگے۔

"الحمد للہ / قاضی القضاۃ نے اپنی مراد پالی"

لیکن اس بات کا چرچا نہ کرو۔ تاکہ دشمن کو ہمارے امیر کی شہادت کا علم نہ ہو۔ قاضی صاحبؒ کی شہادت کے بعد امام صاحبؒ نے امارت کے فرائض سرانجام دینا شروع کیے،

آخر کار مجاہدین کو فتح نصیب ہوئی۔ جنگ ختم ہوئی تو احمد خاں کے بھائی رسول خاں نے معافی کی درخواست کی۔ امام صاحبؒ نے فرمایا تم تمام آدمی گڑھی سے نکل جاؤ ہم تمہیں امان دیتے ہیں تمہارا اور دیگر رعایا کا مال محفوظ رہے گا البتہ احمد خاں باغی ہے۔ اس کا تمام مال چھین لیا جائے گا، انتظامات کی تکمیل کے بعد رسول خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا گیا شہداء کو مردان ہی میں آسودۂ خاک کیا گیا البتہ جنگ کے بعد قاضی صاحبؒ کے بھائی ان کی میّت کو اپنے وطن لے گئے اور وہاں دفن کیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد امام صاحبؒ نے یہ دن ہوتی میں بسر کیا۔ اگلے دن گڑھی امان زئی میں تشریف لے گئے، تین دن قیام کے بعد سُدم اور شیوہ ہوتے ہوئے پنجتار میں ورودِ مسعود فرمایا پھر سید صاحبؒ کی طرف سے بلاوا آنے پر کوٹھا اور کبل سے ہوتے ہوئے امب تشریف لے گئے اور سید صاحبؒ کی خدمت میں انتظامِ عشر اور جنگِ مردان کی رپورٹ پیش کی۔ سید صاحبؒ نے جب جنگِ مردان میں قاضی صاحبؒ کی شہادت کی خبر سنی تو انتہائی افسوس کا اظہار فرمایا۔

جنگ مایار

مجاہدین اور درانیوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں ان میں سے جنگ مایار بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ اس معرکہ میں مجاہدین نے درانیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ امام صاحبؒ نے اس جنگ میں بھی اپنی خداداد شجاعتوں کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ درانیوں کی فوج بارہ ہزار تھی جب کہ مجاہدین کی تعداد تین، ساڑھے تین ہزار سے متجاوز نہ تھی درانیوں نے جب حملہ کیا تو ان کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا تھا گویا تمام مجاہدین ان کے نرغے میں آ گئے ہیں اس موقع پر امام صاحبؒ نے شیخ ولی محمدؒ کو اپنے ساتھ لیا اور دشمن کی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ دشمن کے لشکر کے دو گروہوں نے باری باری بڑے زور دار حملے کیے لیکن ہر بار انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آپ نے ان حملوں میں بھی کئی درانی فوجیوں کو خاک و خون میں تڑپنے پر مجبور کر دیا۔ اس معرکہ میں آپ کے لیے بھی ایک بڑا کٹھن مرحلہ آیا۔ وہ یہ کہ جنگ شنکیاری میں چونکہ آپ کی انگشتِ مبارک زخمی ہو گئی تھی، اس لیے آپ جلد بندوق نہیں بھر سکتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کی بندوق خالی تھی اور اسے بھرنے کی کوشش میں تھے، کہ ایک درانی سوار آپ کے بہت قریب آ گیا اور آپ کو یقین ہو گیا کہ اب وقتِ شہادت آ پہنچا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسی لمحہ حافظ وجیہ الدین پھلیتی نے آپ کو دیکھا تو انہوں نے فوراً درانی سپاہی کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا اور اس طرح امام صاحبؒ کی جان بچی البتہ اس جنگ میں دیگر اٹھائیس مجاہدین کو جامِ شہادت نوش فرمانے کا موقع ملا۔ اسی کے قریب درانی بھی مقتول ہوئے۔ امام صاحبؒ نے اپنے شہداء کی تجہیز و تکفین اور تدفین سے فراغت کے بعد تمام رفقاء سمیت دیر تک ان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ تمام کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور زبان سے یہ کلمات ادا ہو رہے تھے کہ ہمارے یہ بھائی تو منزلِ مراد کو پہنچ گئے۔ اے کاش ہمیں بھی راہِ خدا میں شہادت نصیب ہو۔

مردان کی طرف روانگی

جنگ مایار سے فراغت کے بعد مجلسِ مشاورت نے پشاور کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ ابھی کیا ہی تھا کہ مردان سے چند ملا صاحبان آئے اور انہوں نے کہا کہ درانی سراسیمہ ہو کر فرار ہو گئے ہیں ان کا متروکہ سامان موجود ہے اس کی حفاظت کا بندوبست کیجئے۔ سید صاحبؒ نے فوراً امام

صاحبؒ کو ایک سو رفقاء کے ساتھ مردان روانہ فرما دیا۔ ان میں سے کچھ ایسے غازی بھی تھے جنہوں نے گزشتہ چوبیس، تیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک کی وجہ سے پیٹ میں قراقر اُٹھ رہے تھے لیکن جب فرائض نے پکارا تو فوراً سوئے منزل رواں دواں ہو پڑے۔ جب ہوتی کے قریب پہنچے تو گڑھی سے کچھ گولیاں آئیں۔ امام صاحبؒ نے جب دیکھا تو غازیوں کو چار چار قدم کے فاصلہ پر چلنے کا حکم دیا۔ اسلام کے یہ جانباز سپاہی بڑی شان و شوکت سے قدم بڑھاتے ہوئے مردان کے مغربی سمت ایک باغ میں پہنچ گئے۔ اگرچہ گڑھی مردان کے برجوں سے مسلسل گولیاں آرہی تھیں لیکن ان غازیوں کے مایۂ ناز سپہ سالار حضرت امام صاحبؒ نے ان کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا، جہاں وہ بالکل محفوظ تھے۔

کچھ دیر بعد گولیاں تو مدھم پڑ گئیں لیکن انہوں نے ایک چال اور چلی اور وہ یہ کہ غازیوں کو زہر آلود کھانا کھلانے کا ارادہ کیا اس غرض سے امام صاحبؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ اجازت ہو تو کھانا لائیں۔ فراستِ مومن کے بھی قربان جائیں، آپ ان کے اس بُرے ارادے کو بھی بھانپ گئے اور فرمانے لگے: ”خبردار! ان شرارتوں سے باز آجاؤ ورنہ درانیوں سے مالِ غنیمت میں حاصل کی ہوئی توپوں کے ساتھ گڑھی کو نیست و نابود کر دوں گا“؛ چنانچہ آپ نے شاہینوں کو لانے کے لیے آدمی بھی روانہ فرما دیئے۔ جب ان کو علم ہوا تو دوڑے آئے اور صلح کے لیے آمادہ ہو گئے۔

رسول خاں نے صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ غازی قصبے سے باہر رہیں گے اور اندر داخل نہ ہوں گے۔ امام صاحبؒ نے سید صاحبؒ کے استثناء کے ساتھ اس شرط کو تسلیم کر لیا اس کے بعد آپ نے مرزا احمد بیگ کی قیادت میں پچاس غازیوں کو گڑھی پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ فرمایا اور تمام برجوں پر پہرے دار تعین کر کے بندوقیں چلانے کا حکم دے دیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ قبضہ مکمل ہو چکا ہے۔ رسول خاں کو سید صاحبؒ کی خدمت میں تو روبھیج دیا۔ سید صاحبؒ کو صلح کی شرائط کی خبر دینے کے لیے کچھ غازی بھی بھیجے جب سید صاحبؒ کی آمد کی خبر ملی تو پھر ایک غازی کو آگے بھیج دیا کہ آپ کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ یہ شرائط صلح میں طے پا گیا ہے کہ آپ باہر تشریف رکھیں، اندر قدم رنجہ نہ فرمائیں۔

سید صاحب کی تشریف آوری کے موقع پر سواروں اور پیادوں کا بے پناہ ہجوم ان کے ساتھ تھا اس لیے جس غازی (ملا فیض محمد) کو بھیجا گیا تھا وہ آپ تک پیغام پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے سید صاحبؒ کو صلح کی شرائط کا علم نہ ہو سکا اور آپ اندر تشریف لے آئے۔ امام صاحبؒ کو جب آپ کے اندر تشریف لے آنے کی خبر پہنچی تو غصے کی حالت میں فوراً آپ کے پاس پہنچے اور جاتے ہی کہا :-

جناب خود خلافِ شرع امر کے مرتکب ہوئے۔ لشکرِ اسلام میں سے ایک آدمی کے عہد کا ایفاء بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا لیکن آپ نے میرے عہد کا بھی خیال نہ رکھا اور قصبے میں داخل ہو گئے یہ لشکر ہے، اسے میدان میں ٹھہرنا چاہیے پیرزادوں کا قافلہ نہیں کہ قصبے میں گھس آئے[۱۰۳]

دراصل کسی ملکی نے سید صاحبؒ کو امام صاحبؒ کی طرف منسوب کر کے قصبے میں آنے کا پیغام دے دیا جس کی وجہ سے سید صاحبؒ اندر تشریف لے آئے امام صاحبؒ نے جب اظہار برہمی کیا تو سید صاحب فرمانے لگے۔

مجھ سے کہا گیا تو آیا، ورنہ کاہے کو آتا۔ میں ابھی جاتا ہوں یہ فرما کر مشرقی دروازے سے باہر نکلے اور ندی کے مشرقی کنارے پر توت کے درختوں کے سائے میں جا بیٹھے[۱۰۴]"

امام صاحبؒ کی اس روش کو اپنے پیر و مرشد کی سوءِ ادبی پر محمول نہ کیا جائے۔ حاشا وکلا، آپ تو اپنے پیر و مرشد کا اس قدر ادب و احترام کرتے کہ جب وہ سوار ہوتے تو آپ رکاب تھام کر چلتے[۱۰۵]، جب وہ محوِ استراحت ہوتے تو ساری رات ان کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر گزار دیتے[۱۰۶] اور جب وہ کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو آپ بالکل بے حس و حرکت رہتے اور آپ کی بات کا جواب بھی بڑی مشکل سے دیتے تھے[۱۰۷]۔ یہاں آپ کا یہ اظہارِ برہمی جوشِ ایمانی، حق کی پاسداری، شرعی معاملات میں سختی سے پابندی اور

حق گوئی و بے باکی کے سبب سے ہے اور بس جیسا کہ قبل ازیں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا بعد میں جب آپ کو شیخ ولی محمد کی زبانی معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ کی خدمت میں کوئی پیغام نہیں پہنچا تھا تو ضروری اُمور سے فراغت کے بعد سید صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور انتہائی ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے، سید صاحبؒ نے بھی آپ کی حق گوئی پر کسی ملال کا اظہار نہ فرمایا بلکہ اہلِ قصبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگوں نے میاں صاحبؒ سے ہماری شکایت کر کے انہیں ناراض کر دیا۔ پھر آپ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ مجھے آپ کے عہد و پیمان پر کسی نے مطلع نہیں کیا ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ آپ نے بھی انتہائی مؤدبانہ پیرایۂ بیان میں صورتِ حالات کی وضاحت فرما دی۔ اہلِ قصبہ نے جب لشکرِ اسلام کے سپہ سالاروں کی حق شناسی کا یہ منظر دیکھا تو بہت معذرت کی اور سید صاحبؒ کی خدمتِ اقدس میں اصرار کرنے لگے کہ آپ ضرور گڑھی کو قدومِ میمنت لزوم سے نوازیں چنانچہ آپ نے ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔

سردارانِ پشاور کا پیغامِ مصالحت

پشاور کے سرداروں نے جب مجاہدین کی کامیابی کو دیکھا تو سلطان محمد خاں وغیرہ نے مصالحت کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا۔ مشورہ کے بعد امام صاحبؒ کو ان سے ملاقات کے لیے نامزد کیا گیا آپ چوبیس غازیوں کے ہمراہ ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ سلطان محمد خاں کی تمنا تھی کہ گڑھی میں امام صاحبؒ کی ملاقات ہو تا کہ دروازہ تک استقبال کے لیے خود جا سکے لیکن ارباب فیض اللہ خاں نے گڑھی کے دروازے کے سامنے باغ میں ملاقات کا انتظام کیا۔ امام صاحبؒ نے پندرہ سولہ رفقاء کو اس مقام پر متعین فرما دیا، جہاں سے سلطان محمد خاں کے لشکر کی آمد ممکن تھی۔ اور آپ مقامِ ملاقات پر تشریف لے گئے۔ سلطان محمد خاں آکر بغلگیر ہوا۔ آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد کہنے لگا کہ آئندہ سے میں دین کی خدمت اور غازیانِ اسلام کی اعانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا؛ چنانچہ یہ پہلی مجلس معمولی گفتگو پر ہی اختتام پذیر ہوئی۔ یہ جمعرات کا دن تھا اس کے بعد ہفتہ کے دن ملاقات کا پروگرام طے پایا، پروگرام کے مطابق جب ہفتہ کے دن مذاکرات ہوئے

تو دیگر اُمور میں بحث کے علاوہ سلطان محمد خاں نے حضرت سید صاحبؒ سے ملاقات کا اشتیاق بھی ظاہر کیا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یہ حضرت کی رائے پر موقوف ہے لہٰذا آپ سے دریافت کے بعد بتا دیا جائے گا۔

آپ نے سید صاحبؒ سے اس کا ذکر کیا تو وہ ملاقات کے لیے تیار ہو گئے پشاور اور ہزار خانی کے درمیانی میدان کا ملاقات کے لیے انتخاب کیا گیا دونوں فریق اپنے اپنے لشکر کے ہمراہ ملاقات کے لیے آئے۔ امام صاحبؒ ارباب بہرام خانؒ، سید صاحبؒ کی مدد کر رہے تھے جب کہ ارباب فیض اللہ خاں اور مردان خاں، سلطان محمد خاں کے معاون تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی جو کہ فریقین کی مصالحت پر منتج ہوئی۔

سلطان محمد خاں کے بعد خیبر سے امب تک کے تقریباً تمام رؤسا و خوانین نے بھی لیفٹ تخالف کرکے اطاعت کا اظہار کیا جس سے بظاہر معلوم ہونے لگا کہ تین چار برس کی جانفشانیوں میں جان پڑ گئی ہے اور وہ روشن مستقبل کی غمازی کر رہی ہیں مگر افسوس کہ سردارانِ پشاور نے دھوکا دیا اور یہ جُسنے نور سراب ثابت ہوئی۔

سازش

معلوم ہوتا ہے کہ سرداروں نے مصالحت سے جب مجاہدین کو مطمئن کر دیا تو خود دامِ ہمرنگ زمیں بچھا کر خفیہ سازشوں کے منصوبے بنانے میں مصروف ہو گئے انہوں نے سازش کا جال کچھ اس قسم کا بنانا چاہا کہ مختلف مقامات کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملائیں اور ان علاقوں میں بکھرے ہوئے مجاہدین کو ایک ہی وقت میں کاملاً بے خبری کے عالم میں شہید کر دیں۔ ارباب فیض اللہ خاں کو جب اس جوڑ توڑ کی اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً پشاور کے قاضی مولانا مظہر علی صاحبؒ کو مطلع کیا اور کہا کہ امیر المومنین کو بھی اس صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔ اسی طرح شیخ حسن علی جن کا پورا خاندان سید صاحبؒ کے حکم سے دکھاڑا میں مقیم تھا۔ انہیں سازش کی ابتدائی خبر دکھاڑا کی مسجد کے امام سید اصغر سے معلوم ہوئی۔ انہوں نے اپنے بھائی عبدالعزیز کو دکھاڑا سے سید صاحب کی خدمت میں یہ پیغام دے کر پنجتار بھیج دیا کہ ایک سازش کا انکشاف ہوا ہے اور وہ یہ کہ سردار ایک ہی شب میں مختلف مقامات میں موجود غازیوں کو خاک و خون میں تڑپانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ لیکن سید صاحبؒ

کو خبر کی صحت میں تامل ہوا۔

شیخ عبدالعزیز نے واپس آ کر جب اپنے بھائی اور سید محمد اصغر کو بتایا کہ سید صاحبؒ اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا سید محمد اصغر نے دوبارہ پیغام بھیجا لیکن سید صاحبؒ نے یہی فرمایا کہ سمہ کے رؤسا و خوانین ہمارے دوست ہیں اور یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی۔ شیخ نے دکھارا پہنچ کر جب بتایا کہ سید صاحبؒ اپنے موقف پر بدستور قائم ہیں تو سید محمد اصغر قلق و اضطراب کے عالم میں اشکبار ہو کر کہنے لگے "میری بات کو یاد رکھنا، دو تین روز بعد حقیقت واضح ہو جائے گی" چنانچہ چند دن بعد ہی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور پشاور کے سرداروں نے مولانا مظہر علی، ان کے رفقاء اور ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کر دیا۔

سید صاحبؒ کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو انہوں نے امام صاحبؒ اور دیگر مشیروں سے مشورہ کیا اور مختلف مقامات میں موجود غازیوں کو پنجتار پہنچنے کا پیغام بھیج دیا۔ امام صاحبؒ نے مسجد کے جنوب مغربی کونے میں توپیں نصب کرا دیں۔

جنگ بالا کوٹ

پشاور اور سمہ کے باشندوں کی غداری اور بدعہدی سے امیر المومنین حضرت سید صاحبؒ بہت بیزار ہو گئے حتیٰ کہ اُن کے علاقے میں اب قیام کو بھی پسند نہ فرمایا اور وہاں سے ہجرت کا عزم کر کے دشوار گزار کوہستانی راستوں اور سنگلاخ گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے راجدواری تشریف لے گئے حضرت امام صاحبؒ بھی آپ کے رفیق سفر تھے۔ راج دواری پہنچے تو برف باری کا موسم شروع ہو چکا تھا اس موسم میں جہاد ممکن نہ تھا اس لیے پورے لشکر کو وہاں رکھنے کے بجائے مختلف مقامات پر پھیلا دیا گیا شنکیاری کے قریب درہ بھوگڑ منگ خاص اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ یہاں سکھوں کی ایک چھاؤنی تھی سکھوں کی طرف سے حملہ کی روک تھام کے لیے سید صاحب نے درہ بھوگڑ منگ میں چار سو غازیوں کا ایک لشکر روانہ فرمادیا۔ امام صاحبؒ اس کے امیر اور مولانا خیر الدین شیرکوٹیؒ نائب امیر و مشیر تھے۔ امام صاحبؒ نے راستہ میں ایک منزل پر قیام فرمایا۔ مولانا خیر الدین کو ساڑھے تین سو غازیوں کا امیر بنا کر بھوگڑ منگ روانہ فرما دیا اور خود پچاس رفقاء سمیت بھوگڑ منگ سے

چند میل کی مسافت پر واقع موضع سیچوں میں تشریف لے گئے اس اثناء میں سید صاحبؒ کو معلوم ہوا کہ سکھوں نے اپنے آلام و مصائب کا صرف عام مسلمانوں کو ہی تختۂ مشق نہیں بنا رکھا بلکہ بہت سے خوانین اور رؤسا پر بھی عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے ان تمام سرداروں نے سید صاحبؒ کی خدمت میں امداد کی درخواستیں ارسال کیں۔ سید صاحبؒ نے یہ تمام حالات لکھ کر امام صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیئے اور فرمایا کہ آپ فوراً بالاکوٹ تشریف لے آئیں۔ آپ نے یہ حکم پہنچتے ہی مولانا خیر الدینؒ کو لکھا کہ آپ فوراً بالاکوٹ پہنچ جائیں، میں بھی دو تین روز تک پہنچ جاؤں گا۔

سفرِ بالاکوٹ

آپ ۲۹ شعبان ۱۲۴۶ھ کو سیچوں سے سُوئے بالاکوٹ روانہ ہوئے لیکن بطور توریہ فرمایا کہ بھوگڑمنگ جانا ہے جب روانہ ہوئے تو برف باری ہو رہی تھی۔ بھوگڑمنگ پہنچ کر درختوں کے نیچے قیام فرمایا اور رفقاء کو بتایا کہ ہمیں بالاکوٹ جانا ہے راستہ میں ایک گاؤں آیا اس میں کچھ دیر ٹھہرے، کپڑوں سے برف جھاڑی اور جب معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں ٹھہرنے کے لیے کوئی خالی مکان نہیں مل سکے گا تو پھر سوئے منزل چل پڑے۔ نمازِ عصر دامنِ کوہ میں اور مغرب بعض غازیوں نے پہاڑ کی چوٹی اور بعض نے دورانِ چڑھائی ادا فرمائی راستہ کے سنگلاخ اور انتہائی دشوار گزار ہونے کے باعث اس سفر میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ جسمانی اعتبار سے بڑے نحیف و نزار اور دھان پان تھے ان دنوں طبیعت بھی علیل تھی۔ چلتے چلتے جب تھکن سے چُور ہو گئے تو ایک جگہ بیٹھ گئے اور فرمانے لگے "بھائیو! کچھ ہو، ہم تو یہاں سے اُٹھتے نہیں"۔ چند جواں ہمت غازی دوڑ کر مٹی کوٹ سے چارپائی اور کچھ آدمیوں کو لے کر آئے اور آپ کو چارپائی پر ڈال کر مٹی کوٹ پہنچا دیا۔ اسی شام رمضان المبارک کا چاند طلوع ہوا اور آپ دوسرے دن بالاکوٹ تشریف لے گئے۔

سرداروں نے جب آپ سے ملاقات کی تو آپ سے بھی امداد کی درخواست کی۔ آپ نے غازی بھیجنے کا وعدہ فرمالیا۔ مولانا خیر الدینؒ کو امیر بنانا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ ان رؤسا کا کوئی اعتبار نہیں۔ نا معلوم کس مشکل میں پھنسا کر علیحدہ ہو جائیں۔ آپ نے زبردست خاں کے ہمراہ تین سو غازیوں کو مظفر آباد روانہ فرما دیا۔ سید صاحبؒ کو جب مولانا خیر الدینؒ کی معذرت

کا علم ہوا تو آپ نے ان کے نام فرمان بھیجا کہ اگرچہ آپ کا عذر معقول ہے تاہم آپ کو ضرور جانا چاہیے؛ چنانچہ وہ بھی دس آدمیوں کے ساتھ مظفر آباد پہنچ گئے۔

دینی مصروفیات

مولانا نصیر الدین منگلوریؒ نے بالاکوٹ میں نمازِ تراویح کا انتظام کیا۔ امام صاحبؒ ضعف و نقاہت کے باعث شریک نہ ہوتے تھے لیکن تمام رفقاء سے فرما دیا کہ میں مجبوری کے سبب نمازِ تراویح میں شریک نہیں ہوتا لہٰذا اس سلسلہ میں کوئی میری پیروی نہ کرے، البتہ کوئی میری طرح مجبور ہو تو اور بات ہے۔ اس زمانہ میں ملا محمود آپ سے سورۂ انفال کا ترجمہ پڑھتے تھے مولانا جعفر علی نقویؒ نے بھی پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا لیکن آپ نے قلتِ فرصت کے پیشِ نظر معذرت کر دی۔ جب رمضان المبارک کی ستائیس تاریخ ہوئی تو آپ نے فرمایا :-

"آج جی چاہتا ہے کہ دو رکعت تراویح میں بھی پڑھ لوں، لیکن شرط یہ ہے کہ امام مجھے بنایا جائے[۱۰۸]۔"

اس پر سب نے عرض کیا کہ آپ کی موجودگی میں امامت کا اور کون حقدار ہو سکتا ہے؟ مولانا سید جعفر علی نقوی رقمطراز ہیں کہ :-

"آپ نے دو رکعتوں میں پوری سورۂ بنی اسرائیل تلاوت فرمائی اور اس کیفیت میں فرمائی کہ ابتدائے عمر سے آج تک کسی امام کے پیچھے نماز میں وہ حظ و لذت نصیب نہ ہو سکی اور تمام عمر از یاد نخواہد رفت[۱۰۹]"

تجویزِ شبخون اور پیغامِ سید صاحبؒ

سید صاحبؒ ۲۲ رمضان المبارک ہی کو راج دواری سے سچون روانہ ہو گئے تھے اور ۲۴ رمضان المبارک کو وہاں پہنچ گئے تھے، ۲۷ رمضان المبارک کو جمعہ کا خطبہ بھی وہیں ارشاد فرمایا۔ آپ ابھی تک سچون ہی میں قیام پذیر تھے کہ امام صاحبؒ کو اطلاع ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خاں گڑھی حبیب اللہ آ گئے ہیں اور جگہ جگہ سے فوج جمع کر کے جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں امام صاحبؒ نے یہ تمام حالات سید صاحبؒ کی خدمت میں لکھ بھیجے

ایک دن خود ہی شبخون کا فیصلہ کر لیا لیکن اسی روز سید صاحبؒ کا ایک خاص خادم درج ذیل پیغام لایا :-

"مدت است کہ آں برگزیدہ بارگاہ از ما جدا ہستند واشتیاق از بس واریم۔ نامہ بہ طلب مے رسد واز عقب سردار حبیب اللہ خاں ہم مے رود۔ حکم قطعی برائے خود ہمیں دانند کہ زود از زود روانہ نزد ایں جانب شوند۔"	آپ بہت مدت سے ہم سے جدا ہیں لہذا ملاقات کا اشتیاق بہت زیادہ ہے اس لیے آپ کو بلایا جاتا ہے سردار حبیب اللہ خاں بھی آ رہا ہے لہذا آپ اسے قطعی حکم سمجھتے ہوئے جلد از جلد ہمارے پاس تشریف لائیں۔

اس مکتوب کے اختتام پر مہر اور آغاز پر "کلمۃ اللہ کافی" ثبت تھا۔ اصطلاح میں اس سے انتہائی تاکید مراد تھی۔ امام صاحبؒ نے یہ مکتوب پڑھتے ہی فرمایا کہ :- "بھائیو مجھے حضرت نے طلب فرمایا ہے اس لیے شبخون کا ارادہ ملتوی کیا جاتا ہے۔" کچھ احباب نے درخواست کی کہ شبخون کا فیصلہ ملتوی نہیں کرنا چاہیے سید صاحب کی خدمت میں یہ حالات لکھ بھیجنے چاہئیں لیکن آپ نے فرمایا حضرت کا از حد تاکیدی فرمان ہے جس کی اطاعت سے انکار کی مجھے گنجائش نہیں۔ آپ نے شیخ بلند بختؒ کو امیر بنایا اور خود سید صاحبؒ کی خدمت میں سچون تشریف لے گئے۔ سچون میں دیگر امور کے علاوہ سید صاحبؒ کے حکم سے آپ نے "مشکوٰۃ المصابیح" کا درس بھی شروع فرمایا۔ ہر روز صبح کے وقت ایک مجلس میں چند احادیث کا ترجمہ و تشریح بیان فرماتے۔ ان مجلسوں میں سید صاحبؒ بھی شرکت فرماتے۔ عصر کے بعد مجمع عام میں مشکوٰۃ کی ایک فصل سامنے رکھ کر خطاب فرماتے۔ سید صاحبؒ نے آپ کو یہاں اس لیے طلب فرمایا تھا کہ پکھلی کی طرف سے درہ بھوگڑمنگ پر حملہ کا خطرہ تھا۔ ابھی تک آپ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ بالاکوٹ سے حبیب اللہ نے لکھا کہ شیر سنگھ بالاکوٹ میں پیش قدمی کا ارادہ کر رہا ہے لہذا آپ جلد بالاکوٹ تشریف لے آئیں۔ چنانچہ آپ امام صاحبؒ اور دیگر رفقاء سمیت ۵ ذی قعدہ (۱۷ اپریل ۱۸۳۱ء) کو سچون سے بالاکوٹ روانہ ہو گئے۔

جذبۂ تبلیغ پہاڑی راستہ تھا، کمزوری طبیعت کے باعث امام صاحبؒ کا چند

قدم پر سانس پھول جاتا۔ جب تھکاوٹ سے بہت چُور ہو جاتے تو پتھر پر بیٹھ کر وعظ فرمانا شروع کر دیتے سانس درست ہو جاتا تو پھر سفر جاری فرما دیتے۔ اسی طرح کے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> بھائیو! خیال کرو۔ اگر ہم کسی امیر یا رئیس کے نوکر چاکر ہوتے اور وہ اپنے کسی کام کے لیے ایسے دشوار گزار راستے پر بھیجتا تو بلا عذر جانا اور رنج راہ اٹھانا پڑتا۔ لیکن وہ نوکری صرف گزرانِ دنیا کے لیے ہوتی۔ الحمدللہ آج ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں بلکہ محض اپنے پروردگار کی خوشنودی و رضامندی کے لیے یہاں آئے ہیں اور خوشی خوشی یہ سب محنتیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں اگر ہماری نیتیں خالص ہیں تو اللہ تعالےٰ آخرت میں بڑا درجہ دے گا۔"

پہاڑ کی چوٹی پر کئی چشمے تھے۔ سید صاحبؒ وہاں ٹھہر گئے اور امام صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ بالاکوٹ تشریف لے جا کر ہمارے خورد و نوش کا انتظام کریں لیکن بعد میں پیغام بھیج دیا کہ آپ ہمارا انتظار نہ کریں، ہم رات پہاڑ پر ہی بسر کریں گے؛ چنانچہ سید صاحبؒ صبح بالاکوٹ روانہ ہوئے۔ امام صاحبؒ نے ست بنے کے نالے پر آپ کا استقبال کیا جنگِ بالاکوٹ کے واقعات سمجھنے کے لیے بالاکوٹ کے محلِ وقوع کی وضاحت ضروری ہے جو کہ حسبِ ذیل ہے۔

بالاکوٹ

"بالاکوٹ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا مشہور قصبہ ہے اور تحصیل کے شمالی و مشرقی گوشے میں وادیٔ کاغان کے جنوبی دہانے پر پاسبان کی حیثیت میں کھڑا ہے۔ اردگرد کے پہاڑی سلسلوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بالاکوٹ وادیٔ کاغان کا ایک حصہ معلوم ہو گا چونکہ اس کے سر پر پہنچ کر وادی کو پہاڑی دیوار نے بند کر دیا ہے اور دریائے کنہار (جس کا اصل نام دریائے کاغان ہے) کے منفذ کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، اس لیے بالاکوٹ وادیٔ کاغان سے منفک ہو گیا۔"

"مانسہرہ سے جو سڑک پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گزرتی اور پیچ و خم کھاتی ہوئی مظفرآباد

اور سری نگر جاتی ہے، وہ پندرھویں یا سولھویں میل پر وادیٔ کنہار میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کو گئی ہے قریباً ڈیڑھ میل پر ایک پُل ملتا ہے اس سے گزر کر مشرقی کنارے پر جائیں تو تھوڑی دُور گڑھی حبیب اللہ خاں کی آبادی ہے۔ یہی سڑک مظفر آباد اور سری نگر جاتی ہے دوسری شاخ کنہار کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ شمال کو گئی ہے اس کے دسویں میل پر بالاکوٹ واقع ہے[۱۱۳]"

لشکر گاہیں

سید صاحبؒ جب بالاکوٹ تشریف لائے تو سکھ لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالاکوٹ سے جنوب کی جانب دو اڑھائی کوس کی مسافت پر ہوگا۔ آپ نے بالاکوٹ پہنچ کر مختلف گزرگاہوں کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ سکھوں کے لیے بالاکوٹ پر حملے کی دو ہی صورتیں تھیں اوّل یہ کہ وہ ٹکلی کی طرف سے پہاڑ پر چڑھ کر مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ کر نیچے اُترتے اور دوم یہ کہ کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ کے سامنے پہنچے۔ انہوں نے دوسری صورت اختیار کی کیوں کہ پہلی شکل اختیار کرنے سے وہ توپیں اور بھاری سامان اس راستے سے نہیں لے جا سکتے تھے سید صاحبؒ نے بھی دفاعی انتظامات کے لیے جگہ جگہ مورچے بنوا کر ان میں مجاہدین کو متعین کر دیا۔ لڑائی کی سکیم یہ تھی کہ سکھ مٹی کوٹ کے ٹیلے اور قصبے کے درمیانی نشیبی علاقہ میں جس وقت پہنچیں تو ان پر حملہ کر دیا جاتے۔ امام صاحبؒ کی جماعت کو قصبے کی جانب بٹھانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن یاد رہے آپ خود جماعت کے ساتھ نہیں تھے بلکہ غازیوں کی ایک جماعت کے ہمراہ مسجد بالا کے پاس شمالی طرف قیام فرما تھے آپ کی جماعت کے بائیں طرف شیخ ولی محمدؒ اور آپ کے سامنے مسجد کی مغربی جانب مولانا احمد اللہ ناگپوری[۱۱۴] کی جماعت کا مورچہ تھا۔ اسی طرح دیگر جماعتوں کی بھی موزوں مقامات پر مورچہ بندی کر دی گئی تھی۔

جنگ

صبح کی نماز مسجد بالا میں ادا کی گئی، سید صاحبؒ نے امامت کے فرائض انجام دیئے سکھ لشکر ایک دن پہلے ہی پہاڑ پر پہنچ گیا تھا لیکن رات ہو جانے کے باعث پیش قدمی نہ کر سکا۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی مٹی کوٹ کی شمالی جانب سے نمودار ہوئے اور گولیاں چلانے لگے ان کے شاہینوں کے گولے تو قصبے کے اُوپر سے

نکل رہے تھے۔ سید صاحبؒ نے تمام جماعتوں کے اُمراء کو حکم دے رکھا تھا کہ مورچوں میں بیٹھ کر دفاع کریں اور اس وقت تک باہر نہ نکلیں جب تک کہ ہمارا نشان آگے بڑھتا ہوا نظر نہ آئے۔ سکھوں کی طرف سے گولیوں کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بعض غازی زخمی ہو گئے آہستہ آہستہ پوری سکھ فوج مٹی کوٹ کے ٹیلے سے بالا کوٹ کی طرف نیچے اُترنے لگی یہ دیکھ کر سید صاحبؒ مسجد بالا سے مجاہدین کے ایک دستے کے ساتھ روانہ ہوئے حضرت امام صاحبؒ نے جب آپ کو دیکھا تو اپنے اپنے مورچے سے نکل کر آپ کے ساتھ مل گئے مسجد زیریں میں چند لمحات قیام کے بعد سید صاحبؒ اچانک دلدل میں داخل ہو گئے امام صاحبؒ نے دیکھا تو لمبی مار کی بندوقوں والے مجاہدین کو سید صاحبؒ کے ارد گرد جمع ہو جانے کا حکم دے دیا۔ آخر کار بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ سکھ فوج اگرچہ مجاہدین کی نسبت بارہ گنا زیادہ تھی لیکن غازیوں نے بڑی عزیمت و استقامت کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا۔ غازی بپھرے ہوئے شیروں کی طرح جس طرف رُخ کرتے دشمن کی صفیں الٹ دیتے حتیٰ کہ سکھ پسپا ہو گئے اور آخر کنور شیر سنگھ نے خود تلوار ہاتھ میں لی اور آگے بڑھنا شروع کیا، مہاں سنگھ اسے روک رہا تھا لیکن اس نے کچھ نہ سنا اور آگے ہی بڑھتا گیا اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی میدان میں لڑنے پہ اُبھارنا شروع کیا۔ سکھ فوج واپس آ گئی اور اس نے بڑی شدت سے حملہ کیا الغرض دونوں فوجیں بڑی بہادری سے لڑتی رہیں اور فریقین کی طرف سے بڑی زبردست آتشبازی ہوتی رہی سید صاحبؒ اور امام صاحبؒ نے بھی شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھائے حتیٰ کہ سکھ مؤرخ مہتاب سنگھ نے بھی لکھا ہے کہ :-

خلیفہ سید احمد شاہ و مولوی اسمٰعیل کہ ہر دو افسران کلاں تر آں فوج بودند بہ ذاتِ خود حملہ کناں و اللہ اکبر گویاں .... در زمین سوتر کہ درمیان ہر دو بود آمدند و بہ آوازِ بلند گفتند کہ کافراں رفتند، حملہ بہ کنید۔[۱]	خلیفہ سید احمد شاہؒ اور مولوی اسمٰعیلؒ بھی جو فوج کے سب سے بڑے سردار تھے، بہ ذات خود حملے میں شریک ہو گئے وہ ..... اللہ اکبر کہتے ہوئے سوتر کی زمین میں پہنچ گئے زور زور سے کہہ رہے تھے، دیکھو کافر شکست کھا کر جا رہے

فریقین میں بڑا زبردست مقابلہ ہوتا رہا۔ بالآخر مشیتِ ایزدی کے مطابق اس معرکہ میں سید صاحبؒ، امام صاحبؒ اور دیگر بہت سے مجاہدینِ اسلام جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ سیدین شہیدینؒ کی شہادت کیسے واقع ہوئی اس میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور پھر سید صاحبؒ کی شہادت یا غیبوبت میں بھی اختلاف ہے اس کی تفصیل کے لیے "سید احمد شہیدؒ" مصنفہ مولانا غلام رسول مہرؒ کا مطالعہ فرمایئے یہاں ہم صرف امام صاحبؒ کے متعلق آپ نے جو روایات جمع کی ہیں ان کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

شہادت کیسے ہوئی

"منظورہ" میں ہے کہ ان کو (امام صاحبؒ) پیشانی پر گولی لگی[116] سید عبدالرحمٰنؒ (خواہر زادہ سید صاحبؒ) نے شیخ ولی محمدؒ اور امان اللہ خاں لکھنوی کی زبانی سنا کر مولانا کے سر پر ایک گولی لگی تھی اس سے اگرچہ خفیف زخم آیا لیکن داڑھی خون سے رنگی گئی پھر آپ ننگے سر امان اللہ خاں کو ملے بندوق بھری ہوئی تھی۔ اور لبلبی چڑھی ہوئی تھی۔ پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ امان اللہ خاں نے مٹی کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ادھر سے بکثرت گولیاں آرہی تھیں لیکن یہ کہتے ہوئے چلے گئے: بھائی! میں تو وہیں جاتا ہوں۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کس حربے سے شہادت پائی[117]۔ میاں حفیظ اللہ دیوبندیؒ نے انہیں دھانوں کے کھیتوں میں مٹی کوٹ کے نالے سے قریب بندوق چلاتے دیکھا تھا[118]۔

میاں امام الدین بڑھانویؒ کا بیان ہے کہ جب غازی حضرت امیر المومنینؒ کی تلاش میں تھے تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا رفل کندھے پہ رکھے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے پیشانی سے خون جاری ہے[119]۔

لعل محمد جگدیش پوری مٹی کوٹ کے دامن کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے بائیں طرف سے مولانا اسمٰعیل رفل کندھے پہ ڈالے اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے پیشانی سے خون بہہ رہا تھا؛ پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ میں نے اپنے داہنے طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں۔ یہ سن کر وہ اس طرف "جھپٹتے ہوئے چلے گئے"[120]۔ کریم خاں میواتی کا بیان بھی یہی ہے کہ مولانا اس ہجوم کی طرف چلے گئے جہاں تلوار چل رہی تھی وقائع میں ہے کہ سر سے خون جاری تھا، یہ معلوم نہیں کہ گولی پیشانی پر لگی تھی یا کنپٹی پر۔ ہجوم میں جا کر دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے[121]۔"

شہادت کہاں ہوئی؟

آخری بیان کسی عینی شہادت پر مبنی نہیں صرف ہجوم میں گھس جانے کی بنا پر قیاس کر لیا گیا کہ وہاں شہید ہوئے یہ ہجوم بالاکوٹ کی غربی جانب مٹی کوٹ کے دامن میں تھا اور مولانا کی قبر اس جگہ سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر قصبے کے شمال مشرق میں ست بنے کے نالے کے پار بنی اگر مولانا مٹی کوٹ کے دامن میں شہید ہوئے تو ان کی میت کو اٹھا کر اتنی دور ایک الگ تھلگ مقام پر کیوں لے گئے جبکہ وہاں کوئی قبرستان بھی نہ تھا بلکہ کھیت ہی کھیت تھے ؟ میرا خیال ہے کہ مولانا لڑتے لڑتے اور دشمن کے دباؤ کے باعث مٹی کوٹ کے دامن سے نیچے ہٹتے ہٹتے ست بنے کے پار پہنچ گئے اور وہاں شہید ہوئے یہ معلوم نہیں کہ شہادت گولی سے ہوئی یا تلوار سے[۱۲۲]" شیخ فتح اللہ صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ کافروں نے شہادت کے بعد آپ کی لاش کو بہت تلاش کیا لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی فرماتے ہیں۔ ؎

حق نے اسمعیل کی عزت یہ کی لاش کو کفار سے ذلت نہ دی

پردۂ رحمت میں اپنے ڈھانک لی کی تلاش اعداء نے لیکن نہ ملی

دشت دیکھا گرچہ سو سو بار ہے[۱۲۳]

بہر آئینہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعۃ المبارک کے دن یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت امام صاحبؒ اپنے پیرومرشد اور دیگر جانثار رفقاء سمیت جان پر کھیل کر میدان میں لڑے۔ علماء سوء کی تفریق انگیز حرکات، افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت سرحد کے خوانین کی غداری اور دشمن کے پاس ہر طرح کے سامانِ حرب کی فراوانی کے باعث اگرچہ موت صاف نظر آ رہی تھی لیکن شہادت کی آرزو دلوں میں موجزن تھی اس لیے بے سروسامانی کے عالم میں بھی لڑے اور اس طرح کہ اس فرشتہ سیرت قافلہ حریت کے نعرۂ حق سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ اس وقت تک یہ قافلۂ اہلِ حق رواں دواں ہی رہا جب تک کہ اس نے اپنے مقدس خون سے بالاکوٹ کی گل پوش وادی کو لالہ زار نہ بنا ڈالا۔ آج بھی بالاکوٹ کے دشت و جبل سے ان کے نعرۂ مستانہ کی گونجتی ہوئی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اے سرزمین بالاکوٹ! تجھ پہ اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کی موسلادھار بارشیں نازل ہوں کہ تجھ میں امت کی بہترین آرزوئیں محو استراحت ہیں۔ اور اے خفتگانِ ارضِ بالاکوٹ! تم پہ اللہ کی رحمت و سلامتی کی شبنم افشانی ہو، خدا تمہاری قربانی کو شرف قبولیت سے نوازے اور تمہیں جنت الفردوس میں "اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ" کی معیت سے سرفراز کرے۔ آمین۔ اے شہدائے بالاکوٹ! ہمیں یقین ہے کہ تمہاری یہ قربانی انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی خدا کی میزان میں ہندی مسلمان کے دوازدہ صد سالہ کارنامے میں جتنا حصہ خیر کے پلڑے میں رکھے جانے کے قابل ہوگا۔ اس کا سب سے زیادہ وزنی جز یہی ہوگا۔[۲۴]

رضی اللہ تعالیٰ عنکم اجمعین

مدفن

امام صاحبؒ کا مدفن ست بنے نالے کے کنارے بلندی پر واقع ہے کچھ عرصہ ہوتا ہے محکمہ اوقاف نے مزار کا فرش پختہ کر دیا ہے اور پتھروں کا خوبصورت اور مضبوط پشتہ بنا دیا ہے۔ سڑک اور مزار کے درمیان ایک بہت بڑا پہاڑی نالہ ہے جس کی وجہ سے مزار تک پہنچنا خاصا دشوار ہے اگر اس نالہ پر کوئی پل وغیرہ کا انتظام ہو جائے تو اچھا ہے تاکہ زیارت کرنے والوں کی یہ دشواری ختم ہو جائے اور وہ بآسانی مزار تک پہنچ کر دعا کر سکیں۔ شہادت کے کافی مدت بعد تک مدفن کا علم نہ تھا ۱۸۹۳ء میں خان عجب خاں مانسہرہ میں نائب تحصیلدار متعین ہو کر آئے تو انہوں نے سید صاحبؒ اور امام صاحبؒ کی قبروں کی سن رسیدہ اور واقف حال آدمیوں کو مجتمع کر کے پوری تحقیق کی[۲۵] دونوں قبروں پہ ایک ایک کتبہ نصب کیا امام صاحبؒ کی قبر پہ انہوں نے جو کتبہ لگوایا وہ ناتراشیدہ پتھر پہ ٹیڑھے اور ترچھے حروف میں لکھا ہوا ہے اور اب قبر کی چار دیواری میں مشرقی جانب ہے۔ فرید آباد کے سید اسد علی نے بھی قبر شریف پہ ایک لوح لگائی جس پر حسب ذیل عبارت اور اشعار کندہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدفن

حضرت مولوی شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم

ولادت شنبہ ۲۸ شوال ۱۱۹۲ھ ٭ شہادت جمعہ ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ

اے ذبیح اللہ اسمٰعیل
شد بذات صور اسرافیل
خون خود را در کہ کہسار ریخت
لیک بیخ حریت در سند بیخت

احقرالعباد :-

سید اسد علی انوری فریدآبادی ایں کتبہ را در ماہ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ نصب کرد

ایک پرانے پتھر پر ایک اور کتبہ بھی لگا ہوا ہے جس پر حسبِ ذیل عبارت کندہ ہے۔

مزار شریف

غازی مولوی شاہ اسمٰعیل صاحب دہلوی شہید مرحوم

۱۳ اپریل ۱۸۸۱ء

باب ششم

تصنیفات

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضرت امام محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے سن شعور سنبھالتے ہی اپنی زندگی کا ایک نصب العین متعین فرمالیا اور وہ تھا اعلائے کلمۃ اللہ۔ پھر اسی نصب العین کے لیے آپ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کی صبحیں اور شامیں، دن اور راتیں بسر فرما دیں حتیٰ کہ اس بلند ترین نصب العین اور پاکیزہ مشن کے لیے اپنے مقدس خون کے آخری قطرہ تک کو قربان کر دیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس لیے آپ کو قلم کے جوہر دکھانے کی فرصت بہت کم میسر آئی۔ اگر آپ کو مہلت ملتی تو دنیا دیکھتی کہ آپ بڑے بڑے سلاطینِ قلم اور شہسوارانِ فن سے سبقت لے جاتے، تاہم

حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر آپ نے کچھ کتابیں تصنیف فرمائیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اپنے موضوع پر پہلے کی بعض بڑی بڑی مجلدات اور نامور کتابوں سے کئی گنا زیادہ وزنی ہیں نیز وہ مُصنّف کی بلند پایہ تصنیفی خوبیوں اور علمی گہرائیوں کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ طرزِ نگارش کا حُسن اسلوبِ بیان کی عمدگی، استدلال کی قوت، دلائل کا رسوخ، احکامِ شرعیہ کی مؤثر تشریح، فلسفہ و اُصولِ دین کی نقاب کشائی اور بیان میں تفہیم و تسلیم دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا آپ کی تصنیفات کی مشترک خصوصیات ہیں۔

تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد آپ نے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھنے کا عزم کیا اور اس عزم کا اپنے عمِ محترم حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے پاس بھی اظہار کیا۔ شاہ صاحب فرمانے لگے کہ تفسیریں تو بہت سی لکھی جا چکی ہیں لہٰذا آپ کسی نئے انداز کو اپناتے ہوئے تفسیر لکھیں آپ نے استفسار فرمایا چچا جان! وہ نیا انداز کیا ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا:۔

"کچھ پرانی ادب کی کتابیں، شعرائے متقدمین کا کلام اور محاورۂ عرب دیکھو اور پھر قرآنی محاورہ اور ہم عصروں کی تحریروں سے اسے تطبیق دے کر دیکھو۔ اسی طرح کی بہت سی نئی باتیں جب تفسیر لکھنے بیٹھو گے نکل آئیں گی۔"

آپ کو بھی یہ بات پسند آئی اسی دن سے شاہی کتب خانہ کی مملوکہ کُتبِ ادب کا مطالعہ شروع کر دیا پھر کیا تھا آپ کی خداداد قوتِ حفظ نے عربی لٹریچر کے محاورات، تشبیہات اور ضرب الامثال قسم کی بے شمار چیزوں کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا علاوہ ازیں دو ہزار اشعارِ عربی بھی آپ کے نوکِ زباں ہو گئے مگر افسوس کہ آپ کی یہ تمنّا دل ہی میں رہی اور آپ کو اس عظیم کام کے لیے وقت میسر نہ آسکا ورنہ یہ مجوزہ تفسیر ایک بے نظیر شاہکار ہوتی۔

ان تمام اُمور کے باوصف آپ کی جو علمی یادگاریں آج موجود ہیں، وہ سب اپنے اپنے موضوع پر نادر و یگانہ ہیں عوام و خواص ان سے یکساں استفادہ کرتے اور آپ پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں مثلاً شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی نے فرمایا ہے کہ:۔

"میں ان دونوں دادا پوتوں کا قائل ہوں جو صرف قرآن و حدیث

سے استنباطِ مسائل کرتے ہیں اور اپنی رائے پر اعتماد رکھتے ہیں زید و عمرو کسی مصنف یا عالم کی پیروی نہیں کرتے، ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضانِ الٰہی جوش مار رہا ہے[۲]

اب ہم ذیل میں آپ کی تصنیفات سے متعارف کراتے ہیں و باللہ التوفیق۔

۱۔ ردّ الاشراک

شرک و بدعت کی تردید میں امام صاحبؒ نے یہ رسالہ عربی زبان میں تحریر فرمایا تھا اس کی ابتداء " ان الاشراک الذی نزل الکتب الالٰھیۃ لابطالہ و بعث الانبیاء لمحقہ ..... کے الفاظ سے ہوتی ہے حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ آپ کی اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مختصری است در رد اشراک و بدعات از آیات و احادیث لاغیر باب اولش در اجتناب از شرک است و باب آخرش فی الوجوہ الممنوعۃ عن تزیین آنسا د تقویۃ الایمان اردو گویا ترجمہ نصف اوّل ہمیں مختصر ست[۳]"

ایک اور جگہ آپ کی مؤلفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" ازاں جملہ رد الاشراک است مشتمل بر دو باب در نفی اشراک و رسوم و کفر و بدعات از احادیث و تقویۃ الایمان ترجمہ یک باب اوست ہم از مؤلف[۴]"

یعنی آپ نے آیات و احادیث کی روشنی میں شرک و بدعت اور دیگر کفریہ رسوم کی تردید میں یہ کتاب تصنیف فرمائی جو کہ دو ابواب پر مشتمل تھی، اس کے پہلے باب کا آپ نے ہی اُردو میں ترجمہ کیا اور اسے "تقویۃ الایمان" کے نام سے موسوم فرمایا۔ اس کتاب کا ایک ایک نسخہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا نصر اللہ خورجویؒ، مولانا امیر شاہ خاںؒ، حضرت نواب صدیق حسن خاںؒ اور کئی دیگر بزرگوں کے پاس تھا۔ "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کے مقالہ نگار نے اس رسالہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"یہ شرک اور غیر مشروع مراسم کے رد میں آیات و احادیث کا مجموعہ ہے اس کے دو باب ہیں، نواب صدیق حسن خاں نے اسے ایک مرتبہ "قطف الثمر" کے ساتھ شائع کیا تھا اور احادیث کی تخریج کر کے اس کا نام "الادراک بتخریج احادیث رد الاشراک" رکھا۔ یہ رسالہ الگ بھی شائع ہو چکا ہے"۔

۲۔ تقویۃ الایمان

یہ آپ کی وہ مقبولِ خاص و عام، ایمان افروز، نکتہ آفریں، پُر تاثیر و پُر درد اور اپنے موضوع کی معرکۃ الآراء تصنیفِ لطیف ہے جو ایک طرف اہل توحید کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تو دوسری طرف اس کی ایٹمی طاقت سے اس کے زمانۂ تصنیف سے لے کر آج تک ایوانہائے شرک و بدعت متزلزل ہیں۔

موضوع

"تقویۃ الایمان" کا موضوع توحید ہے، جس پر دین و ایمان کی بنیادیں استوار ہیں۔ اس موضوع پر اگرچہ بے شمار اہلِ علم نے خامہ فرسائی فرمائی ہے تاہم حضرت امام صاحبؒ کا اسلوبِ بیان سب سے نرالا اور البیلا ہے آپ سب سے پہلے کتاب و سُنت سے استدلال کرتے ہوئے آیات و احادیث پیش فرماتے ہیں اور پھر ان کی عام فہم اور سلیس انداز میں تشریح کرتے ہیں اور ساتھ ہی شرک و بدعت کی ان رسوم کی دل نشین انداز میں تردید فرماتے جاتے ہیں جو کہ اس وقت کے معاشرہ میں رواج پذیر تھیں، اگر خدانخواستہ مطالعہ کرنے والا خود ان بیماریوں میں مبتلا ہو تو اس کے لیے توبہ کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ اور اگر پڑھنے والا موحد و مخلص مومن ہو تو اس کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے، گُلِ تازہ کی طرح تازہ۔

تائید

آپ نے اس کتاب کو تصنیف فرما کر جب اپنے خاندان کے اہلِ علم اور اپنے دیگر خاص خاص احباب کو جمع کر کے پیش کیا تو تمام نے اس کے مندرجات پر صاد کیا۔ چنانچہ حضرت امیر شاہ خاں صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ نے تقویۃ الایمان" اوّل عربی میں لکھی تھی چنانچہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ مولانا گنگوہیؒ کے پاس اور ایک نسخہ مولوی نصر اللہ خاں خورجویؒ کے کتب خانہ میں تھا اس کے بعد مولانا نے اس

کو اُردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا جن میں سیّد صاحبؒ، مولوی عبدالحی صاحبؒ، شاہ اسحٰق صاحبؒ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، مولوی فریدالدین صاحبؒ مراد آبادی، مومن خاں، عبداللہ خاں علوی بھی تھے، اور ان کے سامنے تقویۃ الایمان کو پیش کیا اور فرمایا کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً ان امور کو جو شرکِ خفی تھے شرکِ جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہو گی اگر میں یہاں رہتا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے اور وہاں سے واپسی کے بعد عزمِ جہاد ہے اس لیے میں اس کام سے معذور ہو گیا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کوئی دوسرا اس بار کو اُٹھائے گا نہیں۔ اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے گو اس سے شورش ہو گی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے، یہ میرا خیال ہے اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو تو اشاعت کی جائے ورنہ اسے چاک کر دیا جاوے اس پر ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیئے مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہیئے اس پر مولوی عبدالحی صاحبؒ، شاہ اسحٰق صاحبؒ اور عبداللہ خاں علویؒ و مومن خاںؒ نے مخالفت کی اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں۔ اس پر آپس میں گفتگو ہوئی اور گفتگو کے بعد بالاتفاق یہ طے پایا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں ہے اور اسی طرح شائع ہونی چاہیئے چنانچہ اسی طرح سے اس کی اشاعت ہو گئی۔[۹]

خاں صاحبؒ کے اس بیان سے کئی اُمور واضح ہوتے اوّل یہ کہ امام صاحبؒ نے پہلے یہ کتاب عربی میں تصنیف فرمائی اور پھر اس کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے۔ دوم آپ نے جو یہ فرمایا تھا کہ اس میں تشدد بھی ہو گیا ہے تو یاد رہے کہ اس تشدد فی العلاج کا سبب مرض کا شدید ہونا تھا۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا ہے۔ سوم آپ نے یہ کتاب حج پر روانہ ہونے سے قبل تصنیف فرمائی گویا یہ کتاب ۱۸۲۱ء سے قبل کی تصنیف ہے چہارم "تقویۃ الایمان" کے مندرجات اس دور کے علماء اور خاندان ولی اللہی کے اہلِ علم و تحقیق کے تصدیق شدہ ہیں جب ہم حضرت شاہ ولی اللہ کی "حجۃ اللہ البالغہ" "الفوز الکبیر" "الفتوحات الالٰہیۃ" اور "بدور البازغہ" وغیرہ کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے مندرجات کی یکسانیت سے اس امر کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔ پنجم امام صاحبؒ کا شورش کے متعلق اندازہ بہت صحیح ثابت ہوا کیونکہ "تقویۃ الایمان" کے خلاف جو شورش ہوئی ہے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی اور تب سے لیکر اب تک اس کتابِ مقدس کے خلاف ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہے کہ الامان والحفیظ۔ اس سلسلہ میں پہلا ہنگامہ ۱۲۴۰ھ میں نواب محمد میر خاں کی ترغیب سے اس مناظرہ کی صورت میں ہوا جس میں مولوی رشید الدین وغیرہ نے جامع مسجد میں امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحیؒ سے سوالات پوچھے اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حافظ عزیز الدین مراد آبادیؒ فرماتے ہیں :-

> مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد پہلا ہنگامہ اختلافِ مناظرہ جامع مسجد دہلی بوقت صبح سہ شنبہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ جو مابین مولانا شہید مرحوم مع مولانا عبدالحیؒ مولوی رشید الدین خاں صاحب وغیرہ چند مسائل بدعت و رسوماتِ شرکیہ بوسۂ قبر وغیرہ میں دربارہ تقویۃ الایمان ہوا جس میں جمع کثیر علماء و فضلاء و روؤسا وغیرہم تقریباً پانچ ہزار آدمی معہ انتظاماتِ حکام کے تھا۔ یہ روئداد مناظرہ قلمی در مجموعہ رق کتب خانہ مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث ریاست رامپور میں محفوظ ہے۔ پھر مناظرہ دہلی سے بارہ تیرہ یوم بعد مولانا شہید مرحوم کی طرف سے ۱۲ جمادی الاول ۱۲۴۰ھ کو بتائید و تشریح تقویۃ الایمان فتویٰ در مسائل بوسۂ قبر وغیرہ صادر ہوا۔"

استفتاء یہ تھا :- "درصورتیکہ بعض افعال شرکیہ کہ در رسالہ تقویۃ الایمان محرر شدہ مثل نذر لغیر اللہ یعنی توشہ وغیرہ و بوسہ دادن قبر و خلاف انداختن بداں و سوگند بنام غیر اللہ و مثل آنہا از زید صادر شد پس زید را کافر گفتن و خون و مال او را مباح دانستن و دیگر معاملہ کفار با او نمودن جائز است یا نہ"؟

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا :-

زید را کافر محض دانستن و با او معاملہ کفار بمجرد صدور آنچہ در سوال محرر است جائز نیست و ہر کہ با او معاملہ کفار بمجرد صدور افعال مذکورہ نماید گنہگار میشود .... الخ کتبہ محمد اسمٰعیل مصنف تقویۃ الایمان عفی عنہ در شاہجہان آباد و محررہ دوازدہم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۴۰ھ تمام شد ۱۱۔ (محمد اسمٰعیل دہلوی)

سید بغدادیؒ کے اعتراضات

اسی طرح سنہ ۱۲۴۰ھ کی ہی بات ہے کہ سید عبداللہ بغدادیؒ کے ذہن میں بعض مخالفین نے تقویۃ الایمان کے متعلق کئی شبہات پیدا کر دیئے۔ انہوں نے ان کو ایک مکتوب کی شکل میں لکھ کر امام صاحبؒ کی خدمت میں کانپور ارسال کر دیا۔ آپ ان دنوں جہاد کے لیے دعوت و تنظیم کے سلسلے میں داعیوں کے سرخیل کی حیثیت سے کانپور قیام پذیر تھے۔ آپ تک یہ اعتراضات پہنچے تو آپ نے کانپور سے ہی سید بغدادیؒ کی طرف ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں عقلی و نقلی دلائل سے ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے۔

امام صاحبؒ کا یہ مکتوب گرامی جب سید بغدادیؒ کو دہلی میں موصول ہوا تو انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسہ مولانا محمد یعقوبؒ ۱۲ کو بھی سنایا۔ حاضرین مجلس میں سے دو تین احباب نے اس نامۂ مبارک کی نقلیں لے لیں اور پھر مولانا نصیر الدینؒ ۱۳ اور مولانا محبوب علیؒ نے بھی اس کی ایک ایک نقل لے لی۔ یاد رہے حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ نے بھی نصیر الدینؒ کے خط سے اسے اپنے لیے نقل فرما لیا تھا۔ بہر کیف مخالفین نے سید عبداللہ بغدادیؒ کے ذہن میں ان کی اردو سے عدم واقفیت کے باعث "تقویۃ الایمان" کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا کر دیئے تھے، وہ اس مکتوب گرامی کے مطالعہ سے ختم ہو گئے بلکہ انہوں نے امام صاحبؒ

کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کی اور کہا کہ میں چونکہ اردو نہیں جانتا اور مجھے غلط ترجمہ کر کے سنایا گیا اس لیے آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔

مولانا فضل حق رح کے اعتراضات

امام صاحب رح کے معاصرین میں سے سب سے زیادہ جس نے آپ کی مخالفت کی وہ مولانا فضل حق خیر آبادی رح ہیں۔ منطق و فلسفہ میں آپ کا پایا اگرچہ اس قدر بلند تھا کہ سقراط و بقراط اور افلاطون کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے تھے لیکن افسوس کہ آپ کے اعتقادی نظریات بالکل عوامی تھے انہوں نے "تقویۃ الایمان" کی اس عبارت :-

"اس شاہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن و فرشتہ جبرئیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔"

پر بقول امام صاحب رح درج ذیل اعتراضات کیے۔

(۱) اول آنکہ دعویٰ تعلق قدرت الٰہیہ بمثل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی نفسہا باطل است۔

(۲) ثانی آنکہ ذکر دعویٰ مذکور اسأت ادب است بجناب سید المرسلین

(۳) ثالث آنکہ ذکر آں لغو است۔

انہوں نے اس قسم کے اعتراضات پر مشتمل "امتناع النظیر" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ امام صاحب رح نے اس کے جواب میں "امکان النظیر" کے نام سے ایک ہی مجلس میں نہایت متانت، سنجیدگی اور دلائل عقلیہ و نقلیہ سے مدلل بزبان فارسی ایک رسالہ لکھا جو کہ "یک روزہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ قدرت ایک علیحدہ صفت ہے اور تکوین یعنی بنانا ایک دوسری صفت ہے سو وجود مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدرت الٰہی کے تحت داخل ہے تکوین کے تحت نہیں تاکہ اس کا وقوع لازم آئے، "تقویۃ الایمان" کے اس مقام پر بھی یہی ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ رب العزت جل جلالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مثل پیدا کرنے پر قادر ہے اور یہ مقصود نہیں کہ وہ مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کرے گا۔ کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں پھر آپ

نے قدرتِ الٰہی کے ثبوت میں درج ذیل آیت لکھی۔

أَوَ لَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلٰى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيْمُ[۱۴]	کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں، جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ اس آیت میں جمع مذکر کی ضمیر تمام بنی نوعِ انسان کی طرف راجع ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں اور گو اس آیت میں معاد کا بیان ہے مگر اس کے مثل پیدا کرنے پر قادر ہونا اس سے بخوبی ثابت ہے۔

افسوس کہ مولانا خیر آبادیؒ ایسا ذہین انسان اس مسئلہ کو سمجھ نہ سکا یا محض معاصرت، ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار ہو گئے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ امام صاحبؒ کے ٹھوس دلائل کو تسلیم کر کے اپنی غلطی کا اعتراف فرماتے لیکن ہوا یہ کہ اپنے غلط موقف پر ڈٹے رہے اور "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے ایک اور کتاب لکھ ڈالی۔ اس کے جواب میں شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک نامور شاگرد مولانا حیدر علی صاحب ٹونکیؒ نے کتاب لکھی۔ خود مولانا خیر آبادیؒ کے تلمیذِ رشید مولانا سراج الدین لکھنویؒ نے مولانا کی تردید اور امام صاحب کی تائید میں "امکان نظیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و امتناعہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ حکیم سید عبدالحئیؒ فرماتے ہیں۔

"قد بسط القول فيها بسطاً لائقاً يزيف بها اقوال شيخه فضل حق"[۱۵]	آپ نے اس رسالہ میں مسئلہ نہایت شرح و بسط سے بیان فرمایا ہے اور اپنے استاد مولانا فضل حق کے اقوال کی تردید کی ہے۔

مفتی صدر الدین صاحبؒ آزردہ[۱۶] اگرچہ مولانا فضل حق کے استاد بھائی اور گہرے دوست تھے لیکن انہوں نے جب انصاف سے مسئلہ کا جائزہ لیا تو انہیں امام صاحبؒ کے دلائل ہی وزنی محسوس ہوئے۔ اس لیے انہوں نے آپ کی تائید میں کئی تحریریں شائع کرائیں بلکہ آپ تو اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے مولانا خیر آبادیؒ کو امام صاحبؒ کی مخالفت سے روکتے فرمایا کرتے تھے۔

"لا ارضیٰ منک ذلک ولیس ھٰذا بعشک[۱۷]" مجھے آپ کی یہ روش پسند نہیں اور نہ یہ آپ کے شایانِ شان ہے۔

اسی طرح مولانا تراب علی لکھنوی نے بھی حضرت امام صاحبؒ کی تائید میں "افاداتِ ترابیہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو کہ میرٹھ سے ۱۲۶۹ھ میں شائع ہو چکا ہے اس کے دیباچہ میں آپ فرماتے ہیں:۔

"بعد تصنیف رسالہ "تقویۃ الایمان" مولوی فضل حق خیر آبادیؒ نے فقط اس مسئلہ میں خلاف کیا (چونکہ منطقی تھے) اور چند ورق بطور رسالہ کے لکھ کر پاس جناب بحرِ ذخائر علوم عقلیہ ونقلیہ منبع صفاتِ ملکیہ وانسیہ حسنۃ من حسنات سید المرسلین رحبیر سبیل مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کے بھیجے جناب مولوی صاحبؒ نے ان کی تحریر کا جواب مسمّیٰ بہ "یک روزی" ایک دم میں لکھ کر بھیج دیا اور خوب ان کے شبہات کا استیصال کیا بعد ازاں مولوی فضل حق صاحبؒ نے "تحقیق الفتویٰ" تصنیف کیا جناب افادات مآب مولانا حیدر علی ٹونکیؒ (تلمیذ رشید شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) نے خوب دھوم دھام سے اس کا جواب لکھا اور دو رسالہ کبیرہ وصغیرہ اس مسئلہ اور مسائل میں ان کے رد میں تصنیف کیئے بعد ازاں مجمع معقول ومنقول فروع واصول مولوی سراج الدین صاحبؒ سے کہ مولوی فضل[۱۸] امامؒ (والد مولوی فضل حق صاحبؒ) کے شاگرد تھے اور مولوی فضل حقؒ سے اس مسئلہ خاص میں تحریر ہوئی۔ مولوی سراج الدین نے مولوی فضل حق صاحبؒ کو ساکت کیا اور امکان کا اقرار کرالیا اور ان کے رد میں ایک رسالہ تصنیف کیا جو کہ احقر العباد (مولانا تراب علیؒ) کے پاس موجود ہے[۱۹]"

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ علم میں سے جس نے بھی نظرِ انصاف کے ساتھ فریقین کے دلائل کا جائزہ لیا، اس نے ہی امام صاحبؒ کے موقف کو مبنی بر حق وانصاف اور آپ کے دلائل کو ٹھوس، ناقابلِ تردید اور اقرب الی الکتاب والسنۃ قرار دیا۔ مولانا خیر آبادیؒ کے متعلق تو حضرت نواب صدیق حسن خانؒ نے یہاں تک فرما دیا ہے کہ:۔

فانه اول من قام بضده وتصدّی لردّه فی رسائله التی لیست علیها اثارة من علم الکتاب والسنّة[۲۰]

"مولانا خیرآبادیؒ نے سب سے پہلے آپ (امام صاحبؒ) کی اپنے ان رسائل میں مخالفت وتردید کی جنہیں کتاب وسنّت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔"

مولانا محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے مولانا فضل حق کی طرف سے مدافعت اور ان کے اور امام صاحبؒ کے درمیان تقابل کی جو کوشش کی ہے[۲۱]، اس پر ہم اس کے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں کہ یہ "مدعی سست اور گواہ چست" کے مصداق ہے ورنہ مولانا خیرآبادیؒ کے سامنے جب حق واضح ہوا تو انہوں نے خود رجوع فرما لیا تھا۔

مولانا خیرآبادی کا رجوع

آہ! معاصرانہ چشمک کتنی بُری عادت ہے کہ اچھے بھلے اہلِ علم بھی اس کا شکار ہو کر جادہ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں یہ امکان و امتناعِ نظیر کا مسئلہ ایسا تو نہ تھا کہ مولانا خیرآبادیؒ ایسے ذہین انسان کی سمجھ میں نہ آسکتا۔ یہاں بھی معاصرت ــــ بلکہ اصل منافرت ہے ــــ کارفرما تھی تاہم مقامِ مسرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو بھی آخر کار ہدایت نصیب فرمائی اور انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیا چنانچہ مفتی عنایت احمد صاحبؒ فرماتے ہیں[۲۲]

"مولوی فضل حق صاحبؒ بہت نادم تھے اور روتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھ سے سخت غلطی ہوئی ہے کہ میں نے مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کی مخالفت کی وہ بے شک حق پر تھے اور میں غلطی پر تھا مجھ پر جو یہ مصیبت پڑی یہ میرے انہی اعمال کی سزا ہے میری مولوی اسمٰعیلؒ سے دوستی تھی اور میں بھی ان کے ساتھ شہید ہوتا مگر کیا کیا جائے بدایوں والوں نے ابھار کر ان سے بھڑا دیا اور علم کے غرہ میں حق کو باطل کرنے پر تل گیا تم لوگ گمراہ رہنا کہ میں اپنے خیالات باطلہ سے توبہ کرتا ہوں اور اگر میں رہا ہو گیا تو اپنی توبہ شائع کروں گا"[۲۳]

بلکہ مولانا مرحوم تو اس سے بھی پہلے رجوع فرما چکے تھے جیسا کہ امیر خاں صاحبؒ کی بیان کردہ زیج

ذیل حکایت سے ثابت ہے۔

• مولوی عبدالرشید صاحبؒ غازی پوری مولوی فضل حق صاحبؒ سے پڑھتے تھے یہ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے۔ اتفاق سے ان کے ایک دوست مل گئے۔ اس دوست نے کہا کہ چلو مولوی فضل حق صاحب کے یہاں چلیں تم ان کے (مولانا اسمٰعیل صاحبؒ کے) معتقد ہو آج تمہیں تمہارے استاد سے ان پر تبرے سنوائیں گے، انہوں نے کہا چلو۔ جب یہ دونوں وہاں جا کر بیٹھے تو مولوی عبدالرشید صاحب نے کہا کہ حضرت یہ مجھے یہ کہہ کر لائے ہیں کہ مولوی صاحبؒ سے تمہیں مولوی اسمٰعیل پر تبرے سنواؤں گا۔ مولوی فضل حق صاحبؒ نے کہا اچھا اس غرض سے لائے ہیں! اور یہ کہہ کر ان پر بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا میں اور مولوی اسمٰعیلؒ پر تبرا کروں۔ یہ نہیں ہو سکتا جو مجھ سے ہو چکا ہے، وہ بہکانے سکھانے سے ہوا تھا اور اب تو وہ بھی نہیں ہو سکتا اور یہ کہہ کر ان کو اپنی مجلس سے اٹھوا دیا اور فرمایا کہ میرے یہاں کبھی نہ آنا[۲۴]

اچھا ہوا مولانا خیر آبادیؒ نے توبہ کر کے اپنے نامۂ اعمال سے اس سیاہی کو دھو ڈالا، رہی مقابلہ کی بات؛ اگر سوءِ ادب کا احتمال نہ ہو تو عرض کروں کہ مولانا فضل حق مرحوم کیا ان کے والدِ امجد حضرت مولانا فضلِ امامؒ بھی امام صاحبؒ کے مقابلہ کی اس وقت تاب نہ لا سکتے تھے جب کہ آپ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے افق المبین[۲۵] کا سبق پڑھ رہے تھے حالانکہ وہ آپ کے طالب علمی کا دور تھا اور مولانا فضل امامؒ اچھے خاصے عالم تھے[۲۶]

مولوی جمال الدین کی مخالفت

مولوی جمال الدین لکھنوی متوفی (۱۲۷۶ھ) بھی آپ کے زبردست مخالفین میں سے تھے، یہ متعصب قسم کے انسان تھے۔ اپنے مخالفین پر تکفیر و تفسیق کا فتویٰ لگانے میں بڑے جری تھے اور مباحثہ میں شرکت کا جنون کی حد تک شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے امام صاحبؒ پر سوءِ ادب نبوت کا بہتان باندھ کر آپ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ علامہ سید عبدالحیؒ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

قد افرط الجمال فی ذٰلک | جمال الدین نے اس سلسلہ میں بڑی زیادتی کی ہے مصنف "تقویۃ الایمان" تو کجا وہ تو

"تقویۃ الایمان" کو اچھا سمجھنے والے پر بھی کفر کا فتویٰ لگاتا ہے۔ — الایمان" فضلا عن مصنفہ رحمہ اللہ

مولانا نے یہ بالکل بجا فرمایا ہے اس کے تعصب اور عداوت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ حضرت سید صاحبؒ نے جب مولانا محمد علی محدث رامپوریؒ کو اپنا خلیفہ بنا کر مدراس کی طرف دعوت و ارشاد کے لیے روانہ فرمایا اور آپ کی مساعی جمیلہ سے اللہ تعالیٰ نے وہاں کے ہزاروں آدمیوں اور عورتوں کو ہدایت نصیب فرمائی تو یہ جمال الدین صاحب آتش حسد میں جل اُٹھے۔ انہوں نے دیگر اہل بدعت کو ساتھ ملایا اور محدث رامپوریؒ کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا۔ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا، "تقویۃ الایمان" کے نسخے نذر آتش کر دینے میں بھی ذرہ بھر خوف خدا محسوس نہ کیا اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ آپ کے خلاف سازشیں کر کے حکام سے آپ کی مدراس سے جلاوطنی کے احکام نہ صادر کرا دیئے۔[۱۸] پھر اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے "تقویۃ الایمان" کی تقبیح اور معتقدین کی تکفیر میں ایک فتویٰ شائع کر کے خوب مشہور کیا، جب یہ فتویٰ کلکتہ پہنچا تو عامۃ المسلمین جو "تقویۃ الایمان" سے کسب فیض کے سبب شرک و بدعت سے توبہ کر چکے تھے، اسے دیکھ کر تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے تحقیق کے لیے علماء کرام سے استفسار کیا علماء کرام کی ایک بڑی جماعت نے جس میں مولانا غلام سبحان مولانا وارث علی، مولانا عبدالباری قاضی کلکتہ، مولانا سید محمد مراد، مولانا رمضان علی، مولانا سلیمان الہروی، مولانا اکبر شاہ کابلی، مولانا منصور احمد، مولانا نہاد حسین، مولانا ریاض الدین اور مولانا صاحب علی خاں رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین ایسے گرامی علماء شامل تھے، "تقویۃ الایمان کی موافقت و تائید میں مجمل و مفصل دو فتوے دیئے جن سے مذبذب عوام کے شکوک و شبہات رفع ہو گئے مولانا صاحب علی حسینی لکھنویؒ نے ان دونوں فتووں اور "تقویۃ الایمان" کی تائید میں مزید دلائل تحریر فرما کر انہیں ایک رسالہ کی شکل میں شائع فرما دیا۔ یہ رسالہ جب مدراس پہنچا تو اہل بدعت بہت برافروختہ ہوئے اور ابوالعلا خیر الدین محمد گوپاموی نے اس کے جواب میں "خیر الزاد لیوم المعاد" کے نام سے ایک رسالہ لکھ دیا۔ اس کے جواب میں مدراس کے نامور عالم دین مولانا عبدالحق قریشیؒ نے ذی قعدہ ۱۲۵۲ھ میں "تنبیہ الضالین عن طریق سید المرسلین" کے نام سے ایک بلند

پایہ کتاب لکھی، جس میں آپ نے نہ صرف "خیر الزاد" پر تعاقب کیا بلکہ تقویۃ الایمان" کے خلاف دوسرے رسالوں، فتووں اور اشتہارات کا بھی خوب پوسٹ مارٹم کیا، جس سے ایوانہائے شرک و بدعت پر اوس پڑ گئی[۲۹]۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

مولوی فضل رسول بدایونی

مولوی فضل رسول بدایونی[۳۰] بھی حضرت امام صاحبؒ کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے۔ انہوں نے "تقویۃ الایمان" کی مخالفت میں" البوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ ملقب بہ سوط الرحمٰن علی قرن الشیطان"، "سیف الجبار المسلول علی الاعداء الابرار" "احقاق الحق و ابطال الباطل" اور "مقولات عشر" وغیرہ کئی کتابیں لکھیں اور ان میں نہ صرف امام صاحب اور "تقویۃ الایمان" کو ہدف بنایا بلکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحٰقؒ ایسے جلیل القدر بزرگوں کو بھی معاف نہیں کیا، موخر الذکر بزرگ کے دو رسالوں اربعین مسائل اور "مائۃ مسائل کی تردید میں تو بدایونی صاحبؒ نے تصحیح المسائل" در تردید مسائل نجدیہ اراذل" کے نام سے مستقل کتاب بھی لکھی۔

بدایونی صاحب کی ان تمام کتابوں کے جواب میں علماء اہل حدیث نے نہایت قابل قدر کتب تصنیف فرمائیں مثلاً "بوارق" کے جواب میں مولانا قاضی بشیر الدین قنوجیؒ نے" الصواعق الالٰہیۃ لرد الشیاطین اللھابتیہ" اور "تصحیح المسائل" کے جواب میں "تفہیم المسائل" جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔ مولانا محمد تقی خاں صاحب دہلویؒ نے "مقولات عشر" کا جواب ۱۲۶۸ھ میں "النشر" کے نام سے لکھا۔ اسی طرح مولانا حیدر علی ٹونکیؒ نے بھی بدایونی صاحبؒ کی کتابوں کے جواب میں "صیانۃ الاناس عن وسوسۃ الخناس" وغیرہ کئی کتابیں تصنیف فرمائیں الغرض علماء اہل حدیث نے بدایونی صاحبؒ کی ایک ایک کتاب کا جواب لکھا اور خوب لکھا اور اس کے تمام مغالطوں کو طشت از بام کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جزاھم اللہ احسن الجزاء

مولوی بدایونی کے بعد ان کے لڑکے مولوی عبدالقادر اور پوتے عبدالمقتدر صاحب نے "ایصال ثواب" کی نیت سے اس "کار خیر" کو جاری رکھا لیکن ان کے بعد یہ وراثت

بانس بریلی والوں کو منتقل ہوگئی۔

مولوی احمد رضا خاں

مولوی فضل رسول کی وراثت جب بدایوں سے بانس بریلی منتقل ہوگئی تو مولوی احمد رضا خاں نے اپنے تئیں اس کا سب سے زیادہ حق دار ثابت کیا اور "تقویۃ الایمان" اور اس کے معتقدین کی مخالفت یعنی بدعات کی موافقت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور بدعات کی تبلیغ و اشاعت میں اس قدر سرگرمی دکھائی کہ بریلویت نے ایک مستقل فرقے کی صورت اختیار کرلی یاد رہے مولوی احمد رضا خاں نے "تقویۃ الایمان" اور اس کے حامیوں کی مخالفت میں مرصع قسم کی گالیوں پر مشتمل دو درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔

مولوی نعیم مراد آبادی

مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے بھی "تقویۃ الایمان" کی تردید میں " اطیب البیان " — برعکس نہند نام زنگی کافور — کے نام سے کتاب لکھی جس طرح سے کفارِ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ مذمم کہہ کر اپنی شرافت کا ثبوت دیا کرتے تھے اسی طرح مراد آبادی صاحب بھی "تقویۃ الایمان" کو "تفویت الایمان" لکھتے ہیں ہمیں اس سے غرض نہیں وہ جو چاہیں لکھیں البتہ ان کے اس شاہکار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً بلڈ پریشر کے مریض تھے اس لیے انہوں نے اپنی خوش کلامی کے نمونے درج ذیل الفاظ میں یادگار چھوڑے ہیں۔

"ظالم، بے دین، سود اللہ وجہک، مفتری، تھوک دو اس بے حیا کے منہ پر، دشمن دین، بدنصیب، بد باطن، جاہل، بدلگام، نابینا، بدبخت، گمراہ، جھوٹا، دغاباز، نافرجام، قاتلھم اللہ تعالیٰ گستاخ نابکار، بے ایمان، مردود۔

اور انہیں حضرت امام صاحب نور اللہ مرقدہٗ و برد مضجعہٗ کے لیے استعمال کرکے اپنے لیے "زادِ آخرت" بنا لیا ہے۔

مراد آبادیؒ کی یہ کتاب جب چھپ کر بازار میں آئی تو شیخ الاسلام حضرت ابو الوفاء مولانا ثناء اللہ صاحب کے ایماء سے مراد آباد کے نامور فرزند توحید حضرت مولانا حافظ

عزیز الدین صاحب رح نے اس کا جواب سپردِ قلم فرمانا شروع کیا جو کہ کچھ عرصہ تک حضرت سرکار اہلحدیث کے میگزین ہفت روزہ "اہلحدیث" امرتسر میں قسط وار شائع ہوتا رہا، لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور بعد میں بھی اس کی اشاعت کے سامان میسر نہ آسکے۔ تاہم بحمد اللہ یہ ۱۹۶۵ء میں حضرت مولانا ابو الخیر محمد اسمعیل صاحب سلفی مرحوم اور حضرت مولانا ابو الطیب محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی دامت برکاتہم کی مساعی جمیلہ سے "اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان" کے نام سے بڑے سائز کے ۸۸ صفحات پر زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصہ شہود پر جلوہ گر ہو چکا ہے۔ بحمد اللہ اس کی اشاعت کے بعد آج تک بریلوی حضرات میں سے کسی کو اس کے جواب کی جرأت نہیں ہوئی۔ امید ہے اس طویل داستان سرائی سے اس طوفانِ بدتمیزی کی ایک ادنیٰ سی جھلک قارئین کے سامنے آگئی ہوگی جو "تقویۃ الایمان" اور اس کے جلیل القدر مصنف کے خلاف اہلِ بدعت نے برپا کیا ورنہ اس سلسلہ کی تمام کتابوں کے نام شمار کرانے کے لیے کئی دفاتر درکار ہیں۔ چالیس کتابوں کے نام تو قاضی فضل احمد نے بھی ذکر کیے ہیں[۲۴۲] بلکہ مولوی احمد رضا کے بعض ہمنواؤں کے بقول انہوں نے "تقویۃ الایمان" کی تردید میں دو سو کتابیں لکھی ہیں[۲۴۳]۔

اس لیے اگر حضرت بھوجیانی دامت برکاتہم نے یہ فرمایا ہے تو بالکل بجا کہ :-

"اس سارے قبیلے کے دماغوں پر مولانا شہیدؒ کا ہوا سوار اور ان کو "تقویۃ الایمان خولیا" کا مرض لاحق رہا۔ شاید اس میں بالکل مبالغہ نہ ہو کہ رد و کد میں سینکڑوں کتابیں، رسالے اور اشتہار لکھے گئے ہوں گے مگر وہی گھسے پٹے اعتراض، رٹے رٹائے الزام اور وہی ٹکسالی گالیاں" مگر یہ حضرات تھے کہ شاید ان کو کوئی اور کام نہیں تھا کہ رہ رہ کر ان کو تقویۃ الایمان" کا ہی ہول اٹھتا رہا[۲۴۴]۔"

اسی طرح حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے جو یہ درد بھرے دل کے ساتھ لکھا ہے، اس کی صداقت میں کیا شک ہے کہ :-

"۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ سے لے کر اس دن تک جس کو سو برس سے زائد ہوئے شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام

(حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ) کی ۔ جس کی اور فضیلتیں برطرف اس کی شہادت مسلم اور شہدا کی مغفرت مسلم ۔ تکفیر و تذلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت و سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو فقہ و فتاویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی گئی ہو، وہ ابوجہل و ابولہب سے زیادہ دشمن اسلام ۔ ۔ ۔ ج و مرتدین سے زیادہ مارق من الدین و خارج از اسلام، فرعون و ہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر و ضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد و شاگرد بتایا گیا اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لیے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروؤں میں اللہ کے راستے میں کوئی کانٹا نہیں گڑا جن کو خون چھوڑ کر (کہ اس کا ان کے ہاں کیا ذکر) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت و عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنا سر کٹایا۔ تو کیا اس کا یہی گناہ تھا؟ اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین و ایمان، جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی اس وقت یہ غیرتِ ایمانی و حمیتِ اسلامی والے جو ایک کلمہ ر کفر " برداشت نہیں کر سکتے کہاں تھے؟ اور کیا آج بھی شاہ ولی اللہ کے پوتے کے علاوہ کوئی کافر نہیں"؟

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے[۲۵]

دوسرا رُخ

اگر "تقویۃ الایمان" کی توحیدی شعاعوں سے ایک طرف شرک و بدعت کے متوالوں کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انہوں نے "تقویۃ الایمان" اور اس کے قابلِ صد احترام مصنف کے خلاف سب و شتم بلکہ تکفیر و تضلیل کی اندھا دھند گولہ

باری شروع کردی جیسا کہ سابقہ صفحات میں ذکر کیا گیا تو دوسری طرف توحید کے فرزندوں اور سنت کے شیدائیوں کو اس سے بے پناہ مسرت اور ان کے ایمان کو اس سے جلا بھی نصیب ہوئی اس لیے وہ بڑی عقیدت سے تقویۃ الایمان " کی مدح و ستائش اور اس کے مصنف کے حضور تحسین و آفرین کے پھول پیش کرتے آئے ہیں ذیل میں ہم چند مشاہیر اہل علم کے اس سلسلہ میں ارشادات نقل کرتے ہیں تاکہ تصویر کا یہ رخ بھی واضح طور پر سامنے آجائے۔

مفتی صدر الدین

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد رشید اور حضرت نواب والاجاہ سید صدیق حسن خاںؒ و مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے استاد محترم جناب مفتی صدر الدین صاحبؒ سے استفتاء کیا گیا کہ " تقویۃ الایمان " اور نصیحۃ المسلمین " مصنفہ مولانا خرم علیؒ کے مطابق عمل کرنا کیسا ہے ؟ اور جو ان کے مصنفوں کو کافر اور گمراہ کہے وہ کیسا ہے ؟ مفتی صاحبؒ نے اس کے جواب میں فرمایا :۔

نصیحۃ المسلمین اس فقیر کی نظر سے نہیں گزری اور نہ اس کے مولف کا حال تفصیلی معلوم ہوا ہے[۳۶] لیکن اگر اس کتاب میں شرک کی برائی کا بیان ہے تو اس کے اچھے ہونے میں کس کو کلام ہے ؟ اور " تقویۃ الایمان " کو نظر اجمالی سے دیکھا ہے باعتبار اصول اور اصل مقصود کے بہت خوب ہے اور مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کو ایسا دیکھا کہ پھر کسی کو ایسا نہ دیکھا یہ لوگ ان میں سے ہیں جن کے حق میں حق سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ــــ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝[۳۷]

اور یہ فرمایا ــــ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝[۳۸] يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝[۳۹] پس جو ان کو کافر اور گمراہ کہے

وہ آپ گمراہ ہے، واللہ اعلم بالصواب۔
حررہ، محمد صدر الدین

محمد صدر الدین ۱۲۶۸ھ

مفتی سعد اللہ صاحبؒ

مفتی سعد اللہ بن نظام الدین مراد آبادی رامپوری متوفی ۱۲۹۳ھ جو کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد ہیں، اپنے فتویٰ میں فرماتے ہیں۔

ہو الموفق بندہ سراپا گناہ محمد سعد اللہ عفا اللہ عنہ باخباہ میگویم کہ مولانا محمد اسمٰعیل مغفور عالم ربانی و مصدر فیوض یزدانی بودند و قوت نظریہ از علوم عقلیہ و نقلیہ بآں مرتبہ داشتند کہ زبان ناطقہ مشاہیر علماء عصر در جنب تقریر شان لال بودند و حاسدین اہل علم را رو برو ایشاں بجز سر بخموشی در گلو حرف زدن محال مے نمود و در بیان مسائل شرعیہ و ہدایت امور دینیہ حضرت ایشاں را مصداق لا یخافون لومۃ لائم یافتہ ام و بر خلوص دینی و حق گوئی و صدق نیت و حسن طویت بحقیقت ایشاں اعمال و آثار کالشمس علی رابعۃ النہار شاہد عدل است۔۔۔۔۔۔

العبد المذنب الاواہ مفتی محمد سعد اللہ

محمد سعد اللہ ۱۲۶۹

حضرت میاں صاحبؒ

حضرت شاہ عبد العزیزؒ و شاہ محمد اسحٰقؒ کی بابرکت مجلسوں کے فیض یافتہ حدیث و فقہ کے لاثانی عالم، شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ متوفی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء جو کہ پچاس برس تک مسندِ تدریس پر جلوہ افروز رہے فرماتے ہیں:۔

"تحریر اور تقریر مولانا صاحبؒ کی "تقویۃ الایمان" میں مثل تحریر و تقریر

امام رازی مفسر "تفسیر کبیر" کے ہیں اور مسائل اور احکام مندرجہ "تقویۃ الایمان" موافق کتب اہل سنت کے ہیں اور جب کہ یہ مضمون عالی مقصود اعظم متفق علیہ جماعت انبیاء اور اولیاء اور علمائے اوّلین و آخرین کا یعنی مضمون دفع شرک و بدعت اور اثبات توحید ذاتی اور صفاتی اور اعلائے کلمۃ اللہ اور احیائے سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرف مقاصد دینی قرار پایا، پھر غور کیا چاہیئے کہ جو کتاب محتوی اور حامل اس مضمون شریف کو ہے، وہ کس مرتبہ کی اشرف اور لائق تعظیم و تکریم ہو گی، اور "تقویۃ الایمان" میں اوّل سے آخر تک یہی مضمون مندرج ہے۔"[۲۴۴]

مولانا گنگوہیؒ

مشہور حنفی عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں :—

"کتاب تقویۃ الایمان" نہایت عمدہ اور سچی کتاب اور موجب قوت و اصلاح ایمان کی ہے اور قرآن و حدیث کا مطلب پورا اس میں ہے اس کا مؤلف ایک مقبول بندہ تھا۔"[۲۴۵]

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :—

"کتاب تقویۃ الایمان" نہایت عمدہ کتاب ہے اور ردِ شرک و کفر میں لاجواب ہے استدلال اس کے بالکل کتاب اللہ اور احادیث سے ہیں اس کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام ہے اور موجب اجر کا ہے اس کے رکھنے کو جو برا کہتا ہے وہ فاسق و فاجر اور بدعتی ہے اگر اپنے جہل سے کوئی اس کتاب کی خوبی کو نہ سمجھے تو اس کا قصور فہم ہے، کتاب اور مؤلف کتاب کی کیا تقصیر؟ بڑے بڑے عالم اہل حق اس کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر کسی گمراہ نے اس کو برا کہا تو وہ خود ضال و مضل ہے۔"[۲۴۶]

مولانا امیر شاہ خاں صاحبؒ نے آپ کا درج ذیل قول بھی نقل کیا ہے، جو کہ "تقویۃ الایمان" کی مخالفت کرنے والوں کو خصوصی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

"مولانا گنگوہیؒ "تقویۃ الایمان" کی نسبت فرماتے تھے کہ اس سے بہت ہی نفع ہوا چنانچہ مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کی حیات ہی میں دو ڈھائی لاکھ آدمی درست ہو گئے تھے اور ان کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔" ؎

کعبہ را ہر دم تجلّی مے فزود
ایں از اخلاصاتِ ابراہیمؑ بود؎

مولانا محمود الحسن

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ فرماتے ہیں :-

"عالم نبیل فاضل جلیل نمونہ علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل مولانا الحافظ الحاج مولوی اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ وعلیٰ آبائہ الکرام نے جب اپنے زمانہ میں امورِ شرک و بدعت کا رواج زیادہ دیکھا تو مولانا ممدوح نے بمقتضائے تائید دین جہاں تک ہو سکا زبان سے نصیحت فرمائی، تحریروں کی بھی نوبت آئی چنانچہ رسالہ "تقویۃ الایمان" بھی جب ہی لکھا جس میں نصوصِ صریحہ سے نہایت سلاست کے ساتھ مضامینِ توحید کو اچھی طرح بیان فرمایا اور قدرتِ حق تعالیٰ شانہٗ کو جملہ بنی آدم و مخلوقات پر ثابت کر کے اہلِ شرک و بدعت کو ان کے خیالاتِ باطلہ کی خرابی پر مطلع فرمایا۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت و صحت عقائد نصیب ہوئی"

علامہ سلیمان ندویؒ

برصغیر پاک و ہند کے نامور محقق عالم دین حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں :-

"قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" میرے ہاتھ

میں دین کی پہلی کتاب دی گئی۔ میں ان بھیوں کے بیچ میں بیٹھ کر "تقویۃ الایمان" کی ایک ایک بات پڑھتا تھا اور بھائی صاحب[۴۸] مرحوم پردہ کے پیچھے سے ایک ایک مسئلہ کی تشریح و تفسیر فرماتے اور جو وہ فرماتے میرے دل میں بیٹھ جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالیؒ و رازیؒ و ابنِ رشدؒ کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہر حال اپنی جگہ پر قائم رہی ہے[۴۹]

مولانا سندھیؒ

مشہور سیاسی لیڈر اور ممتاز عالم دین حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں :۔

"تحفۃ الہند کے بعد جو دوسری کتاب ہمارے ہاتھ میں آئی وہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" تھی، جو اس سوال کا جواب شافی تھی اور جس سے ہم کو معلوم ہو گیا کہ اسلام کی توحید بالکل خالص ہے[۵۰]"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

"یہ کتاب اگر پانچ سو برس پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا[۵۱]"

مزید فرمایا :۔

"اسلام کے اظہار سے پہلے میں نے شاہ صاحبؒ کی "تقویۃ الایمان" پڑھی تھی چنانچہ ردِ شرک کے متعلق مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا بلکہ ایک لحاظ سے یہ کتاب مجھے اسلام میں لانے کا ذریعہ بنی۔ غرضیکہ امام

محمد اسمٰعیلؒ میرے اُستاد اور امام ہیں اور مجھے ان سے محبت ہے،
ایسی محبت جس طرح لوگ اپنے مذاہب کے ائمہ سے کرتے ہیں۔[52]

ناظرینِ کرام! غور فرمائیں کہ حالات کی یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ یہ کتاب اگر کافر پڑھیں تو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے پر مجبور ہو جائیں اور مسلمان کہلائیں اور اگر مسلمان اسے پڑھیں تو وہ وہابی و بدمذہب کہلائیں۔ الغرض بے شمار اربابِ علم و فضل نے حضرت امام صاحبؒ کی اس مقدس تصنیف پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیے ہیں جن میں سے اختصار کے پیشِ نظر چند ایک کو جمع کر کے آپ کی خدمت میں گلدستہ پیش کر دیا گیا ہے اب ہم اس سلسلہ کو مولانا فتح اللہ صاحب مرحوم کے درجِ ذیل اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

تھے جو اسمٰعیل غازی مولوی — علم کے دریا مراتب میں ولی
اک کتابِ حق انہوں نے جب لکھی — اس میں تفریقِ حق و باطل کی ہوئی
پھر گیا جو مردِ ناہنجار ہے

جس پہ ہو جاوے ذرا الطافِ حق — تقویتِ ایمان کا لیوے سبق
طبعِ اسمٰعیلؒ کا روشن طبق — ہر جزو اس کا ہے ہدایت کا ورق
شرک کے حق میں عجب تلوار ہے

مومنوں کے حق میں تقویت ہے وہ — فاسقوں کو باعثِ لعنت ہے وہ
فاقبلوا من ربکم نعمت ہے وہ — قد خلت من قبلکم سنت ہے وہ
آسمانی علم کا اظہار ہے[53]

تقویۃ الایمان اور اسکی شرح

جو کام اخلاصِ نیت کے ساتھ کیا جائے اللہ تعالیٰ اس میں برکت فرما دیتے ہیں معلوم نہیں امام صاحبؒ نے کس قدر جذبۂ صادقہ، پاکیزہ عزم اور خلوصِ نیت کے ساتھ اس صحیفۂ توحید کو تصنیف فرمایا کہ اسے بے پناہ قبول فی الارض کا شرف نصیب ہوا اس کی افادیت اور علمائے کرام کے اس کے متعلق ارشادات ذکر کیے جا چکے ہیں، اب ہم اختصار کے ساتھ اس کی چند شروح کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ توقیۃ الایقان شرح تقویۃ الایمان

تقویۃ الایمان کی یہ شرح مولانا عبدالقہار بن عبدالجبار ساکن گوالیار نے لکھی ہے اس کے ورق پہ تعارف یوں ہے :۔

"وَاِذَا ذَکَرۡتَ رَبَّکَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا۔ الحمدللہ والمنتہ"

کتاب تقویۃ الایمان جو قاطع بیخ شرک وطغیان مغز توحید ولفز ایمان مستند بحدیث وقرآن خالق ومخلوق کے درمیان فرق بتلاتے ہیں بے نظیر اور دل پذیر ہے سو اس کی شرح مسمی "توقیۃ الایقان شرح تقویۃ الایمان" کہ جس کا شارح علامہ نے شرک پسندوں کے شبہات اور واہی اعتراضات بخوبی دفع کیا اور اصل کتاب کے مطلب پہ اہل سنت کے قدیم معتبر کتابوں کے ساتھ مطابقت تامہ تبلایا ہے ۔ لبفرمائش انجمن حزب اللہ بحواشی تازہ بار دوم محلی بطبع ہوئی المطبعۃ المحمدیۃ الواقعۃ فی معسکر بنگلور ۱۲۹۲ھ رمضان۔ یہ شرح فل سکیپ سائز کے ۲۶۸ صفحات پہ مشتمل ہے اس میں شارح نے "تقویۃ الایمان" کے ہر اس مقام کی تفصیل وشرح کی کوشش کی ہے جس میں اغلاق کا کچھ بھی شائبہ تھا۔ نیز نہایت شرح وبسط کے ساتھ معترضین کے تمام اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ بنگلور کے مولانا عبدالباری اور دہلی کے مولانا محمد داؤد راز کے کتب خانوں میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔

۲۔ اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مراد آباد کے مولوی نعیم نے بھی تقویۃ الایمان" کی تردید میں" اطیب البیان" کے نام سے کتاب لکھی اور حافظ عزیز الدین صاحبؒ نے اس کا "اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان" کے نام سے جواب لکھا۔ اس میں آپ نے نعیم صاحب اور بریلوی کیمپ کے "تقویۃ الایمان" پہ جملہ اعتراضات کا بڑی عمدگی سے جائزہ لیا ہے اور نہایت ٹھوس، مدلل اور مسکت جواب دیئے ہیں جس کی وجہ سے یہ کتاب صرف "اطیب البیان" کا رد ہی نہیں بلکہ "تقویۃ الایمان" کی ایک مفصل، مستند اور جامع شرح کی بھی حیثیت رکھتی ہے یہ شرح متوسط سائز کے ۸۰۰ صفحات پر المکتبۃ السلفیہ، لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۶۵ء

میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

۳۔ المنہج السدید فی ردّ التقلید

یہ امام صاحبؒ کے تلمیذ مولانا عبداللہ خاں علویؒ کی "تقویۃ الایمان" کے متن کی شرح ہے، جیساکہ اس کے متن میں مذکور ہے اس کا ایک مخطوطہ امیرالملک حضرت نواب صدیق خاں صاحبؒ کے خزانۃ الکتب میں تھا۔[۱۵]

۴۔ فیض الرحمٰن لتائید تقویۃ الایمان

"تقویۃ الایمان" کے سلسلہ کی بعض مفید معلومات پر مشتمل یہ مولانا محمد داؤد راز سلفی ساکن موضع راہیواہ ضلع گوڑگاؤں کا مقالہ ہے جو کہ قریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہے اور "تقویۃ الایمان" کے اس ایڈیشن کے ساتھ ملحق ہے جو مولانا موصوف ہی کے زیرِ اہتمام نہایت صحت کے ساتھ ۱۳۸۳ھ میں ادارہ اشاعتِ دین ۱۲۱۴۔ اجمیری گیٹ دہلی سے شائع ہوا۔

علاوہ ازیں میر شہامت علی نے "تقویۃ الایمان" کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا اس کا ایک جدید ایڈیشن حال ہی میں شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور کے زیرِ اہتمام طبع ہوا ہے۔

تقویۃ الایمان اور اس کا ادبی پہلو

"تقویۃ الایمان" اگرچہ اس دور کی تصنیف ہے جو کہ اردو زبان میں نثر نگاری و انشاء پردازی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا لیکن حضرت امام صاحبؒ نے اس کتاب کو اس قدر عام فہم، سلیس، سادہ، دل کش اور شگفتہ عبارت میں لکھا ہے کہ ان چند الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر جو آج متروک ہو چکے ہیں آج بھی ایسے دل نشین انداز میں لکھنا آسان نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں جب کہ اُردو زبان میں گنتی کی چند کتابیں تھیں اور اُردو کو ابھی گھٹنوں چلنا نہ آیا تھا، امام صاحبؒ نے اس میں کیا سحر کر دکھایا ہے اور اپنے خیالات کا کس قدر خوش اسلوبی سے اظہار کیا ہے غرضیکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے اور اس کا طرزِ تحریر ایسا مؤثر اور پُرزور ہے کہ بقول صاحب "سیر المصنفین"

"ایک دریائے ذخار اُمڈا چلا آتا ہے"[۵۵]

چنانچہ سلاستِ تحریر، روانیٔ بیان اور زورِ قلم کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے :-

"سننا چاہیئے کہ اکثر لوگ پیروں کو پیغمبروں کو اور اماموں کو اور شہیدوں کو اور فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانتے ہیں اور حاجت برآئی کے لیے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لیے اپنے بیٹوں کو ان کی طرف نسبت کرتے ہیں کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش کوئی پیر بخش کوئی مدار بخش کوئی سالار بخش، کوئی غلام محی الدین، کوئی غلام معین الدین اور ان کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہنتا ہے، کوئی کسی کے نام کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کے نام کے جانور حلال کرتا ہے، کوئی مشکل کے وقت کسی کی دُہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے غرضیکہ جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں سو وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان اولیاء اور انبیاء سے اور اماموں اور شہیدوں سے اور فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانی کا کیئے جاتے ہیں، سبحان اللہ! یہ منہ اور یہ دعویٰ!"[۵۶]

تمام کتاب پڑھ جایئے جس طرح قاری آپ کی علمی قابلیت اور قوتِ استدلال پر عش عش کر اٹھتا ہے اسی طرح جب وہ ادبی نقطۂ نظر سے کتاب کے محاسن پر نگاہ ڈالتا ہے تو ایک ایک جملے پر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے سبحان اللہ! اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا گنگا اور جمنا نے اپنی تمام تر روانیاں حضرتِ امام صاحب کے قلم فیض رقم پر نثار کر دی ہیں الغرض تقویۃ الایمان "اردو نثر کا شاہکار ہے یقیناً ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کی ادبیت میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی اور اردو زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی اسے اپنا

ایک گراں قدر سرمایہ تصور کرے گی۔ اُردو زبان کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

"عجیب لُطف یہ ہے کہ زبان کی عام فہمی دیکھ مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا یعنی ۱۸۰۷ء میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی اسمٰعیل صاحبؒ نے بعض رسالے عام اہلِ اسلام کی فہمائش کے لیے اُردو میں لکھے"[۵۷]

ڈاکٹر قیام الدین نے بھی تحریک کی مجموعی حیثیت سے اردو کی خدمت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

" وہابی تحریک کا ایک اہم اور نظروں سے پوشیدہ ضمنی فیضان وہ زوردار جنبش ہے جو اس نے اُردو زبان خصوصاً نثر نگاری کی رفتار کو ترقی دی۔ اپنے پیغاموں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش میں اور تبلیغی تحریکوں کی طرح اس نے مقامی زبانوں کے استعمال پر بہت زور لگایا۔ اگرچہ اعلیٰ طبقوں کی عام زبان فارسی تھی، وہابی قائدین نے اُردو کا زیادہ استعمال کیا اور اسی زبان میں بہت زیادہ رسالے لکھے[۵۸]۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے بھی لکھا ہے کہ :۔

۔ مولوی اسمٰعیل صاحب کا مشہور رسالہ "تقویۃ الایمان" اور نیز دیگر مریدانِ مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب الجہاد، ہدایت المسلمین، نصیحۃ المومنین (المسلمین) موضح الکبائر والبدعات، مائۃ مسائل وغیرہ ان سب سے زیادہ زبانِ اردو کو بھی تقویت پہنچی ہے[۵۹]

حقیقت یہ ہے کہ امام صاحبؒ اور آپ کے رفقاء کی اردو تصنیفات سے اردو نثر کو بڑی تقویت نصیب ہوئی بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو جسے علمی حلقوں میں کوئی پوچھتا نہ تھا، اب ایک

ایسی ادبی زبان ہوگئی جو فارسی کی نیابت کر سکتی تھی۔

"تقویۃ الایمان" اور اس کے نسخے

(۱) تقویۃ الایمان" ۱۸۲۲ء کو تصنیف کی گئی اور ۱۸۲۶ء میں غالباً سید عبداللہ بن سید بہادر علی کے اہتمام سے پہلی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی جب کہ امام صاحبؒ اپنے رفقاء سمیت وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے پنجتار تشریف لے جا چکے تھے اور سکھوں کے خلاف باقاعدہ محاذِ جنگ قائم کر چکے تھے تب سے کر اب تک اہلِ بدعت کے اس کے خلاف برپا کئے گئے طوفانِ بدتمیزی کے علی الرغم سینکڑوں ایڈیشن پچاس، ساٹھ لاکھ کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں اور دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شرفِ قبولیت اُردو زبان کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کے تمام نسخوں کا ذکر تو ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے لہذا ذیل میں اس کے مطبوعہ و مخطوطہ چند نسخوں کی طرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۲) "تقویۃ الایمان" کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں ہے اس پر سنِ کتابت ۱۲۴۶ھ مرقوم ہے۔ گویا یہ نسخہ اس سال کا لکھا ہوا ہے جس میں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا:۔

(۳) ایک قلمی نسخہ مولانا محمد صابر عثمانی مرحوم کے کتب خانہ میں بھی موجود تھا۔ اس پر سنِ کتابت ۱۲۴۳ھ مرقوم ہے۔

(۴) ۱۲۶۵ھ کا مکتوبہ نسخہ مولانا نسیم احمد صاحبؒ فریدی امروہی کے کتب خانہ میں ہے جس کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"قد تمت هذه الرسالة المسمى بتقوية الايمان من تصنيف مولانا اسمعيل صاحب دهلویؒ"

(۵) ۱۲ محرم ۱۲۶۷ھ کو مطبع محمدی دہلی میں حافظ محمد بیر خاں کے اہتمام سے "تقویۃ الایمان" کا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس پر مولانا محبوب علی دہلویؒ کا حاشیہ بھی تھا۔ محشیؒ نے کتاب کے آخر کی ایک عبارت پر حاشیہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

" افسوس ایسے موحد، محبِ رسُول کی کہ آخر اس راہ میں شہید ہوئے گور پرست لامذہبوں نے کچھ قدر نہ سمجھی، وہابی کہا بلکہ بزرگوں کا منکر ٹھہرایا۔ الخ

اس ایڈیشن کی ایک قلمی نقل بھی مولانا نسیم امروہی کے کتب خانہ میں ہے۔

(۶) "تقویۃ الایمان" کی شرح توقیۃ الایقان (جس کا ذکر کیا جا چکا ہے) جو کہ بڑے سائز کے ۲۹۸ صفحات پر ۱۲۹۲ھ کو بنگلور سے شائع ہوئی اس کے ساتھ "تقویۃ الایمان" کا متن بھی شائع ہوا تھا۔

(۷) ایک بہترین مستند و صحیح نسخہ وہ ہے جسے مولانا محی الدین نومسلم لاہوری نے ۱۳۰۵ھ میں طبع کرایا۔ اس کے ساتھ تذکیر الاخوان اور حاشیہ پر اغاثۃ اللہفان مترجم اُردو بھی طبع ہوئی ہے۔

(۸) ۱۳۴۰ھ میں مولانا محی الدین قصوری بی۔ اے نے بڑی عقیدت سے بہتر سے بہتر انداز میں شائع کرنے کی کوشش کی۔ جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہے۔

(۹) ۱۳۸۳ھ میں مولانا محمد داؤد راز صاحبؒ نے ایک بہترین مستند اور شاندار نسخہ ادارہ اشاعتِ دین اجمیری گیٹ دہلی سے شائع کیا۔ اس کے ابتداء میں ۳۲ صفحات کا پیش لفظ اور آخر میں تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل "فیض الرحمٰن لتائید تقویۃ الایمان" کے نام سے ایک مقالہ بھی ہے۔

(۱۰) "تقویۃ الایمان" کا ایک ایڈیشن فاروقی کتب خانہ ملتان کے زیر اہتمام بھی طبع ہوا ہے جس پر سالِ طباعت درج نہیں اس نسخہ کے ابتداء میں مولانا غلام رسول مہرؒ کے قلم سے حضرت امام صاحبؒ و سیّد صاحبؒ کے مختصر سوانح حیات اور آخر میں شیخ فتح اللہ صاحبؒ کا رسالہ "حارق الاشرار" طبع ہوا ہے۔

(۱۱) "تقویۃ الایمان" کا سب سے جدید ایڈیشن وہ ہے جسے اہلحدیث اکادمی۔ لاہور نے نہایت احسن انداز میں خوبصورت سرِ ورق کے ساتھ ۱۹۶۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا اس کے آغاز میں بھی حضرت مہر مرحوم کے قلم سے امام صاحبؒ کے مختصر سوانح حیات ہیں اہلحدیث

اکادمی کے زیرِ اہتمام فروری ۱۹۷۳ء تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

۳۔ تذکیر الاخوان

جیسا کہ ذکر کیا گیا امام صاحبؒ نے اپنی عربی تصنیف ، " رد الاشراک " کے باب اوّل کا " تقویۃ الایمان " کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن جہاد میں مصروف ہو جانے کے باعث اس کے دوسرے باب " الاعتصام بالسنۃ والاجتناب عن البدعۃ " کا ترجمہ نہ کر سکے ۔ اس کا ترجمہ آپ کے تلمیذ محمد سلطان نے کیا ہے اور اسے " تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان " کے نام سے موسوم کیا ہے چنانچہ انہوں نے " تذکیر الاخوان " کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے :۔

" ایک فاضل جلیل متشرع دیندار (امام صاحبؒ) نے شرک اور بدعت کی برائی کے بیان میں ایک رسالہ " تقویۃ الایمان " لکھا اور اس میں صرف آیتیں اور حدیثیں جمع کیں اور اس کے دو باب ٹھہرائے ایک باب میں توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں ہندی (اردو) زبان میں بیان کیں اور دوسرے باب میں اتباعِ سنت کی خوبیاں اور بدعت کی برائیاں اور تفصیل بعض بدعات کی آیت اور حدیث سے ذکر کی اور ارادہ ہندی (اردو) ترجمے کا کیا مگر فرصت نہ پائی اور راہِ خدا میں جان دی ۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

اب سن بارہ سو پچاس (۱۲۵۰ھ) میں اللہ تعالیٰ نے اس خاکسار گناہ گار ہیچمدان محمد سلطان کے دل میں ارادہ ، اس کے ترجمہ کا ڈالا سو اس دوسرے باب کا ترجمہ ہندی (اردو) بولی میں شروع کیا اور " تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان " اس کا نام رکھا " الخ

" تذکیر الاخوان " میں اعتصام بالسنہ ، اجتناب عن البدعہ ، ذکر صحابہ و اہل بیت ، ردِ بدعاتِ قبور ، بدعاتِ تقلید اور دیگر معاشی و معاشرتی اور اخلاقی برائیوں وغیرہ عنوانات پر کتاب و سنت کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ کسی نے ان دونوں کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا کہ " تقویۃ الایمان " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تشریح اور تذکیر الاخوان مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

کی توضیح ہے۔

"تذکیر الاخوان" کے بھی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ علامہ سید اولاد حسن قنوجی (والد محترم حضرت نواب صاحبؒ) نے اس پر "راہِ سنت" کے نام سے نہایت مفید حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں۔ "تذکیر الاخوان" کا ایک ایڈیشن سید عنایت اللہ کے زیر اہتمام ۱۲۷۱ھ میں ۲۰×۲۶ سائز کے ۲۹۰ صفحات پر مطبع صدیقی دہلی سے شائع ہوا۔ منشی محمد ابراہیم کے اہتمام سے رجب ۱۳۱۱ھ میں مطبع افتخار دہلی سے بھی ۲۲۶ صفحات پر اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا۔ اسی طرح راشد کمپنی دیوبند نے بھی ایک مرتبہ اسے شائع کیا تھا۔ اور حال ہی میں اس کا ایک نیا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔

۴۔ صراط المستقیم آپ کی یہ کتاب بزبانِ فارسی ہے جس میں آپ نے حضرت سید احمد صاحبؒ کے ملفوظات کو ترتیب دیا ہے چنانچہ مقصدِ تالیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

> ۔ اس کمترین پر خدا تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں اور سب سے بڑی نعمت ہادی زمانہ مرشد یگانہ حضرت سید احمد صاحبؒ کی محفلِ ہدایت منزل میں حاضر ہونا ہے اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو آپ کے دیر تک زندہ رکھنے سے فائدہ دے اور آپ کے اقوال اور افعال اور احوال کے ساتھ سب طالبانِ (قربِ الٰہی) کو نفع پہنچاوے اور چونکہ یہ عاجز اس مجلسِ عالی میں حاضر ہونے کے وقت کلماتِ ہدایت آیات کے سننے میں کامیاب ہوا تو عام مسلمانوں کی نصیحت اور طالبانِ قربِ الٰہی کی خیر خواہی کا یہ تقاضا ہوا کہ غائبین بھی اس فیوضِ الٰہیہ میں حاضرین کے ساتھ شریک ہوں اور اس کا طریق اس کے بغیر اور کوئی نہیں کہ ان بلند پرواز مضامین کو احاطۂ تحریر میں لایا جائے[۱]

یہ کتاب مقدمہ، چار ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب میں آپ کے رفیقِ خاص حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ بھی شریک رہے جیسا کہ آپ نے مقدمہ میں صراحت فرمائی ہے

چنانچہ دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالحی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ مقدمہ تین افادوں پر مشتمل ہے افادہ اوّل میں حب عشقی و عقلی افادہ دوئم میں راہِ نبوت و راہِ ولایت اور افادہ سوم میں مضامینِ کتاب کی تقدیم و تاخیر کے سبب کو بیان کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں طریقِ نبوت وولایت میں جن وجوہ سے امتیاز ہوتا ہے ان کی دلنشین انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ باب دوم میں عبادات کے ادا کرنے، عمدہ صفات کے اپنانے اور بُری صفات کے ترک کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں یہ باب مقدمہ، چار فصلوں اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ باب سوم راہِ ولایت کے سلوک کے بیان میں ہے اس میں چار فصل اور تکملہ ہے اور باب چہارم سلوکِ راہِ نبوت کے بیان میں ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ سید صاحبؒ کے ملفوظات کو ترتیب دیا گیا ہے جو کہ تصوف و اخلاق اور نصائح وغیرہ پر مشتمل ہیں تاہم یہ کتاب بھی الفاظ کی بندش، عبارت کی عمدگی اور دلنشین طرزِ نگارش کے اعتبار سے مصنفین کا شاہکار ہے۔ امام صاحبؒ، سید صاحبؒ اور دیگر رفقا سمیت جب فریضۂ حج کی ادائی کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو آپ نے اور مولانا عبدالحی ؒ نے شیخ حسین آفندی کی خاطر "صراطِ مستقیم" کا عربی میں ترجمہ بھی کر دیا تھا جس کی نقلیں ان علماء نے بھی لے لی تھیں جو داخل بیعت ہو گئے تھے۔ اس ترجمہ کا ایک مکمل نسخہ صاحبزادہ عبدالرحیم خاں مرحوم کے کتب خانہ ٹونک میں بھی موجود تھا[۶۳]

مخالفین نے "صراطِ المستقیم" پر کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں جن کا تجزیہ آئندہ صفحات میں "اعتراضات اور ان کی حقیقت" باب کے ضمن میں کیا جائے گا۔ کچھ لوگوں نے تو اس کی تردید میں مستقل رسالے بھی لکھے مثلاً مشہور شیعہ عالم مولوی دلدار علی کے شاگرد مولوی علی بن حسن المعروف بہ مشرف علی خاں نے "ازاحۃ الغی فی الرد علی عبدالحی" کے نام سے "صراطِ المستقیم" کی تردید میں رسالہ لکھا[۶۴]۔ اسی طرح مولوی دلدار علی کے ایک دوسرے شاگرد مولوی محمد قلی کنتوری نے بھی "الفتوحات الحیدریہ" کے نام سے اس کی تردید میں رسالہ لکھا[۶۵]۔ یاد رہے شیعہ حضرات نے یہ زحمت شاید اس لیے اٹھائی کہ کتاب کے دوسرے باب کے دوسرے حصّہ میں ان بدعات کی تردید ہے جو اہلِ سنت نے شیعوں سے اخذ کر لی ہیں مثلاً عزاداری، تعزیہ سازی اور عقیدہ تفضیلِ حضرت علیؓ وغیرہ۔

"صراط مستقیم" میں تصوف و اخلاق کے علاوہ ان تمام اقسام کی بدعات کی تردید بھی ہے جو اس وقت معاشرہ میں رواج پذیر تھیں شیخ محمد اکرام مرحوم[۹۹] نے بہت خوب لکھا ہے

"صراط مستقیم" میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی خرابیوں کا بالتفصیل بیان ہے اور نہ صرف مرض کی تشخیص بلکہ علاج بھی صحیح تجویز کر دیا گیا ہے اور جس طرح ایک طبیب کامل مرض کے مختلف آثار دیکھ کر ہر خرابی کے لیے مختلف نسخے نہیں تجویز کرتا بلکہ ایک ایسی دوا تجویز کرتا ہے جو تمام امراض کی جڑ کو قطع کرے اسی طرح مولانا نے بھی قوم کی خرابیوں کے لیے اصولی نسخہ تجویز کیا چونکہ یہ تمام خرابیاں جو مختلف قسموں کی تھیں اور مختلف رستوں سے داخل ہوئیں، حقیقتاً اسی وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کی سنت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے قوم کی نجات اسی میں تھی کہ ہر وہ رسم جو سنت نبویؐ اور طریق صحابہؓ کے خلاف ہو یا بعد میں جاری ہوئی ہو، ترک کی جائے۔ سید صاحبؒ کا ارشاد ہے

"تمام رسوم ہند و سندھ و فارس و روم را کہ خلاف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم باشد یا زیادتی از طریقہ صحابہؓ شود ترک نماید و انکار و کراہت بر آں اظہار کند"[۱۰۰]

"صراط المستقیم" کے اور بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا عبدالجبار کانپوریؒ نے اس کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا، جو چھپ چکا ہے۔ غالباً اسی ترجمہ کی ترمیم و تزئین مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی نے کی اور فارسی و عربی اشعار کا ترجمہ کر دیا جسے حال ہی میں کلام کمپنی کراچی نے شائع کیا ہے۔

۵۔ عبقات

امام صاحبؒ کی تصوف کے موضوع پر یہ نہایت بلند پایہ اور گراں قدر تصنیف ہے جو مقدمہ، چار اشارات اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتب تصوف مثلاً "لمعات"، "سطعات"، "ہمعات" اور "ھوامع" وغیرہ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے "مکتوبات" شیخ اکبر محی الدین ابن

عربیؒ کی "فتوحات" اور اپنے ائمہ کرام ؒ کی کتب کے حاصل مطالعہ کو نہایت سلیقہ اور اپنی طرف سے حک و اضافہ کے ساتھ مرتب فرمایا ہے ان مذکورہ ائمہ کرام کے تذکرہ کے بعد جن کی کتب سے آپ نے استفادہ کیا، فرماتے ہیں :۔

"اردت ان اسرج فی سبیل المبادی سراجاً یھتدی
بہ السالکون و امنح فی مدارج المقدمات معراجاً
یرتقی علیہ الطالبون فالفت رسالۃ تکون کالبرزخ
بین ما ظھر بالعیان وما ثبت بالبیان و کالوصلۃ
بین ما فاز بہ ارباب الکشف وبین ما وصل
الیہ آل البرھان ثم ان ما اودعتہ رسالتی وان
لم یکن عین ما تلقیتہ من ائمتی الا انہ کالاصل
لھذا الشجر والبذر لھذا الثمر شعر
کذالک تنشأ لینۃ ھو عرقھا
وحسن نبات الارض من کرم البذر[۶۸]

مقدمہ چار عقبات پر مشتمل ہے پہلے عقبہ میں علم کے اسباب و ذرائع پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ تین ہیں (۱) محسوس سے اخذ کرنا (۲) معلوم سے مجہول کی طرف انتقال (۳) تلقی من الغیب دوسرے عقبہ میں فرمایا ہے کہ علم نقلی نظریات سے تعلق رکھتا ہے اور علم معتدبہ کے تین اسباب ہیں ۱۔ عقل ۲۔ نقل ۳۔ کشف اور ان میں سے ہر ایک میں خلل واقع ہو سکتا ہے لیکن جب خلل نہ ہو تو ان میں تناقض نہیں ہوتا تیسرے عقبہ میں اس بات کی تردید کرتے ہوئے کہ نقل مفید یقین نہیں فرماتے ہیں :۔

"قد تفوہ بعض من لم یرزق الفھم بامر فظیع ان
النقل لا یفید العلم القطعی زاعماً انہ انما یفید العلم بواسطۃ
اللفظ و افادتہ للمعنیٰ موقوفۃ علی العلم بوضعہ
لہ[۶۹]......الخ

چوتھے عبقہ میں الہام کے مفید علم نہ سمجھنے والوں کی تردید کی ہے اور اپنے موقف کو کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ مدلل طور پر بیان فرمایا ہے۔

مقدمہ کے بعد کتاب کے عنوانات "اشارہ" سے شروع ہوتے ہیں۔ پہلے اشارہ میں ۴۳ عبقات اور خاتمہ ہے خاتمہ میں صفات باری تعالیٰ سے متعلق نہایت عمدہ بحث ہے دوسرے اشارہ میں ۲۵ عبقات اور خاتمہ ہے اس میں تجلیات کی بحث نہایت احسن پیرایہ میں کی گئی ہے تیسرے اشارہ میں ۱۲ عبقات ہیں اور ان میں ایجاب و اختیار کی بحث ہے چوتھے اشارہ میں ۱۲ عبقات ہیں ان میں کمال نفس کے مراتب پر بحث ہے خاتمہ پانچ عبقات پر مشتمل ہے عالم مثال پر بحث کے ضمن میں تیسرے عبقہ میں فرماتے ہیں۔

المجاھد بالوجود المثالی لیس من اھل السنۃ حقا بل فیہ شوب من الاعتزال لما انہٗ یضطر الی تأویل الف الف بل اکثر تأویلاً بعیداً۔

"وجود مثالی کا منکر قطعی طور پر اہل سنت سے خارج ہے کیوں کہ اس میں اعتزال کا شائبہ پایا جاتا ہے کیوں کہ وہ ہزاروں قسم کی بعید از قیاس تاویلیں کرتا ہے۔"

مختصر یہ کہ آپ کی یہ عظیم الشان کتاب آپ کی وقتِ نظر اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ کا ایک بین ثبوت ہے ذات صفات، تجلیات، علم حق، تجدد امثال، تنزلات ستہ، خیر و شر، حق و باطل، ماہیت معاد، منازلِ قرب، طریقِ صوفیہ، عبد و رب کا تعلق، وحدت الوجود اور اس نوع کے دیگر عنوانات پر آپ نے جس خوبی سے کتاب وسنت اور علماء تصوف کے ارشادات کی روشنی میں بحث فرمائی ہے اس کا اندازہ احبابِ ذوق ہی کر سکتے ہیں۔ آپ کا اس کتاب کی شرح لکھنے کا بھی ارادہ تھا لیکن وہ جہاد میں مصروفیت کے باعث پورا نہ ہوسکا۔

یہ کتاب سب سے پہلے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی فرمائش پر دیوبند سے شائع ہوئی تھی دوسری مرتبہ ۱۳۸۰ھ میں مجلس علمی کراچی نے $\frac{26 \times 20}{8}$ سائز کے ۲۲۷ صفحات پر نہایت خوبصورت انداز میں ٹائپ پر زیورِ طباعت سے آراستہ کرائی ہے اس وقت یہی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو کہ مکتبہ نشاۃِ ثانیہ حیدر آباد سے شائع

ہو چکا ہے۔

۶۔ اصولِ فقہ

امام صاحبؒ کا یہ مختصر سا رسالہ اصولِ فقہ کا ایک بہترین متن ہے جو اختصار و ایجاز کے باوصف نقائص و عیوب سے پاک ہے ہے اس عنوان پر اگرچہ امام شافعیؒ، امام الحرمینؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، امام آمدیؒ، قاضی بیضاویؒ، امام ابن حاجبؒ، امام ابوبکر جصاصؒ، قاضی دبوسیؒ، امام سرخسیؒ، امام بزدویؒ، امام تفتازانیؒ، امام ابن الہمامؒ، امام سبکیؒ، امام شاطبیؒ، امام ابن حزمؒ اور دیگر بے شمار جہابذہ اہلِ فن نے قلم کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں لیکن امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا انداز سب سے نرالا اور البیلا ہے۔ متأخرین میں سے عہدِ عالمگیر کے قاضی محب اللہ بہاریؒ (م ۱۱۱۹ھ) کے متنِ اصولِ فقہ "مسلم الثبوت" کا اگرچہ بہت چرچا ہے۔ لیکن ان کے اختصار میں خلل ہے اور اصولِ فقہ کے مسائل کے ساتھ علم کلام اور فلسفہ کے چند غیر ضروری مسائل کے تذکرہ سے کتاب میں نقص پیدا ہو گیا ہے اس کے برعکس حضرت امام صاحبؒ کا یہ متن نقص سے پاک نہایت عمدہ، جامع اور کوزہ میں دریا بند کرنے کے مصداق ہے "مسلم الثبوت" وغیرہ کے بجائے اگر اسے داخلِ نصاب کیا جائے، تو یہ کتاب مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

"اصولِ فقہ" کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں ۳۶ صفحات پر مطبع مجتبائی سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ دائرۃ المعارف لاہور نے ۲۰ × ۳۰/۱۶ سائز پر اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا۔ مولوی مشتاق احمد انبٹھوی نے اس کے حواشی لکھے ہیں جو سب سے پہلے مطبع علمی لاہور سے شائع ہونے والے نسخہ پر مطبوع ہوئے۔ محشی چونکہ حنفی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انہوں نے حواشی میں جا بجا حضرت امام صاحبؒ سے اختلاف کیا ہے اس کی ایک بے نظیر شرح حضرت العلامۃ المحقق الاستاذ الامام الحافظ محمد المحدث گوندلوی دامت برکاتہم کے قلم فیض رقم سے بھی ہے جو کہ "بغیۃ الفحول فی شرح مختصر الاصول" کے نام سے ادارہ اشاعت السنہ لاہور سے دسمبر ۱۹۶۸ء میں لیتھو پر شائع ہو چکی ہے۔ اے کاش! اس شرح حافل کو اس کے شایانِ شان ٹائپ وغیرہ پر زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جاتا۔

۷۔ یک روزہ

یہ فارسی زبان میں امام صاحبؒ کا امکان و امتناعِ نظیر کے موضوع پر

وہی رسالہ ہے جس کا ذکر آپ "تقویۃ الایمان" کے تعارف کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں۔ ایک دن آپ نماز کے لیے مسجد تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں کسی نے مولانا خیر آبادیؒ کا رسالہ دیا جو انہوں نے آپ کی تردید میں لکھا تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد، ایک ہی نشست میں مسجد میں جلوہ افروزی کے عالم میں اس کا جواب تحریر فرما دیا، اس لیے یہ یک روزہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کے دلائل اس قدر ناقابلِ تردید ہیں کہ آج تک مخالفین اس کا جواب نہیں دے سکے۔ ۱۰ ذوالحجہ ۱۲۴۱ھ کو اس رسالہ کی تبییض ہوئی تھی جب کہ امام صاحبؒ ہجرت بغرضِ جہاد کے سلسلے میں شکارپور تشریف فرما تھے۔ اور سب سے پہلے ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے "ایضاح الحق" کے ساتھ شائع ہوا۔ کچھ عرصہ ہوا مکتبہ صدیقیہ ملتان نے اسے الگ زیورِ طباعت سے آراستہ کر دیا ہے۔

۸۔ رسالہ در علمِ منطق

اس رسالہ کا ذکر کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے لکھا ہے کہ آپ نے اس میں :-

"شکلِ اوّل کے ابعد الطبائع اور شکلِ رابع کے ابدہ البدیہات ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے دلائل اس قوت و استحکام کے ساتھ مذکور فرمائے کہ اگر معلّم اوّل موجود ہوتا تو اپنی براہین کو تارِ عنکبوت سے سست تر سمجھتا۔"[۱]

یہ رسالہ غالباً طبع نہیں ہو سکا اور نہ ہی اس کے کسی قلمی نسخہ کا سراغ مل سکا ہے۔

۹۔ منصبِ امامت

حضرتِ امام صاحبؒ کی یہ نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی نے بالکل بجا فرمایا ہے :-

"وھو مما لم یسبق الیہ"[۲]

"سابقہ زمانہ میں اس موضوع پہ ایسی کوئی کتاب نہیں۔"

یہ سب سے پہلے ۲۰×۲۶/۸ سائز کے ۱۴۴ صفحات پہ ریاست بھوپال کے وزیر مولانا محمد

جمال الدین خاں کی فرمائش پر مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مولانا عبداللطیف قریشی کے ترجمہ کے ساتھ ۱۳۰۶ھ میں $\frac{29 \times 22}{8}$ کے ۳۴ صفحات پر مطبع مذکور سے ہی "درجاتِ امامت" کے نام سے شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں اس کا صرف اردو ترجمہ بھی از حکیم محمد حسین علوی۔ لاہور سے ۱۹۴۹ء میں $\frac{18 \times 22}{8}$ سائز کے ۱۵۲ صفحات پر "منصب امامت، اسلامی سلطنت کا دستور العمل" کے نام سے مومن پورہ راوی روڈ لاہور سے شائع ہو چکا ہے

اس کتاب کے دو باب ہیں، باب اوّل میں حقیقتِ امامت کا ذکر ہے اور اس باب کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے فصل اوّل میں کمالاتِ انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ کمالات جو حقیقتِ امامت سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مرجع پانچ اصول ہیں اوّل وجاہت، دوم ولایت، سوم بعثت، چہارم ہدایت اور پنجم سیاست پھر ان اصولِ خمسہ کی نہایت دل نشین انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ فصل دوم میں انبیاؑ کے کمالات سے اولیاء اللہ کی مشابہت کو دو مختلف اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔

باب دوم میں ایک مقدمہ، دو فصلیں اور ایک خاتمہ ہے مقدمہ میں امامت کی حقیقی و حکمی دو اعتبار سے تشریح کی گئی ہے۔ فصل اوّل میں امامت حقیقی کی اقسام اور فصل دوم میں امامتِ حکمی کی اقسام بیان کی گئی ہیں خاتمہ میں اس امر کی وضاحت ہے کہ لفظ امام سے کیا مراد ہے؟ اس ضمن میں دو تنبیہ ہیں پہلی میں صاحبِ دعوت اور دوسری میں اصحابِ دعوت کے حکم کی وضاحت کی گئی ہے الغرض اس کتاب میں آپ نے حقیقتِ نبوت کی وضاحت کے بعد حقیقتِ امامت یعنی سیاسی قیادت (POLITICAL LEADER SHIP) وغیرہ کی اقسام اور اسلامی اصولوں کے مطابق ان کے احکام کو بیان فرمایا ہے اور اس امر کی توضیح کی ہے کہ کس قسم کی قیادت کے ساتھ مسلمانوں کا کیا سلوک ہونا چاہیئے گویا جو لوگ نبوت و امامت اور ولایت کو باہم مختلط کر دیتے ہیں ان کے لیے اس کتاب میں حقیقت کو سمجھنے کے لیے پورا پورا سامان موجود ہے اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ اسلامی سیاسیات (ISLAMIC POLITICS) پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے۔

شاہ پرستی کے آپ مخالف تھے اس لیے آپ نے اپنی اس مایۂ ناز تصنیف میں اس کا

برملا اظہار فرمایا ہے مسلمان بادشاہوں کی اس دور کی بادشاہت جس کو لوگ ظلّ الٰہی سے تعبیر کرتے تھے آپ اس کو قابلِ نفرین اور جبر و قہر کی حکومت سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"استیصالِ او عین انتظام است و اہلاک او عین اسلام و اطاعت ہر متسلط از احکام شرعیہ نیست و انقیاد ہر متجبر از اوامر دینیہ نہ "

ان کا استیصال عین انتظام ہے اور ان کو ہلاک کرنا عین اسلام، ہر صاحبِ اقتدار اور ہر جابر کی اطاعت کرنا حکم شریعت نہیں۔

آپ بدترین قسم کی بادشاہت کی دو علامتیں بیان کرنے کے بعد، جو کہ اس دور کے حکمرانوں میں پائی جاتی تھیں، فرماتے ہیں :۔

"پس دریں صورت برافروختن اعلام قتل و قتال و برانداختن آں مبتدع ضال در حق ملت و اہل ملت منفعت خواہد بخشید و الا بعوام و خواص بے شک مضرت خواہد رسید"

پس ایسی صورت میں علم بغاوت بلند کرنا اور اس گمراہ کو جو مذہب کے نام پر من مانی کر رہا ہے معزول اور برخاست کر دینا ملت کے لیے بھی مفید ہوگا۔ اور اہلِ ملت کے لیے بھی ورنہ ملک کے عوام و خواص کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں :۔

"جہاد بر ایشاں از ارکانِ اسلام است و اہانتِ ایشاں اعانتِ سید الانام "

"ان کے خلاف جہاد کرنا ارکانِ اسلام سے ہے اور ان کو ذلیل کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت ہے۔"

آپ کا یہ فیصلہ ان مسلمان بادشاہوں کے متعلق ہے جو راہِ راست سے بھٹک چکے تھے ان حضرات کو غور فرمانا چاہیئے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے کہ جس کا نظریہ غلط کار مسلمان حکمرانوں کے متعلق یہ ہو تو فرنگی کافروں کے متعلق اس کا موقف کیا ہوگا ؟ غرضیکہ "منصبِ امامت" اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے جسے اسلامی حکومت کے ایک دستور کی حیثیت سے بھی پیش کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ ائمہ

ور عایا کے مسائل و احکام کی وضاحت کے لیے اس دور میں تصنیف کی گئی تھی جب کہ سیدین شہیدین ظلمت کدۂ ہند کو اسلامی ریاست کی حیثیت سے اسلامی آئین کے نفاذ کے نور سے منور دیکھنا چاہتے تھے اور عملاً اس کے لیے معروفِ جہد تھے۔ کتاب کے آخر میں آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ :۔

"عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ احکام امام در ابواب آئندہ بالاستیعاب مذکور خواہد گردید	انشاء اللہ عنقریب احکام امام آئندہ ابواب میں بالاستیعاب مذکور ہوں گے ۔

واللہ یھدی من یشاء الیٰ سواء السبیل وھو حسبی ونعم الوکیل

افسوس آپ جامِ شہادت نوش فرما جانے کے باعث اپنے اس عزم کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے ۔ اے کاش ! اللہ تعالیٰ کسی صاحبِ ذوق کو توفیق بخشے کہ وہ امام صاحبؒ کے اسلوب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ، کتاب کی تکمیل کر دے ۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اس کتاب کے متعلق درجِ ذیل قول بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

"شاہ اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے لیکن ان کی شہرۂ آفاق اور مسلم ذکاوت اور وفورِ علم کا اندازہ صرف "منصبِ امامت" سے ہوا جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔"

۱۰۔ ایضاح الحق

آپ کی اس تصنیفِ لطیف کا پورا نام "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح" ہے کتاب کے نام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا موضوع صرف احکامِ میت ہے لیکن در حقیقت یہ حقیقتِ سنت و ردِ بدعت کی کتاب ہے اور بعض علماء کرام کی رائے ہے کہ ردِ بدعات میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آپ نے کتاب کے آغاز میں سببِ تالیف ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے :—

"مشفقی مکرمی مولوی تفضّل علی صاحب را خواہش تمیز فیما بین السنۃ والبدعۃ در رسوم مذکورہ بہم رسید بناءً علیہ از بندہ ضعیف الراجی رحمۃ اللہ الجلیل احقر العباد محمد اسمٰعیل عفی عنہ استفسار این معنی فرمودہ پس بندۂ ضعیف اجوبہ مسائل مستفسرہ را درضمن چند اوراق مفصّل و مدلّل گردانیدہ ازا بالیضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح مسمّی نمودہ۔"

میرے مشفق و مکرم مولوی تفضل علی صاحب کو رسوم مذکورہ میں سنت و بدعت کے درمیان فرق و امتیاز کی خواہش ہوئی تو بندۂ ضعیف امیدوار رحمت اللہ الجلیل احقر العباد محمد اسمٰعیل عفی عنہ سے اس کو دریافت و استفسار فرمایا تو بندۂ ضعیف نے ان مسائل مستفسرہ کے جوابات کو چند اوراق میں مفصّل و مدلّل بیان کر کے اسے "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح" کے نام سے موسوم کر دیا۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور خاتمہ پر مشتمل ہے بدعت کی لغوی تشریح اور بدعت اصلیہ و وصفیہ کے اعتبار سے بدعت کی تقسیم اور پھر اس کی تشریح، اُمورِ سنت و اُمورِ غیر سنت، تقلید و اجتہاد اور علوم نافعہ پر مشتمل مباحث نہایت مدلّل اور دل نشین ہیں۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے طبع ہوئی پھر ۱۲۵۶ھ میں کتب خانہ اشرفیہ دہلی سے اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ یہ ترجمہ مولانا عبداللطیف سونی پتی کا ہے اور "امداد الفتاح" کے نام سے مشہور ہے "امداد الفتاح فی توضیح الایضاح" مکتبہ رحیمیہ دیوبند سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۱۱۔ تنقید الجواب

مولوی عبدالہادی حنفی نے عدم جواز رفع الیدین میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ امام صاحبؒ نے "تنقید الجواب" کے نام سے اس پر تنقید لکھی حضرت امام قنوجیؒ فرماتے ہیں:۔

"تنقید الجواب فتوی فارسی عبارت ست در جواب عدم رفع الیدین فی الصلوٰۃ للشیخ المولوی عبدالہادی المہاجر الحنفی از شیخ محمد اسمٰعیل بن عبدالغنی الشہید المتوفی سنۃ احدی و خمسین و مائتین والف اوّلہٗ الحمد للہ الذی لا شریک لہٗ فی الخلق والامر و

آخرلا املاہ محمد اسمٰعیل عفا اللہ عنہ و بروی دستخط مولوی عبدالحی مرحوم ست بایں حرف ھذا املاء کلہ صریح الحق و الحق احق بالاتباع حررہٗ عبدالحی عفی عنہ شانزدھم ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ سنہ ہجری[80]"

۱۲۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین

اثبات رفع الیدین کے عنوان پر — جیسا کہ نام سے ظاہر ہے — یہ آپ کی وہ بے نظیر تصنیف ہے جس پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے بھی اظہار پسندیدگی فرمایا تھا بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تو یہ بھی فرمایا تھا :—

"— خدا کا شکر ہے کہ یہ گھر محققین علم حدیث سے خالی نہیں ہے[81]"

رفع الیدین کی سنیت پر بحث کرتے ہوئے دیباچہ میں فرماتے ہیں :—

"ان رفع الیدین عند الافتتاح والرکوع والقیام منہ الی الثالثۃ سنۃ غیر مؤکدۃ من سنن الھدیٰ فیثاب فاعلہ بقدر ما فعل ان دائما فحسبہ وان مرۃ فبمثلہ ولا یلام تارکہ وان ترکہ مدۃ عمرہ[82]"

چنانچہ امام صاحب نے خود بھی رفع الیدین پر عمل شروع فرما دیا تھا۔ یاد رہے اس وقت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر بھی بقید حیات تھے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ کے ایک دوسرے پوتے شاہ مخصوص اللہ[83] بن شاہ رفیع الدینؒ کے متعلق بھی کتابوں میں صراحت موجود ہے کہ وہ بھی آمین بالجہر اور رفع الیدین پر عمل پیرا تھے اس کتاب میں اثبات رفع الیدین کے علاوہ آپ نے چونکہ آمین بالجہر، فاتحہ خلف الامام اور ردِ تقلید وغیرہ کی طرف بھی اشارات فرمائے ہیں اس لیے مقلدین حضرات کو یہ کتاب انتہائی ناگوار گزری چنانچہ اس کی تردید میں مولوی محمد شاہ پاک پتنی نے "تنویر الحق" کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کے جواب میں علماء حدیث کی طرف سے شیخ

الکل حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ نے نہایت مدلل و مفصل کتاب "معیار الحق" کے نام سے تصنیف فرمائی۔ اس کا اثر علمی حلقوں پر بڑا شدید ہوا، مخالفین تو اس سے بوکھلا اٹھے سچ پوچھئے تو اس عنوان پر شاید ہی اس سے زیادہ کوئی مستند، مدلل اور معیاری کتاب ہو، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی اس کے متعلق فرمایا ہے۔

"مجھ پر معیار الحق کی سنجیدہ اور وزنی بحث کا بہت اثر پڑا اور صاحب ارشاد الحق (انتصار الحق) کا علمی ضعف صاف صاف نظر آ گیا"۔

"معیار الحق" کی تردید میں مولوی ارشاد حسین صاحب رامپوری نے "انتصار الحق" لکھی جس کی طرف حضرت امام الہندؒ کے اس مذکورہ ارشاد میں اشارہ ہے۔ رامپوری صاحب کو اپنی کتاب پر بڑا ناز اور غرور تھا اور ان کے زعم میں اس کا جواب بہت محال تھا لیکن خدا رحمت کرے مولانا سید امیر حسین سہسوانی پر کہ انہوں نے "انتصار" کی اشاعت کے ایک ہی دن بعد "براہین اثنا عشر" کے نام سے اس کا جواب شائع فرما دیا۔ انہوں نے اس کی ایک کاپی مولانا عبدالحئی لکھنوی کو بھی بھیجی، جسے ملاحظہ فرمانے کے بعد انہوں نے مولانا امیر حسین مرحوم کو اپنے مکتوب میں لکھا۔

"براہین اثنا عشر" رسیدہ اغلاط اسامی کتب و مؤلفین در "انتصار" لا تعد مستند شاید تبنظر اختصار بر چند کفایت شدہ"

"انتصار" کا دوسرا جواب مولانا احمد حسنؒ نے "تلخیص الانظار فیما بنی علیہ الانتصار" تیسرا جواب مولانا شہود الحق عظیم آبادیؒ نے "البحر الذخار لازھاق صاحب الانتصار" اور چوتھا جواب مولانا احتشام الدین مراد آبادیؒ نے "انتیار الحق" کے نام سے لکھا۔

اس کتاب کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں نواب صدیق حسن خانؒ نے لکھا ہے کہ "در قدیم زمان در کلکتہ با ترجمہ اردو طبع شدہ" آپ کا اشارہ غالباً اس ایڈیشن کی طرف ہے جو ۱۲۵۶ھ میں مطبع رحمانی کلکتہ سے شائع ہوا تھا اسی طرح ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے بھی اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں "المکتبۃ السلفیہ" لاہور سے یہ کتاب اردو ترجمہ کے ساتھ زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔

۱۳۔ حقیقتِ تصوّف

اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فضل حسین صاحب بہاری لکھتے ہیں :۔

"ایک کتاب آپ نے لکھی جس کا نام "حقیقتِ تصوّف" تھا۔ اب یہ نایاب ہوگئی ہے اس میں آپ نے سچے صوفیوں کی تعریف لکھی ہے اور اب جو من گھڑت باتیں داخلِ تصوّف ہوگئی ہیں، ان کی بُرائی بیان کی ہے۔ اس کتاب سے اس طبقہ والوں کی بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی ہے[۸۷]"

مولانا بہاریؒ کے علاوہ اور کسی نے اس کتاب کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ اس کے کوائف ہی میسّر آسکے ہیں۔

۱۴۔ مثنوی سلکِ نور (اردو)

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت امام صاحبؒ جیسے اُردو، عربی اور فارسی کے صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے ایسے ہی آپ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ گو اس طرف آپ نے خاص توجّہ فرمائی اور نہ دیگر معروفیات کے باعث اس کے لیے وقت میسّر آسکا تاہم آپ کے منظومات میں سے جو کچھ موجود ہے وہ آپ کی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں کی عکاسی کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں مثنوی سلک نور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اس میں ردّ شرک، توحیدِ الٰہی نعت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور مدحِ حضرت سیّد احمد شہیدؒ ایسے پاکیزہ عنوانات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ "مثنوی سلکِ نور" مولوی ابو محمد جمیل کے حسبِ فرمائش پرکاش سٹیم پریس لاہور سے ۱۳۴۰ھ میں طبع ہوئی اس کے آغاز میں ناشر یا مرتب نے رسالہ "حقیقت الصلوٰۃ" کو بھی لگا دیا ہے یاد رہے یہ امام صاحبؒ کا رسالہ نہیں بلکہ حضرت سیّد احمد صاحبؒ کی ایک تقریر ہے مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

الٰہی ترا نام کیا خوب ہے	کہ ہر جان کو وہی مطلوب ہے
اسی سے ہے ہر دل کو آرام چین	وہی سب زبانوں کا ہے زیب زین

اس میں کل دو صد اکاون اشعار ہیں۔ آخر میں اکتیس اشعار پر مشتمل "نسخۂ قوّتِ ایمان" کے نام سے ایک بڑی دلچسپ نظم ہے۔

۱۵۔ مثنوی سلکِ نورِ فارسی

آپ کی یہ فارسی مثنوی تین سو پینسٹھ اشعار پر مشتمل ہے، اتباعِ توحید و سنت، اجتنابِ شرک و بدعت اور تردیدِ فلسفۂ قدیم اس مثنوی کے مضامین ہیں۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہے ؎

لک الحمد اے مالکِ کارساز   کہ کردی مرا از شناسانِ راز

مرادم ازاں رازِ توحید تست   کہ آں مغزِ تحمید و تمجید تست

یہ مثنوی ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا عبدالصمد مدرس جامع مسجد اہلحدیث راولپنڈی کے پاس موجود ہے۔ امام صاحبؒ کے ارادت مند اور معاصر مولانا عبدالرب ہزارویؒ نے اسے امام صاحبؒ سے حاصل کر لیا تھا۔ آج سے کوئی نوے سال قبل ۱۳۰۳ھ میں ان کے صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰنؒ نے بھی اسے نقل کر لیا تھا۔ اسی کی ایک نقل مولانا موصوف کے پاس ہے۔ آپ اسے طبع کرانے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ توفیق عنایت فرمائیں۔

۱۶۔ قصیدہ در مدح حضرت سید احمد شہیدؒ

تذکرہ نگاروں نے گو اس کا ذکر کیا ہے لیکن افسوس کہ کسی نے بھی اسے نقل نہیں کیا۔ صرف مولانا تھانیسریؒ نے اس قصیدہ کے سات آٹھ اشعار نقل فرمائے ہیں ان میں سے ابتدائی دو شعر درج ذیل ہیں ؎

بیا و تہنیتِ شجرہ امامت کن   کہ بعد گم شدنش ہاں جگونہ گشت پدید

ہزار شکر بہ یزداں پاک کز فضلش   زنور قدسی غیبش کہ قطرۂ بہ چکید

۱۷۔ قصیدہ در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بھی آپ کا ایک فارسی قصیدہ ہے جس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہے۔

ہزار حمد برب حکیم صاحب جود

ظہور کرد کمالش ز جزء جزء ہر موجود

حضرت نواب صاحبؒ نے اپنی کتاب "اتحاف النبلاء" میں اس قصیدہ کے اٹھائیس اشعار نقل فرمائے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ :۔

"تمام ایں قصیدہ بخط والد ماجد محرر سطور در بیاض شان
مرقوم است"

آج اس قصیدہ کے صرف یہی اشعار موجود ہیں جنہیں حضرت نواب صاحبؒ درج فرما گئے، افسوس کہ قصیدہ کا باقی حصہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہا۔

۱۸۔ رسالہ بے نمازاں

بے نمازوں کو آسان اور دل نشین انداز میں سمجھانے کی غرض سے فریضۂ نماز کی اہمیت اور تارکِ صلوٰۃ کے لیے وعید وغیرہ کو آپ نے نہایت مؤثر پیرایۂ بیان میں نظم فرمایا اور جابجا آیات و احادیث کو بھی اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا۔ آیات و احادیث کا عام فہم بین السطور ترجمہ بھی درج فرما دیا۔ یہی "رسالہ بے نمازاں" ہے۔ حمد، درود، تسمیہ اور آیت "یوم یکشف عن ساق" الخ کے بعد رسالہ کا آغاز اس طرح ہے ؎

بعد حمدِ پاک ربّ العالمین	اور درود رحمۃ للعالمینؐ
حال اپنا اب سنو اے بے نماز	کیوں رہے اللہ کے فرمانے سے باز

"رسالہ بے نمازاں" $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے ۱۲ صفحات پر فاروقی کتب خانہ ملتان سے شائع ہو چکا ہے اس کے ساتھ ۱۳ سے ۱۸ صفحات تک مولانا عبدالغفار ملتانی کی "تنبیہہ نماز" کے نام سے ایک تقریر بھی ملحق ہے۔

امام صاحبؒ کا کلام اگرچہ علیحدہ علیحدہ تو شائع ہوا لیکن افسوس کہ آپ کے کلام کو مرتب کر کے شائع کرنے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ بحمد اللہ یہ سعادت بھی راقم کے حصہ میں آئی۔ راقم نے آپ کے کلام کو "کلام شاہ اسمٰعیل شہیدؒ" کے نام سے مرتب کیا اور "طارق اکیڈمی" فیصل آباد نے اسے نہایت سلیقے سے زیورِ طباعت سے آراستہ کرایا ہے۔

ان گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت امام صاحبؒ میدانِ تصنیف کے بھی کامیاب شہسوار تھے اگرچہ دعوت و تبلیغ اور جہاد میں مصروفیت کے باعث آپ کو قلم کی خوب خوب جولانیاں دکھانے کے مواقع تو میسر نہ آسکے تاہم قلم برداشتہ آپ کی جو قلمی یادگاریں ہیں وہ اپنی جامعیت، پختگی اور تاثیر کے اعتبار سے فن کی کئی ضخیم مجلدات

پر بھاری ہیں۔ مذکورہ کتب کے علاوہ امام صاحبؒ نے سید صاحبؒ کے مکتوبات ترتیب دیئے
مولوی عبد الرحمٰن لکھنوی کے رسالہ "کلمۃ الحق" پر نہایت اچھا محاکمہ لکھا اور بہت سی کتابوں پر
نہایت قیمتی حواشی سپردقلم فرمائے ہیں۔ افسوس کہ مولانا رشید الدین خاں کا نادر و نایاب کتب
پر مشتمل کتب خانہ جب ایامِ غدر ۱۸۵۷ء میں لُٹ گیا تو یہ تمام قیمتی حواشی بھی ضائع ہو گئے مولانا
رشید الدین کے صاحبزادے مولانا سدید الدین ہمیشہ نہایت افسوس سے فرماتے کہ ہم کو اپنے
کتب خانہ کے لُٹ جانے کا اس قدر افسوس نہیں جس قدر ان حواشی کے ضائع ہو جانے کا ہے کیوں
کہ کتابیں تو پھر بھی دستیاب ہو سکتی ہیں مگر ان حواشی کا ملنا محال ہے۔

پیام شاہجہانپوری نے اپنی کتاب حیاتِ اسمٰعیل شہیدؒ میں جو آپ کی طرف "الاربعین فی
احوال المہدیین" کا انتساب کیا ہے اور اس کا عکس بھی دیا ہے یہ محض افسانہ معلوم ہوتا ہے جو
شاید کسی مخفی جذبہ کی تسکین کے لیے بنایا گیا ہے۔ امام صاحبؒ کے سوانح نگاروں میں سے کسی نے
اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ اور پھر اس انتساب کے غلط ہونے پر داخلی شہادتیں بھی موجود ہیں مثلاً کتاب
کے آخر میں شاہ نعمت اللہ کے فارسی قصیدہ کا الحاق، جو خود ایک چیستان ہے اور اہل علم کے
نزدیک اس کی اہمیت معلوم۔ امام صاحبؒ ایسے موحد اور متبع سنت بزرگ اس قصیدہ کو اپنی
کتاب کے ساتھ کیوں ملحق کرنے لگے۔ ہمارے شبہ کو تقویت اس سے بھی پہنچتی ہے کہ اس سلسلہ میں
پیام صاحب کا ماخذ اسمٰعیل میمن کا روزنامہ "انجام" کراچی میں مطبوعہ ایک مضمون ہے اور میمن صاحب
بھی پیام صاحب کی طرح قادیانی اُمت کے ایک فرد ہیں۔ لہٰذا امام صاحبؒ کی طرف اس کتاب
کا انتساب غلط ہے۔ آپ نے اس نام کی کوئی کتاب تصنیف نہیں فرمائی۔

باب ہفتم

اعتراضات اور انکی حقیقت

اختلافِ رائے کا ہر انسان کو حق پہنچتا ہے بشرطیکہ اختلاف عدل و انصاف کی حدود سے متجاوز اور اختلاف برائے اختلاف نہ ہو۔ لیکن شومیٔ قسمت کہ از حضرتِ آدم تا ایں دم اہلِ حق کو زیادہ تر ناروا مخالفت ہی کا تختۂ مشق بننا پڑا۔ ائمہ سلف میں سے امام ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ۔ امام ابنِ تیمیہؒ اور دیگر بے شمار اساطینِ علم و فضل کے خلاف مخالفتوں کے جو طوفان برپا کیے گئے، اس سے ایک دنیا واقف ہے۔ علامہ سبکیؒ نے جو یہ لکھا ہے تو بالکل بجا کہ "کوئی امام ایسا نہیں ہے کہ زبان درازوں نے اس کے حق میں زبان درازی نہ کی ہو اور تباہ ہونے والے اس کے بارے میں ہلاک نہ ہوئے ہوں اگر مخالفت برائے مخالفت یا حسد و کینہ پر مبنی ہو تو اہلِ حق کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا البتہ مخالفین اپنے نامۂ اعمال کو ضرور سیاہ کر لیتے ہیں غور فرمائیے مخالفین نے تو خدائے ذو الجلال و الاکرام، قرآنِ مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی

اپر گستاخ زبانیں دراز کرنے سے دریغ نہیں کیا، تو کیا اس سے ان کے تقدس یا عظمت وصداقت میں سرِمو بھی فرق آیا؟ شاید انہی حالات میں کسی نے کہا ہے

قیل ان الالٰہ ذو ولد   قیل ان الرسول قد کھنا
ما نجا اللہ والرسول معاً   من لسان الوریٰ فکیف انا

برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ سے زیادہ کوئی مظلوم نہ ہوگا۔ آپ کے دور میں چونکہ شرک وبدعت کی خوب گرم بازاری تھی لوگ نفسانی خواہشات کے پجاری بن گئے تھے اور صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر شیطانی پگڈنڈیوں پر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ان حالات میں آپ نے جس طرح کفر وشرک اور بدعات ومحدثات کے خلاف عزیمت و استقلال سے جہاد کیا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، اسی طرح شرک وبدعت کے حامیوں کی افترا پردازیوں اور خواہشاتِ نفسانی کے پجاریوں کی گستاخ زبان درازیوں کا بھی آپ کو سب سے زیادہ ہدف بننا پڑا۔ سچ پوچھیے تو شاہ ولی اللہؒ کے اس مجاہد وشہید پوتے کے خلاف اہلِ بدعت اور گور پرستوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ الطاف کہیے یا ستم اکیلے مولوی احمد رضا خاں کے ان چھوٹے بڑے کتابچوں کی تعداد دو تین سو کے قریب ہے، جس میں انہوں نے مظلوم وشہید امام کو تکفیر وتبرا بازی کا نشانہ بنانے کا شوق فرمایا ہے

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

حضرت امام صاحبؒ پر جو شرمناک بہتان باندھے گئے، وہ بہت زیادہ ہیں اختصار کے پیشِ نظر ان میں سے چند بہتانوں کا جواب حسبِ ذیل سطور میں دیا جاتا ہے جنہیں گور پرست سادہ لوح عوام میں بہت زیادہ اچھالتے ہیں۔

پہلا اعتراض

اہلِ بدعت کی طرف سے حضرت امام صاحبؒ پر بڑے زور شور سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کرام چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہیں (نعوذ باللہ من ذالک)

جواب اس ناپاک، گندے اور بیہودہ اعتراض بلکہ بہتان کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ ۔ مفصل جواب کے لیے امام صاحبؒ کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے، جس پہ اس بہتان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ امام صاحبؒ "تقویۃ الایمان" کے تیسرے باب میں شرک سے اجتناب کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۔

اور جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے کو اور وہ نصیحت کرتا تھا اس کو اے بیٹے میرے امت شریک بنا اللہ کا بے شک شریک بنانا اس کا بڑی بے انصافی ہے۔

ف :۔ "یعنی اللہ صاحب نے لقمان کو عقلمندی دی تھی سو انہوں نے اس سے سمجھا کہ بے انصافی یہی ہے کہ کسی کا حق اور کسی کو پکڑا دینا اور جس نے اللہ کا حق اسی کی مخلوق کو دیا تو بڑے سے بڑے کا حق لے کر ذلیل سے ذلیل کو دے دیا۔ جیسے بادشاہ کا تاج ایک چمار کے سر پہ رکھ دیجئے۔ اس سے بڑی بے انصافی کیا ہوگی اور یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔"

ناظرین کرام ! غور فرمائیں اس عبارت میں کسی نبی، ولی کا ذکر ہے ؟ بلکہ یہاں تو اجمالاً ہے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔" آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ جو نسبت چمار کو انسانیت کی وجہ سے، بادشاہ سے ہے وہ مخلوق میں سے کسی کو بھی خدا کے ساتھ حاصل نہیں اس لیے سب مخلوق چمار کی نسبت سے بھی درجے میں بہت نیچے ہے آپ یہاں خالق و مخلوق کے مرتبہ کا فرق بیان فرما رہے ہیں۔ مخلوق کے باہمی مراتب کا ذکر بیان نہیں فرما رہے۔ اور پھر کوئی مخلوق اپنی ذات کے اعتبار سے کیسی ہی باکمال کیوں نہ ہو وہ خالق کے مقابلہ میں لاشئی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے کمالات اور مقربان بارگاہِ خداوندی کے درجات مسلّم ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ سب کمالاتِ الٰہیہ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ مخالفین شاید لفظ ذلیل سے زیادہ بدکے ہیں۔ حالانکہ ذلیل کے معنی کمزور اور

ضعیف کے ہیں خود اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کرام کے لیے ـــــ اور وہ بھی بدری صحابہ رضوان اللہ علیہم ـــــ اس لفظ کو استعمال کیا ہے، فرمایا :ـ

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ؕ — اللہ تعالیٰ نے بدر کے موقع پر تمہاری مدد کی جب کہ تم ذلیل تھے۔

کتب تفسیر خصوصاً تفسیر کبیر، الوالسعود اور بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر ملاحظ فرمایئے آپ کو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صحابہ کرام ؓ کے لیے ضعف و قلت ان کے سبب اس لفظ کو استعمال کیا ہے اس سے ان کی توہین مقصود نہیں علیٰ ھذا القیاس امام صاحبؒ کا مقصود بھی ہرگز ہرگز انبیاء و اولیاء کی توہین نہیں یہ تو اسی طرح ہے جیسا کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے۔

"لا یکمل ایمان امرء حتی یکون الناس عندہ کالاباعر" — کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سب آدمی اس کی نظر میں (عظمتِ الٰہی کے مقابلہ میں) اونٹ کی مینگنی جیسے نہ ہوں۔

امام یافعیؒ نے بھی شیخ موصوف کا یہ عقیدہ لکھا ہے :ـ

" تمام مخلوقات ملائکہ و جن و انس و عرش و کرسی و لوح و قلم و زمین و آسمان وغیرہ اللہ جل جلالہ کی عظمتِ کبریائی کے مقابلہ میں رائی کے دانہ سے بھی حقیر ہیں "

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں :ـ

" ایمان کسے تمام نہ شد تا ہمہ خلق نزدِ او ایں چنیں نہ نماید کہ پشک شتر "

سیدنا حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا ارشاد بھی سنیے اور سر دھنیے۔ فرماتے ہیں :ـ

" اجعل الخلیقۃ اجمع کرجل کتفہ سلطان عظیم ملکہ — تمام مخلوق کو اس آدمی کی طرح سمجھو کہ جس کو کسی ایسے بادشاہ نے گرفتار کر لیا ہو جس

شدید امرہ مهولة شوکته	کا ملک بڑا، حکم سخت اور دبدبہ وغلبہ
وسطوته، ثم جعل الغلة	خوفناک ہو پھر اس بادشاہ نے اس آدمی
فی رقبته مع رجلیه ثم	کے پاؤں اور گردن میں طوق وسلاسل
صلبه علی شجرة الأرز علی	ڈال کر اسے صنوبر کے درخت پر ایک بڑے
شاطئ نهر عظیم موجه فسیح	مواج اور تلاطم خیز، وسیع وعریض
عرضه عمیق غورہ شدید	دریا کے کنارے سُولی پر چڑھایا ہو پھر
جریه ثم جلس السلطان علی	وہ بادشاہ ایک شاندار کرسی پر جلوہ
کرسی عظیم قدرہ عال سماؤہ	افروز ہو اور تیر و کمان اور شمشیر و سنان
بعید مرامه ووصوله وترك	اور دیگر ہتھیاروں کے لاتعداد انبار لگا
الی جنبه احمالا من السهام	لے اور اس مصلوب شخص پر جس ہتھیار کو
والرماح والقسی مما لا یبلغ	چاہے چلائے (پس جس طرح اس بادشاہ
قدرها غیرہ فجعل یرمی	کے سامنے یہ مصلوب لاچار ہے اسی
الی المصلوب بما شاء من ذالك	طرح تمام مخلوق خدا تعالیٰ کے سامنے
من السلاح	عاجز و لاچار ہے)

شیخ المشائخ قطبِ عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی فرماتے ہیں۔

آنہ، عبد ذلیل والرب رب جلیل	بے شک بندہ ذلیل ہے اور رب بزرگی
سرگردانی در مقام عبودیت و ذل	والا۔ سرگردانی مقامِ عبودیت میں اور
کور مقابلہ عالمِ ربوبیت ہمہ راست	وجود کا عالمِ ربوبیت کے مقابلہ میں ذلیل
بہ طریق عموم انبیاء و اولیاء ہمہ حیران	ہونا سب صحیح ہے اور بہ طریق عموم انبیاء
و سرگرداں اند	و اولیاء تمام حیران و پریشان ہیں۔

حضرت شیخ اکبر امام محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں :۔

"فان کل شیئ فی العالم بالنظر	دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی عظمت کے
الی عظمة اللہ حقیر"	مقابلہ میں حقیر ہے۔

اور حضرت امام احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ رقم طراز ہیں :-

عالم را با صانع خویش ہیچ نسبت نیست	دنیا کو اپنے صانع کے ساتھ کوئی نسبت نہیں
مگر آنکہ مخلوق و ذلیل ست[۱]	مگر یہ کہ مخلوق و ذلیل ہے ۔

کیا فرماتے ہیں علماء بدایون و بریلی، حضرت سہروردیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاء، پیر عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ گنگوہیؒ، امام ابن عربی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان جیسے دیگر بے شمار اکابر اولیاء اللہ کے بارہ میں جنہوں نے حضرت امام صاحبؒ کے الفاظ ۔ "ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے" ۔ سے بھی زیادہ واضح، ایمان افروز اور شرک سوز الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیا ان بزرگانِ کرامؒ و اولیائے عظامؒ کے یہ ارشادات بھی تمہاری تکفیر اور تبرا بازی کی زد میں آتے ہیں یا نہیں ؟ آہ! مشرکین مکہ نے بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سن کر اسے بزرگوں کی توہین سمجھا اور کہا تھا ۔ "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ حضرت امام شہیدؒ پر اعتراض کرنے والوں کا بھی یہی حال ہے اَللّٰھُمَّ اھدِ قومی فانھم لَا یَعلَمُوْن ۔

دوسرا اعتراض

حضرت امام صاحبؒ نے "تقویۃ الایمان" میں اللہ تعالیٰ کی شان و عظمت بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر شفاعت کے بیان میں فرمایا ہے :-

"اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبرئیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے[۲]"

اس عبارت کو سامنے رکھ کر اہلِ بدعت نے امام صاحبؒ پر عداوت و توہینِ انبیاء اور انکارِ نبوت کے بہتان باندھے ہیں ۔

جواب

اس عبارت پر سب سے پہلے مولانا فضل حق خیر آبادیؒ نے اعتراضات کیے تھے، جن کا جواب امام صاحبؒ نے خود ہی "یک روزہ" میں دیا اور

فرمایا کہ تکوین ایک علیحدہ صفت ہے اور قدرت دوسری صفت۔ وجود مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدرت الٰہی کے تحت داخل ہے تکوین کے تحت نہیں، امام صاحبؒ کی موافقت و مخالفت میں کئی رسالے بھی لکھے گئے حتیٰ کہ آخر میں مولانا فضل حق خیرآبادیؒ نے رجوع فرما لیا جیسا کہ قبل ازیں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے آپ کی مخالفت کو اپنی شکم پروری کا ذریعہ بنا لیا تھا وہ بھلا کب باز آنے والے تھے اگر وہ آپ پر سب و شتم اور تکفیر و تضلیل نہ کرتے تو ان کے تنورِ شکم کی آگ کیسے ماند پڑتی۔ انہی حضرات میں سے ایک مراد آباد کے مفتی نعیم صاحب بھی تھے جنہوں نے اس عبارت کو سامنے رکھ کر آپ پر عداوت و توہین انبیاء اور ختم نبوت کے بہتان باندھے اور ایسی بازاری زبان استعمال کی کہ الامان و الحفیظ۔ ہمیں تو آپ کے "ملفوظات" نقل کرنے کا یارا نہیں اگر آپ پڑھنے کی ہمت کر سکتے ہیں تو "تقویۃ الایمان" کی تردید میں ان کی کتاب "اطیب البیان" ۔ برعکس نہند نام زنگی کافور ۔ کا مطالعہ کیجئے اور ان کی خوش کلامی کی داد دیجئے۔[۱۲]

امام صاحبؒ کی محولہ بالا عبارت کا مطالعہ فرمائیے اس میں توہین یا انکارِ نبوت کا ذرہ بھر شائبہ تک بھی نہیں۔ شانِ الٰہی کے عنوان پر آپ کا یہ اندازِ نگارش اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر کی تفسیر ہے امام رازی نے آیتِ مبارکہ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا[۱۳] کی تفسیر میں لکھا ہے کہ :-

"ان الآیۃ تقتضی مزج اللطف بالعنف لانہا تدل علی القدرۃ علی ان یبعث فی کل قریۃ نذیرا مثل محمد صلی اللہ علیہ وسلم الخ"

حقیقت یہ ہے کہ امام صاحبؒ نے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مثل پیدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے نہ ختم نبوت کا انکار کیا ہے، نہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی (معاذ اللہ) توہین کی ہے۔ بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس طرزِ تحریر کی مثالیں ائمہ سلف کے کلام میں بھی بکثرت ملتی ہیں "مشتے نمونہ از خروارے" ہم ایک مثال ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ فرماتے ہیں :-

"وچوں سلطان عظمت و قدرت او نگری ہمہ معدومات را موجودات یابی

"اگر خواہد در ہر لحظہ صد ہزار چوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیافرینید و ہر نفس از انفاس ایشاں مقام قاب قوسین دہد وجلال او ذرہ زیارت نہ گردد۔"[۱۵]

علاوہ ازیں خود قرآنِ مجید میں "فعال لما یُرید"، "یفعل ما یشاء" "انما امرہ اذا اراد شیأً ان یقول لہ کُن فیکُون" اور ایسی دیگر بے شمار آیاتِ مبارکہ ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان اعتراضات کی حیثیت پر کاہ کے برابر نہیں

تیسرا اعتراض

ناخدا ترس لوگ امام صاحب پر بہتان باندھتے ہوئے عوام میں یہ بہت اچھالتے ہیں کہ آپ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت بڑے بھائی جیسی کرنی چاہیئے ۔

جواب

جواب سے قبل "تقویۃ الایمان" کی وہ عبارت ملاحظہ فرمایئے جس پر اس افتراء کی بنیاد رکھی گئی ہے ۔ امام صاحبؒ نے "تقویۃ الایمان" کے ساتویں باب میں شرک فی العادات کا تذکرہ کرتے ہوئے "مشکوٰۃ" کے باب "عشرۃ النساء" کے حوالہ سے درج ذیل حدیث نقل فرمائی ہے، جسے ہم آپ کے ترجمہ و تشریح کے ساتھ ہی نقل کرتے ہیں ۔

اخرج احمد عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فی نفر من المہاجرین و الانصار فجاء بعیر فسجد لہ فقال اصحابہ یا رسول اللہ یسجد لک البہائم والشجر فنحن احق ان نسجد لک فقال اعبدوا ربکم واکرموا اخاکم	امام احمدؒ نے ذکر کیا کہ بی بی عائشہ رضؓ نے نقل کیا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین و انصار میں بیٹھے تھے کہ آیا ایک اونٹ پھر اس نے سجدہ کیا پیغمبرِ خدا کو سو ان کے اصحاب کہنے لگے کہ اے پیغمبرِ خدا! تم کو سجدہ کرتے ہیں جانور اور درخت سو ہم کو تو ضرور چاہیئے کہ تم کو سجدہ کریں سو فرمایا کہ بندگی کرو اپنے رب کی اور تعظیم کرو اپنے بھائی کی ۔

ف :۔ یعنی انسان آپس میں سب بھائی ہیں جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے سو اس کی بڑے

بھائی کی سی تعظیم کیجیئے اور مالک سب کا اللہ ہے بندگی اس کی چاہیئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولیاء و انبیاء، امام و امام زادہ، پیر و مرشد، شہید جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی وہ بڑے بھائی ہوئے، ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم کیا ہے ہم ان کے چھوٹے ہیں سو ان کی تعظیم انسانوں کی سی کرنی چاہیئے نہ خدا کی سی[16]

ناظرین کرام! "تقویۃ الایمان" کی اس عبارت کو بار بار بغور ملاحظہ فرمائیں کیا اس میں صراحتہً یا اشارۃً یہ موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ صرف بڑے نسبی و حقیقی بھائی کے برابر ہے اور آپ کی تعظیم صرف بڑے حقیقی بھائی کی سی کرنی چاہیئے۔ آپ نے تو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد" اکرموا اخاکم " کا ترجمہ کیا ہے اور خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے پیغمبروں کو ان کی قوموں کا بھائی بتلایا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ " انما المؤمنون اخوۃ" یعنی تحقیق اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں بھی حضور داخل ہیں۔ آپ کا ایک ارشاد حضرت عروہؓ سے اس طرح مروی ہے کہ:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب عائشۃ الی ابی بکر فقال لہ ابوبکر انما انا اخوک فقال صلی اللہ علیہ وسلم انت اخی فی دین اللہ وکتابہ وھی لی حلال نکاحھا لان الاخوۃ المانعۃ من ذالک اخوۃ النسب والرضاع لا اخوۃ الدین	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوبکرؓ کی طرف حضرت عائشہؓ کے لیے پیغام نکاح بھیجا تو ابوبکرؓ نے کہا کہ میں تو آپ کا بھائی ہوں۔ نکاح کیسے ہوگا؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نسب اور دودھ کی اخوت مانع نکاح ہے صرف دینی اخوت سے نکاح ناجائز نہیں ہوا کرتا۔

اس حدیث میں آپ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی قرار دیا ہے اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا

وددت انا قد رأینا اخواننا	ہم اپنے بھائیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں اس پر

قالوا اولسنا اخوانك يا رسول الله قال انتم اصحابي واخواننا الذين لم يأتوا بعد الحديث[۱۸]

صحابہؓ نے کہا کہ ہم آپؐ کے بھائی نہیں؟ آپ نے فرمایا تم تو میرے ساتھی ہو، ہمارے بھائی تو وہ ہیں (جو ابھی پیدا نہیں ہوئے) جو بعد آئیں گے اور اسلام قبول کریں گے۔

غور فرمایئے کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے بھائیوں سے تعبیر کیا ہے جو لوگ امام صاحبؒ پر چراغ پا ہوتے ہیں معلوم نہیں وہ ان آیات اور احادیث پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور پھر لطف یہ کہ امام صاحبؒ نے "تقویۃ الایمان" کی مذکورہ عبارت میں کسی خاص شخص پر تو حکم ہی نہیں لگایا۔ آپؒ نے تو تشریحِ حدیث کے سلسلہ میں ایک عام اصول بیان فرمایا ہے۔

آپ کی مذکورہ عبارت کا تجزیہ کرنے سے درجِ ذیل امور سامنے آتے ہیں :۔

۱۔ تمام بنی نوعِ انسان خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے آپس میں بھائی ہیں۔

۲۔ سب اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے ہیں۔

۳۔ ان میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے عظیم مرتبوں سے سرفراز ا وہ بڑے بھائی ہیں۔

۴۔ ان کی توقیر و تعظیم انسانوں کی سی کرنی چاہیئے۔ نہ خدا کی سی۔

۵۔ ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم ہے کیونکہ ہم چھوٹے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ کوئی مسلمان ان امور میں سے کسی کا انکار کرسکتا ہے؟ لیکن شرک و بدعت سے جب عقل ماؤف ہوگئی ہو اور کوئی امام صاحبؒ کی مذکورہ عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھ دے تو وہ مجبور ہے کہ :۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات بزعم خود مٹا کر برادری جوڑ لی اور بھائی بندی کا رشتہ گھڑا تاکہ عوام کے قلوب سے حضورؐ کی عظمت بالکل ہی نکال دے یہ حضورؐ کی توہین ہے کوئی باپ کو یا آقا اور بادشاہ کو بڑا بھائی نہیں کہہ سکتا اگر کہے تو گستاخ بے ادب سمجھا جائے مگر یہ بے ادب شانِ رسالتؐ میں بے باکانہ گستاخی کرتا ہے[۱۹]"

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ امام صاحبؒ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی عقیدت و محبت ہے جتنی ایک کامل و مخلص مؤمن کو ہو سکتی ہے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں۔ مذکورہ عبارت سے دو تین صفحے آگے فرماتے ہیں :-

"ہمارے پیغمبر سارے جہان کے سردار ہیں کہ اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کے احکام پر سب سے زیادہ قائم ہیں اور اللہ کی راہ سیکھنے میں سب ان کے محتاج ہیں"[۲۰]

اس کے چار یا پانچ صفحات کے بعد ایمان بالرسول کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"اللہ کے رسولؐ پر یقین لانا یہ ہے کہ اس کو رسول، اللہ کا، اور بندہ مقبول، سب مخلوق سے کمالات اور خوبیوں میں افضل جانے اور جو بات رسول فرما دے اس کے بجا لانے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی سمجھے اور رسولؐ کے حکم کو سب مخلوق کے حکم سے مقدم کرے اور اس میں اپنی عقل ناقص کو دخل نہ دے اور اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی کا حکم نہ مانے اور اس کے فرمودہ کو برحق جانے پھر اس بات میں ایسا مضبوط ہو جاوے کہ کبھی شبہ نہ آوے"[۲۱]

خدارا غور فرمایئے کیا یہ سب احکام بڑے بھائی کے ہیں ؟ اور جو سرورِ دنیا و دیں رحمۃ للعالمینؐ کی مدح کے ترانے یوں الاپتا ہو، اس کی محبت و عقیدت میں ذرہ بھر شبہ کی بھی گنجائش ہے۔

فرماتے ہیں :-

وہ انسانِ کامل ہے سنتے ہو کون	ہوے مفتخر جس سے یہ دونوں کون
وہ نبی البرایا رسولِ کریم	نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیم
حبیبِ خدا سیدالمرسلین	شفیع الوریٰ ہادیٔ راہِ دین
محمدؐ ہے نام اس کا احمدؐ لقب	بیاں ہو سکے اس کے منقبت کبؐ[۲۲]

چوتھا اعتراض

امام شہیدؒ پہ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ کے نزدیک نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آنا بیل

اور گدھے کے خیال سے بدتر ہے۔ بعض دروغ گو تو اسے یُوں بھی ذکر کر دیتے ہیں کہ نماز میں اگر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خیال آ جائے تو ان کے نزدیک نماز ہی نہیں ہوتی۔

جواب اس بہتانِ عظیم کی حقیقت سے نقاب کشائی سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس کی بنیاد "صراطِ المستقیم" کی ایک عبارت پر ہے اور "صراطِ مستقیم" حضرت امام صاحبؒ کی کوئی تصنیف نہیں بلکہ وہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ اور باب اوّل و چہارم امام صاحبؒ کا ترتیب دیا ہُوا ہے اور باب دوم، سوم حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ کے داماد، سیّد احمد شہیدؒ کے مُرید خاص اور امام صاحبؒ کے رفیق حضرت مولانا عبدالحی کے مرتب کردہ ہیں۔ جس عبارت پر مذکورہ بہتان کی بنیاد ہے وہ باب دوم سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس ناپاک بہتان باندھنے والوں کی "صراطِ المستقیم" سے بے خبری پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اگر انہیں خبر ہے تو امام صاحبؒ کی دشمنی میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ان افترا پردازوں کا مقدمہ خُدا کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے واللہ المستعان علی ما تصفون۔

"صراط المستقیم" کے باب دوم کی فصل سوم کی دوسری ہدایت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو عبادت میں خلل انداز ہوتی ہیں اور پھر اس کا علاج بھی بتایا گیا ہے جو کہ تین افادوں پر مشتمل ہے۔ پہلے افادہ میں بتایا گیا ہے کہ نفس اور شیطان دونوں نماز میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ نفس تو اس طرح سے کہ سستی کرتا ہے اور اپنا آرام چاہتا ہے اور ارکانِ نماز ادا کرنے میں جلدی کرتا ہے تاکہ جلدی فراغت حاصل کر کے سو رہے یا آرام کرے اور اپنی محبوب چیز میں مشغول ہو جائے اور نماز کے پڑھنے میں قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ مسنون طور پر نہیں کرتا بلکہ لاغر اور مفلوج لوگوں کی طرح سستی کا مظاہرہ کرتا ہے پھر شیطان کے وسوسہ ڈال کر خلل اندازی کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ :-

واما شیطان پس وسوسہ می اندازد و قبیح وساوس وسے سبکی شان صلوٰۃ وقلت مبالات بآں وچنداں کار آمدنی ندانستن آں واین وسوسہ جلد تر بکفر می رساند استخفاف وانکار فرضیت پیش می آید و آدمی کافر می گردد	اور شیطان وسوسہ ڈال کر خلل اندازی کرتا ہے اور نماز کی شان میں سبکی اور اس سے بے پروائی اور اس کو کار آمد نہ سمجھنا اس کے بدترین وساوس سے ہے اور یہ وسوسہ فرض کے استخفاف اور انکار کی وجہ سے بہت جلد کفر

و ادنائے وسوسہ اش آنکہ از حضور مخاطبہ و
مکالمہ و لذت مناجات رب العزت غافل
سازد بایں طریق کہ شمار رکعات یا تسبیحات
را بخوبی باید دانست مبادا سہوے و غلطے واقع
شود یا در متشابہاتِ قرآنِ مجید حافظ را می
اندازد کہ آنرا در خیال دارد بنابریں صیانت از
غلطی باوجودیکہ ہماں نماز خواں یکبار یا دو بار یا
صد بار آزمائش کردہ کہ در لقائے حضور ہم
نہ تخلخلے در رکعت می شود و نہ در تسبیحات
و نہ تشابہہ در قرآن می افتد ایں مکر شیطان
است و غرضش یاد دہی رکعات و تسبیحات و
متشابہات نیست بلکہ تنزیل و فرود آوردن
است از مرتبہ اعلیٰ بمرتبہ ادنیٰ و ہلم جرّاً تاکہ
بمقصود اصلی رساند و مقصود اصلی آں رجیم ہماں
انکار و کفر است اگر بفضلہ تعالیٰ آں مقصودش
سرانجام نہ گشت پس بناچاری بمقتضائی " اذا فات
اللحم فاشرب المرقۃ" آہستہ آہستہ
بخیال گاؤخر می رساند تاکہ ایں صورت مستحق
گردد کہ ع

بہ زبان تسبیح و در دل گاؤخر

گاؤخر تمثیل است ہر چہ سوائے
حضور حق است گاؤ باشد یا خر فیل باشد
یا شتر باشد ۲۲

تک پہنچاتا ہے اور اس کا ادنیٰ وسوسہ یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اور اس کی ہم کلامی اور
مناجات کی لذت سے اس طرح غافل کر دیتا
ہے کہ رکعتوں یا تسبیحوں کی گنتی میں مشغول
کر دیتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ اس گنتی کو اچھی
طرح جاننا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ غلطی یا سہو
ہو اور قرآن کے حافظ کو غلطی سے بچنے کے
لیے متشابہات کے خیال میں ڈال دیتا ہے
باوجودیکہ وہی نمازی ایک، دو یا سو دفعہ آزما
چکا ہوتا ہے کہ لقائے حضور میں نہ تو رکعتوں
اور تسبیحوں کی تعداد میں کوئی خلل واقع ہوتا
ہے اور نہ قرآن میں تشابہہ ہوتا ہے، یہ
شیطان کا مکر ہے اور یاد دلانا تو اس کا مقصود
نہیں بلکہ نمازی کو اس کے اعلیٰ مرتبے سے ادنیٰ
کی طرف اتارنا مقصود ہوتا ہے یہاں تک کہ
کشاں کشاں اپنے اصلی مقصود تک جا پہنچتا
ہے اور اس مردود کا اصلی مقصود بھی انکار اور
کفر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے
اس کا وہ مقصود پورا نہ ہو تو بمقتضائے

" جب گوشت نہ ملے تو شوربہ
ہی پی لو "

آہستہ آہستہ گاؤخر کے خیال کی طرف لے
جاتا ہے۔

حتیٰ کہ یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے ع "بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر" یہ تو ایک مثال ہے حضور خدا تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہو خواہ گاؤ ہو خواہ گدھا، ہاتھی ہو یا اونٹ، سب کا یہی حکم ہے"

ناظرینِ کرام مذکورہ بالا عبارت اور اس کے ماقبل و لبعد کا بغور مطالعہ کر کے انصاف سے فرمائیں کہ اس بہتانِ عظیم کا یہاں ذرّہ بھر بھی شائبہ ہے، جس کو یہ افترا پرداز بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں؟ یا اس کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ نفس و شیطان کے وسوسوں میں مبتلا ہو جانے سے نماز میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور پھر بعض وساوس بعض دیگر کی نسبت زیادہ موجب قبح و نقصان ہوتے ہیں مثلاً وسوسۂ زنا اپنی بیوی سے صحبت کے خیال کی نسبت زیادہ بُرا ہے۔ اسی طرح گاؤ خر کے خیال کی نسبت اپنے شیخ، بزرگ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نماز میں ہمہ تن بالقصد مصروف ہو جانا زیادہ موجب نقصانِ صلوٰۃ ہے کیوں کہ گاؤ خر کے خیال سے تو کراہت و نفرت پیدا ہوگی، لیکن بزرگوں کے خیال میں محویت و استغراق مظنۂ تعظیم کی وجہ سے شرک تک پہنچا دیتا ہے۔

"صراط المستقیم" کی اس عبارت کی تائید میں دیگر بے شمار ائمہ عظام اور اولیائے کرام کے ارشادات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے۔

"وادب الباطن ھو ان تحفظ قلبك من خطور الاغیار سواء کان خیراً او شراً فانھما فی الحجاب سواء"[۴۲]

اور باطن کا ادب یہ ہے کہ تو اپنے دل کی اغیار کے خیالات سے حفاظت کرے خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے کیوں کہ حجاب کے اعتبار سے دونوں مساوی ہیں۔

حضرت شیخ یحییٰ فرماتے ہیں:۔

اوّل معرفت اینست کہ جملہ مخلوق را مقہور و عاجز و اسیر حق بنید و نسبت خویش از ہمہ قطع کند[۴۳]

اوّل معرفت یہ ہے کہ تمام مخلوق کو حق تعالیٰ کا مقہور اور عاجز و اسیر جانو اور تمام سے اپنی نسبت کو منقطع کر لو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقم طراز ہیں:۔

نگہبانی دل کند و دل را متوجہ حق

اپنے دل کی نگہبانی کرو اور دل کو حق تعالیٰ کی

داردو ہر چہ غیر از حق است او را در باطن جائے ندہ[۲۵] طرف متوجہ رکھو اور غیر حق کو اپنے باطن میں جگہ نہ دو۔

اور تو اور خود مولوی احمد رضا نے لکھا ہے کہ:۔

"نمازی جب ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے اے نبی آدم کس طرف التفات کرتا ہے کیا مجھ سے کوئی بہتر ہے جس کی طرف التفات کرتا ہے پھر جب دوبارہ التفات کرتا ہے تو ایسا ہی فرماتا ہے پھر جب تیسری بار التفات کرتا ہے اللہ عزوجل اپنی خاص رحمت کو اس سے پھیر لیتا ہے۔ رواہ البزار عن جابر بن عبد اللہ"[۲۶]

مولوی صاحب نے مزید لکھا ہے

"عزوجل کا نام سن کر جل جلالہ کہا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک سن کر درود پڑھا یا امام کی قرأت سن کر صدق اللہ و صدق رسولہ کہا تو سب صورتوں میں نماز جاتی رہی"[۲۷]

معلوم نہیں اہل بدعت کا ان علمائے کرامؒ جن کے ارشادات ہم نے نقل کیے اور پھر اپنے پیر و مرشد مولوی احمد رضا بریلوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ بھی حضرت امام صاحبؒ پر چراغ پا ہوتے ہیں، جن کی اپنی نمازوں کا حال یہ ہے کہ:۔

"نماز میں اگر بیگانہ عورت کی شرم گاہ پر نظر جا پڑے جب بھی نماز و وضو میں خلل نہیں، ایضاً اگر عورت کو طلاق رجعی دی تھی، ہنوز عدت نہ گزری تھی یہ نماز میں تھا کہ عورت کی فرج داخل پر نظر پڑ گئی اور شہوت پیدا ہوئی رجعت ہو گئی اور نماز میں فساد نہ آیا اور اگر قصداً بھی ایسا کرے تو مکروہ ضرور ہے مگر نماز فاسد نہیں"[۲۸]

غور فرمائیے ان "اعلیٰ حضرت" کے نزدیک نماز میں جل جلالہ یا درود شریف یا صدق اللہ وصدق رسولہ پڑھنے سے تو نماز جاتی رہتی ہے مگر نماز میں عورت کی شرمگاہ پر قصداً نظر پڑ جانے سے نماز نہ جائے گی۔ اس عقل پروری اور تفقہ نوازی کو مفتیان بریلی و بدایون کے سوا کون سمجھ سکتا ہے؟

اللہ اپنے انوار و تجلیات کی بارشیں فرمائے حضرت امام صاحب رح کے ہم نام، فاضل جلیل عالم نبیل حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب رح محدث گوجرانوالہ کے مرقد پر کہ انہوں نے "صراط المستقیم" اور علمائے بریلی کے اس عقیدہ میں موازنہ کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا :۔

"عنوان یا تعبیر کچھ ہو بات صحیح اور درست تھی کہ محبوب اور پسندیدہ چیز کے تصوّر سے طبیعت کے رجحان اور خشوع پر زیادہ اثر پڑے گا۔ گاؤ خر ایسی معمولی اور حقیر چیز کے تصوّر سے نماز اور خشوع پر وہ اثر نہیں پڑے گا۔ بات پتے کی تھی آنحضرتؐ کے ساتھ محبت اور والہانہ تعلق جب توحید کی سرمستیوں سے ٹکرائے تو اس سے بچنا بڑی دانشمندی ہے۔ نہ تو نبوت کی بلندیوں کو گاؤ خر کی حقارتوں سے ہم آہنگ ہونے دیا جائے نہ ہی نماز کے معراج اور مکالمہ الٰہیہ کے ذوق میں کسی دوسرے محبوب کو اشتراک کا موقعہ دیا جائے۔

مسئلہ درست تھا اگر تعبیر ناپسند تھی تو اسے بدل دیا جاتا۔ مولانا عبدالحی بڈھانوی رح کا ترجمہ وحی نہیں تھا لیکن یہاں کوئی پرانا بغض تھا جسے نکالنا ضروری سمجھا گیا سید احمدؒ کا ارشاد اور مولانا عبدالحی بڈھانوی رح کا ترجمہ دونوں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رح کے نام لگا دیئے گئے اور فتووں کی مشینیں تان دی گئیں اور کفر کے انبار بالاکوٹ کے میدان میں دریائے منہار کے کناروں پر انڈیل دیئے گئے جنہیں خونِ شہادت کے چند قطروں نے دریائے منہار کی لہروں کے سپرد کر دیا اور شہداء کی طہارت ان نجس اور غلیظ فتووں سے متاثر نہ ہو سکی۔

سراسیمگی اور شوریدہ سری کی کوئی حد ہے کہ سید احمد شہید رح کے ملفوظات اور مولانا عبدالحی کا ترجمہ دونوں بیچارے شاہ اسمٰعیل رح کے نام الاٹ کر دیئے گئے اور درس و افتا کی مسندیں شہید حق کے کیڑے نکالنے میں مشغول ہو گئیں، جو ان کے درجات کی رفعت کا موجب ہوں گے۔ انشاءاللہ سید شہید نے نماز کی سرگوشیوں میں آنحضرتؐ کے مقام کی رفعت اور گاؤ خر کی حقارت اگر لفظوں میں اگر امتیاز فرما کر نماز کی روحانی کیفیتوں کو شرک کی غلاظتوں سے پاک وصاف رکھنے کی تلقین فرمائی تو وہ کافر ہوئے اس لیے کہ وہ آنحضرتؐ سے محبت فرماتے ہیں۔ آپ کی فقہی موشگافیوں نے حریم شاہ

میں مصحف کے تقدس کو شرمگاہ کی عُریانی اور انسانی کمزوریوں کے جنسی شہوت سے قرآن عزیز کو شکست دے دی، آپ کا ایمان سلامت رہا۔ اور آپ بالکل تازے اہلِ سنت وجماعت ہو گئے اور شہدائے بالاکوٹ شہادت اور قربانی کے باوجود کافر ہی رہے ؎

من کان ھذا القدر مبلغ علمہ
فلیستتر بالصمت و الکتمان[29]

پانچواں اعتراض

دشمنانِ توحید وسنت کا حضرت امام صاحبؒ پر ایک بہتان مسئلہ حیات النبیؐ کے سلسلہ میں بھی ہے چنانچہ مولوی نعیم مراد آبادی نے لکھا ہے کہ :-

"تقویۃ الایمان" والا مسلمانوں کے قلوب سے حضور کی عظمت کم کرنے کے لیے اور زیادہ گستاخی کرتا ہے دیکھیے "تقویۃ الایمان" صـ۹۹ میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں۔ یہ بے باکانہ گستاخی اور حضور پر افترا معاشاوکلا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز یہ نہیں فرمایا یہ حضور پر بہتان ہے۔ حضور فرماتے ہیں جس نے مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنائے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابودرداءؓ سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ حی یرزق[30] ..... الخ

جواب

مولوی مراد آبادی کی اس مندرجہ بالا عبارت میں حضرت امام صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ و بردمضجعہٗ پر پہلا بہتان تو یہ ہے کہ معاذ اللہ آپ مسلمانوں کے قلوب سے حضور کی عظمت کم کرنا چاہتے ہیں۔ ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ ہم تیسرے اعتراض کے جواب کے آخر میں امام صاحبؒ کی مثنوی "سلکِ نور" سے چند اشعار اور "تقویۃ الایمان" سے دو اقتباس نقل کر آئے ہیں جو آپ کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت و عقیدت پر شاہد عدل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غور فرمائیے جس نے اپنی کتاب کے ابتدا اور انتہا

ہیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے ساتھ ساتھ سرورِ دنیا و دیں، رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا ہو اس پر یہ الزام کس قدر بے بنیاد اور گھٹیا سا ہے
"تقویۃ الایمان" کے ابتدا میں آپ فرماتے ہیں :-

"الٰہی ہزار ہزار شکر تیری ذات پاک کو کہ ہم کو تو نے ہزاروں نعمتیں دیں اپنا سچا دین بتایا اور سیدھی راہ چلایا اور اصل توحید سکھائی اور اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں بنایا اور ان کی راہ سیکھنے کا شوق دیا آپؐ کی اور ان کے نائبوں کی ۔ کہ جو آپؐ کی راہ بتاتے ہیں اور ان کے طریقے پر چلاتے ہیں ۔ محبت دی سوائے پروردگار ہمارے! تو اپنے حبیبؐ پر آپؐ کے آل اصحاب پر اور اسؐ کے سب نائبوں پر ہزار ہزار درود اور سلام بھیج اور اس کی پیروی کرنے والوں پر رحمت کر اور ہم کو ان میں شریک کر اور ہم کو اسی کی راہ پر جیتے اور موئے قائم رکھ اور انہیں کے تابعوں میں گن رکھ ۔ آمین ربّ العالمین"[۳۱]

"تقویۃ الایمان" کا اختتام ان الفاظ پر ہے ۔

"سوائے مالک ہمارے! اپنے پیغمبر رحیم و کریم پر ہزاروں درود و سلام بھیج انہوں نے جیسا ہم سے جاہلوں کو دین کے سکھانے میں حد سے زیادہ کوشش کی سو تو ہی اس کوشش کی قدردانی کر ہم تو ایک عاجز بندے ہیں، محض بے مقدور ۔ سو جیسا تو نے اپنے فضل سے ہم کو شرک و توحید کے معنی خوب سمجھائے لا الٰہ الا اللہ کا مضمون خوب تعلیم کیا اور مشرک لوگوں میں سے نکال کر موحد پاک مسلمان بنایا ۔ اسی طرح اپنے فضل سے بدعت و سنت کے معنی خوب سمجھا ۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مضمون خوب تعلیم کر اور بدعتی مذہبوں میں سے نکال کر سنّی پاک ، متبع سنت سا کر"[۳۲]

مرادآبادی صاحب کا دوسرا بہتان حیات النبیؐ کے سلسلہ میں ہے اس بہتان کی بنیاد بھی "تقویتہ الایمان" کی وہ عبارت ہے جو آپ نے پانچویں فصل میں قیس بن سعد کی اس حدیث کی تشریح میں لکھی ہے، جو مشکوٰۃ کے باب عشرۃ النساء کے حوالہ سے درج فرمائی ہے، وہ حدیث آپ کے ترجمہ و تشریح کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے تاکہ قارئینِ کرام افتراء پردازوں کے ظلم اور ناخدا ترسی کا خود ہی اندازہ لگالیں۔

"عن قیس بن سعد قال اتیت الحیرۃ فرأیتھم یسجدون لمرزبان لھم فقلت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احق ان یسجد لہ فاتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت انی اتیت الحیرۃ فرأیتھم یسجدون لمرزبان لھم فانت احق ان نسجد لک فقال لی أرأیت لو مررت بقبری أکنت تسجد لہ فقلت لا فقال لا تفعلوا۔"

قیس بن سعدؓ نے نقل کیا کہ۔ گیا میں ایک شہر میں جس کا نام حیرہ ہے سو دیکھا میں نے وہاں کے لوگوں کو کہ سجدہ کرتے تھے اپنے راجہ کو سو کہا میں نے البتہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ لائق ہیں کہ سجدہ کیجئے ان کو پھر آیا میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پھر کہا میں نے کہ گیا تھا میں حیرہ کو سو دیکھا میں نے ان لوگوں کو کہ سجدہ کرتے تھے اپنے راجہ کو سو بہت لائق ہو کہ سجدہ کریں ہم آپ کو تو فرمایا مجھ کو نہ بھلا خیال تو کر جو تو گزرے میری قبر پہ کیا سجدہ کرے تو اس کو۔ میں نے کہا "نہیں" فرمایا تو مت کرو۔

یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ کے لائق ہوں! سجدہ تو اسی ذاتِ پاک کو ہے کہ نہ مرے کبھی[۲۳]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت قیس بن سعدؓ کے سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو یہ استفسار فرمایا "کیا تم میری قبر کو بھی سجدہ کروگے" اس سے آپ کا مقصود کیا تھا۔ شارحین نے فرمایا ہے کہ اس سے شانِ ربوبیت کی عظمت اور شانِ عبودیت کی ذلت کی طرف اشارہ تھا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "آپؐ کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے سجدہ کرنے کا جو

خیال تمہارے دل میں پیدا ہوا یہ اس وقت کی میری ہیبت اور جلالت کی وجہ سے ہے جب کہ میں تمہارے سامنے اپنی موجودہ حیثیت کے ساتھ موجود ہوں لیکن کل جب مجھ پر موت وارد ہو جائے گی اور مجھے قبر میں دفن کر دیا جائے گا تو خود تم بھی مجھے سجدہ کرنے کا ارادہ نہ کرو گے اور میری قبر کو سجدہ کے قابل نہ سمجھو گے" اسی مفہوم کو امام صاحبؒ نے اپنے ان سادہ الفاظ میں بیان فرمایا کہ "یعنی میں بھی مرکر ایک دن مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ کے لائق ہوں، سجدہ تو اسی ذات پاک کو ہے کہ نہ مرے" بس یہی وہ فقرہ تھا جسے خوفِ خدا ملحوظ نہ رکھنے والے مفتریوں نے سامنے رکھ کر امام شہیدؒ کے خلاف کفر کی مشین تان دی اور "مٹی میں ملنے والا ہوں" کے الفاظ کو توان ناخدا ترسوں نے گستاخی پر محمول کرتے ہوئے بہت ہی اچھالا حالانکہ ان جاہلوں کو اتنا علم بھی نہیں کہ "مٹی میں ملانا" قدیم اردو زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے معنی دفن کرنا بھی ہیں چنانچہ فرہنگ آصفیہ میں نسیم دہلوی کا یہ شعر بھی بطورِ استشہاد لکھا گیا ہے ؎

نسیم اعداء سے شکوہ کیا پس از مرگ
ہمیں یاروں نے مٹی میں ملایا!

لہٰذا اس جملہ کی بناء پر امام صاحبؒ پر یہ بہتان کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ انور کے مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کے قائل ہیں بے بنیاد ہے باقی رہا آپ کا "مرنے" کے الفاظ کو استعمال کرنا تو یہ بھی غلط نہیں کیوں کہ اس بات پر جملہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ ان کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر شریف کی تریسٹھ بہاریں دیکھیں، بعثت کے بعد تیرہ سال مکہ معظمہ اور دس سال مدینہ طیبہ میں گزارے اور ماہِ آخر ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں آپ کا روحِ مبارک قفسِ عنصری سے پرواز کرکے اپنے اللہ کے حضور جا پہنچا۔ قرآن مجید میں بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا تھا۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ (اے ہمارے پیغمبر!) آپ بھی ضرور مرنے والے ہیں اور (بالیقین آپ کے دشمن) وہ بھی مرنے والے ہیں۔

اگر آپؐ کا وصال ہی نہیں ہوتا تھا اور آپؐ پر موت نے طاری ہی نہیں ہونا تھا تو آپ کے مرض - وہ جسے مرض الموت یا آخری مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے ــــ میں بار بار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِن

للموت سکرات" فرمانے کا کیا مقصد؟ آپ کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کا پیشانی مبارک پر بوسہ دیتے وقت یہ فرمانے کا کیا مطلب؟

"بأبی انت وامی لا یجمع اللہ علیك موتتین اما الموتة التی کتبت علیك فقد متھا"[36]

میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتوں کو جمع نہیں فرمائیں گے اللہ نے آپ کے لیے جو طبعی موت مقدر کی تھی وہ وارد ہو چکی اور آپ وفات پا چکے۔

اور پھر صدیقِ اکبرؓ نے مسجدِ نبوی میں تشریف لا کر حضرات صحابہ کرامؓ کے سامنے جو درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا، اس سے کیا مراد تھی۔

"من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات و من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت"

جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کیا کرتا تھا اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ وفات پا گئے اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے (اسے اطمینان رکھنا چاہیے) کہ اللہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

امام صاحبؒ کو گستاخی کا طعنہ دینے والے مفتیانِ کرام حضرت صدیقِ اکبرؓ کے اس ارشاد کے بارے کیا فرماتے ہیں؟ اس خطبہ کی سماعت کے بعد صحابہ کرامؓ کے سکوت، حضرت عمرؓ کے رجوع اور امہات المومنین کے سوگ کا معلوم نہیں آپ کیا مفہوم سمجھتے ہیں؟ ذرا عقل کے ناخن لیں اگر آپؐ نے وفات نہیں پائی اور بقیدِ حیات ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آپ مسجد کے ایک خادم کی وفات پر تو بے قرار ہوں اور قبر پہ نمازِ جنازہ بھی ادا فرمائیں لیکن حضرت ذو النورین عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے اندوہناک سانحوں پر تعزیت کے لیے بھی تشریف نہ لائیں؟ تعجب ہے کہ آپ کو روحانی اور جسمانی لحاظ سے تحقیقی زندگی اور ابدی حیات نصیب ہوئے[37] اور آپ امام حسینؓ کی شہادت، مختار ثقفی کی عیاریوں، حرہ کے فتنہ، حجاج بن یوسف کے مظالم، سقوطِ بغداد اور مسیلمہ کذاب و اسود و مرزا غلام احمد قادیانی ایسے دجالوں کی رداۓ نبوت جھپٹنے کی ناپاک کوششوں ایسے حادثات میں کہیں بھی مداخلت کی ضرورت محسوس نہ فرمائیں؟ معلوم نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تذکرہ سے دیوبند سے بریلی تک ارتعاش کی کیفیت

کیوں طاری ہو جاتی ہے جب کہ کتب احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، موت تجہیز و تکفین وغیرہ کے ابواب تک موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک اور روحِ اطہر کا ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ سے دنیوی پیوند ٹوٹ چکا ہے اور یہی موت وصال یا وفات ہے جو برزخی زندگی کے منافی نہیں بلکہ اس منزل تک پہنچنے کا واحد وسیلہ ہے

وللتفصیل موضع آخر۔

چوتھا اعتراض

حضرت امام صاحبؒ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ آپ معاذ اللہ شفاعت کے منکر ہیں چنانچہ مولوی نعیم الدین مراد آبادی نے لکھا ہے کہ :۔

"تقویۃ الایمان" والے نے انکارِ شفاعت میں بڑا ہی غضب ڈھایا آیتوں اور حدیثوں کے معنی میں تحریفیں کیں۔ کفار اور بتوں کے حق میں جو آیات نازل ہیں اُن کو مقربانِ بارگاہِ حق پر چسپاں کیا[۳۸]

اسی طرح انہوں نے "اطیب البیان" کے کئی صفحات' خوفِ خدا کو بالکل بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بہتان کو بڑی شدومد سے لکھنے کے لیے سیاہ کر دیئے ہیں[۳۹]

جواب

ناظرینِ کرام! اس بہتان کی حقیقت کے لیے "تقویۃ الایمان" کے "پانچویں باب" "اشراک فی التصرف" کا مطالعہ فرمائیے۔ اس فصل میں آپ نے مسئلہ شفاعت کو بیان فرماتے ہوئے سورۂ سبا کی آیت" وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ" کی تشریح و تفسیر میں فرمایا ہے کہ :۔

"اکثر لوگ اولیاء انبیاء کی شفاعت پر بھول رہے ہیں اور اس کے معنی غلط سمجھ کر اللہ کو بھول گئے ہیں سو شفاعت کی حقیقت سمجھ لینا چاہیئے۔

سنا چاہیئے شفاعت کہتے ہیں سفارش کو اور دنیا میں سفارش کئی طرح کی ہوتی ہے جیسے ظاہر کے بادشاہ کے ہاں کسی شخص کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر و وزیر اس کو اپنی سفارش سے بچالیوے

تو ایک تو یہ صورت ہے کہ بادشاہ کا جی تو اس چور کے پکڑنے ہی کو چاہتا ہے اور اس کے آئین کے موافق اس کو سزا پہنچتی ہے مگر اس امیر سے دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے کیوں کہ وہ امیر اس سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک جگہ اپنے غصہ کو تھام لینا اور ایک چور سے درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے بڑے امیر کو ناخوش کر دیجئے کہ بڑے بڑے کام خراب ہو جاویں اور سلطنت کی رونق گھٹ جاوے اس کو "شفاعتِ وجاہت" کہتے ہیں یعنی اس امیر کی وجاہت کے سبب اس کی سفارش قبول کی۔

سو اس قسم کی سفارش اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی جو کوئی نبی اور ولی کو یا امام اور شہید کو یا کسی فرشتہ کو یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے، سو وہ اصلی مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے معنی کچھ نہیں سمجھے اور اس مالک الملک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی

قارئینِ کرام! اس مذکورہ بالا عبارت کا بغور مطالعہ فرمائیں جس پر افتراء پردازوں نے اپنے اس بہتان کی بنیاد رکھی ہے اور پھر خدارا انصاف سے کہیں کہ اس عبارت کے کسی جزء سے بھی اختلاف کی گنجائش ہے؟ کیا یہ مفہوم قرآنِ مجید کی درجِ ذیل آیات سے ماخوذ نہیں؟

(۱) وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ	یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ، ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ

وَلَا فِي الْاَرْضِ ط سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ [۴۱] — نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے، اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

●

غور فرمایئے اس آیت شریفہ میں سفارشیوں کے معدوم کرنے کے لیے کس قدر لطیف اندازِ بیان کو اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کی جناب میں تمہارا سفارشی ہے، پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اس کو خبر دے رہے ہو؟ دوسری بات اس آیت مبارکہ سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ بُت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بُت پرستی کا منشا اولیاء و انبیاء کی تعظیم تھی انہوں نے اپنے بتوں کو انہی کی صورت پر تراشا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا سفارشی سمجھ کر اپنا سرِ نیاز ان کے سامنے خم کرتے تھے چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں امام رازیؒ نے بھی لکھا ہے کہ :۔

> "بُت پرستوں نے اصنام و اوثان اپنے انبیاء و اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے تو یہ اکابر اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے اس کی مثال اس زمانے میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے، اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے" [۴۲]

(۲) مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ [۴۳] — کون ہے جو اس کے پاس اس کے حکم کے بغیر سفارش کر سکے۔

(۳) مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ [۴۴] ط — کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔

(۴) لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ [۴۵] — اس روز کسی کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔ مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے۔

یہ اور ان جیسی دیگر بے شمار آیات اور احادیث کے مطالعہ سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے امام صاحبؒ نے اسے نہایت سلیقہ سے اپنے مخصوص طرز میں بیان فرما دیا ہے چنانچہ آپ نے شفاعت کی تین قسمیں بیان کی ہیں (۱) شفاعتِ وجاہت (۲) شفاعتِ محبت (۳) شفاعت بالاذن۔ ان میں سے آپ پہلی دو قسموں کے نہیں لیکن تیسری قسم کے قائل ہیں کیوں کہ کتاب و سنت کا مفاد یہی ہے چنانچہ آپ مؤخر الذکر قسم کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

"اللہ کی جناب میں اسی قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اس کے معنی یہی ہیں۔"[۱]

امام صاحبؒ تو شفاعت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن حقیقت میں آپ پر انکارِ شفاعت کا بہتان لگانے والوں کا ہی شفاعت پر ایمان نہیں۔ اس کے لیے درجِ ذیل دو حوالے ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی احمد رضا خاں لکھتے ہیں :۔

"حضورؐ ہر قسم کی حاجت روا فرما سکتے ہیں، دنیا و آخرت کی سب مرادیں حضورؐ کے اختیار میں ہیں"

مولوی احمد رضا کے شاگرد مولوی امجد علی لکھتے ہیں :۔

"حضور اقدس صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اللہ عزوجل کے نائبِ مطلق تمام جہان حضورؐ کے تحت تصرّف کر دیا گیا ہے جو چاہیں کریں، جسے جو چاہیں دیں، جس سے جو چاہیں واپس لیں .... تمام آدمیوں کے مالک ہیں ...... تمام زمین ان کی مِلک ہے تمام جنّت ان کی جاگیر ہے، ملکوت السماء والارض حضورؐ کے زیرِ کمان ہے، جنّت اور نار کی کنجیاں دستِ اقدس میں دے دی گئی ہیں"[۲]

جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے انہیں آپؐ کی شفاعت کی کیا ضرورت ہے ؟ اور پھر آپ نے ان لوگوں کو جھوم جھوم کر اس قسم کے شرکیہ اشعار پڑھتے ہوئے بھی سنا ہوگا :۔

ے اللہ کے بتّے ہیں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے

ے وہ جو کہ مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

اور یہ لوگ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مالک کون و مکان ہونے اور ؏
احد ہیں اور احمد میں فقط ہے میم کا پردہ

قسم کے عقائد پر ایمان رکھتے ہیں یہ درحقیقت سرورِ دنیا و دیں، رحمۃ للعالمین، شافع روزِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب شفاعت کا منہ چڑاتے ہیں آہ ؏
وہ الزام ہم کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

ساتواں اعتراض

حضرت امام صاحبؒ پر خدا اور اس کے دشمنوں نے ایک بہتان یہ بھی لگایا کہ آپ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ[48] کی طرف منسوب اور ان کے طریقہ کے پیروکار ہیں اسی وجہ سے یہ مفتری آپ اور آپ کے متبعین کو وہابی کہتے ہیں۔

جواب

امام صاحبؒ اور آپ کی تحریک کو بدنام کرنے کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں کے ازلی و ابدی دشمن انگریزوں نے یہ بہتان لگایا تھا چنانچہ انگریز مصنف غلبی نے لکھا ہے کہ :-

"یہی زمانہ تھا جب کہ ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے ہندوستان کو وہ بیج لے گیا جس نے ۱۸۳۱ء میں ان کی شہادت کے بعد وہابیوں کو کوہِ سیاہ کا ردِعمل بخشا اور اطراف تک اس کی گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔"[49]

ہنٹر نے بھی لکھا ہے کہ :-

"سید احمدؒ کے قیام مکہ کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ ان کی تعلیمات اور ان بدو قبائلیوں کے خیالات کی طرف منعطف ہوئی جن کے

ہاتھوں مکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے علانیہ
طور پر ان کی تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دیئے گئے اس جور و تعدی
کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستانی آئے تو ایک مذہبی خواب ہیں اور
مشرکانہ بداعمالیوں کے مصلح کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ
کے معتقد و مرید کی حیثیت سے ۵۰

ان انگریزوں کی تقلید میں بدایوں و بریلی کے مفتریوں نے بھی اس بہتان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کر دیا کیوں کہ ان کی ملازمت، وظیفہ خوری اور نوازشوں کا حق تو ادا کرنا ہی تھا ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں تحریکوں کا اصلی ماخذ (کتاب وسنت) اگرچہ ایک ہے لیکن طریق کار اور اصول دعوت میں نمایاں فرق ہے اور اصولی مماثلت کے باوصف یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان کی اس تحریک تجدید و احیائے دین پر امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا قطعاً اثر نہیں پڑا۔ ڈاکٹر قیام الدین نے بھی ان دونوں تحریکوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبدأ ایک ہی ہے قرآن و حدیث۔ دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں ان دونوں تحریکوں کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کے دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے جن میں بنیادی چیز توحید اور ترک بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی "التوحید" اور شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ کی "تقویۃ الایمان" ان بنیادی امور پر زور دینے میں متفق الخیال ہیں۔"

"مگر ساتھ ہی ان دونوں کے درمیان کچھ اہم نقاط اختلاف بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نمایاں طور پر ہندوستانی تحریک کا سیاسی پہلو ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد پر زیادہ زور تھا۔ عرب میں دوسری صورت حال کی بناء پر یہ پہلو

موجود نہ تھا۔ عرب میں سیاسی اقتدار ختم نہیں ہوا تھا اس لیے عرب کے وہابی زیادہ تر سماجی و مذہبی اصلاحات کے علمبردار تھے[۵۲]۔

علاوہ ازیں امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور آپ کے ہم مسلک فقہی مسائل کو کتاب و سنت کی میزان میں رکھتے ہیں اگر کتاب و سنت سے زیر بحث مسائل کے متعلق نصوص نہ مل سکیں تو پھر وہ ان کے متعلق فقہائے کرامؒ کے اقوال و آراء کا کتاب و سنت کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں جو موافق ہوں انہیں تسلیم اور جو مخالف ہوں انہیں ناقابل تسلیم قرار دیتے ہیں اور اس معاملہ میں وہ کسی شخصیت کی پرواہ نہیں کرتے لیکن اس کے برعکس شیخ الاسلام امام محمد بن عبد الوہابؒ فروع فقہ میں امام اہل سنت حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دونوں تحریکوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

> "مولانا شہیدؒ نے اپنی کتاب "تقویۃ الایمان" میں "توسل فی الدعاء" کو جائز اور شرکِ اصغر کے مرتکب کو کافر مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دیا ہے یہ دو اساسی مسئلے ہیں جو محمد بن عبد الوہابؒ کی کتاب "التوحید" کے مناقض ہیں[۵۳]"

آخر میں حضرت امام نواب والاجاہ سید صدیق حسنؒ کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ :۔

"...... ولکن اعداء الله و رسوله تعصبوا فی شأنه وشأن اتباعه و اقرانه حتی نسبوا طریقته هذه الی الشیخ محمد النجدی ولقبوهم بالوهابیة وان کان لا ینفعهم ولا یجدی لأنهم لا یعرفون نجدا ولا صاحب نجد[۵۴]"	لیکن خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں نے آپ (امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ) کے معاملہ میں بے جا تعصب سے کام لیا ہے اور آپؒ، آپ کے ساتھیوں اور پیروؤں سے ناروا طور پر دشمنی کی چنانچہ ان کے طریقہ کو شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی طرف منسوب کر دیا اور انہیں وہابی کہنے لگے۔ حالانکہ یہ بزرگ نجد کو جانتے تھے اور نہ ہی صاحبِ نجد کو۔

امید ہے کہ ان سطور کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہوگی کہ افترا پردازوں کا حضرت امام صاحبؒ کو شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہابؒ کا متبع و مقلد بتانا بھی "سبحانک ھذا بہتان عظیم" ہے۔

آٹھواں اعتراض

دشمنانِ امام شہید آپ پر ہوسِ ملک گیری کی تہمت بھی لگایا کرتے ہیں چنانچہ مولوی نعیم مراد آبادی نے لکھا ہے کہ :-

"شاہ ولی اللہ کے خاندان کا ہندوستان کے طول و عرض میں کافی اثر تھا بکثرت مسلمان اس خاندان کے ارادت مند معتقد تھے اس سر و سامان کو دیکھ کر مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کو خیال پیدا ہوا کہ عبدالوہابؒ نجدی کی پالیسی پر عمل کر کے وہ اپنے معتقدین کا ایک عظیم لشکر تیار کر سکتے ہیں جس سے ہندوستان کے تاج و تخت پر ان کو قبضہ مل سکے گا[۵۴]"

جواب

اس بہتان تراشی اور تہمت کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے مراد آبادی صاحب نے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ فرما لیا ہے :-

رنگ جب محشر میں لائے گا تو اُڑ جائے گا رنگ
یوں نہ کہیئے سُرخیٔ خونِ شہیداں کچھ نہیں!

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ برِّ صغیر پاک و ہند کی اس عظیم الشان تحریکِ تجدید و احیائے دین سے جسے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ اس تحریک کے بانیوں کا مقصد نہ کوئی علاقہ لینا تھا، نہ حکومت و سلطنت کی طلب تھی اور نہ جاہ و حشمت کی خواہش تھی بلکہ انہوں نے جو وطنِ مالوف کو خیرباد کہا، اعزہ و اقارب سے جُدا ہوئے اور زندگی کے بہترین حصے آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے گزارے، اس سے ان کا مقصد محض اللہ کی رضا، اس کے کلمہ کی سربلندی اور سنتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا احیاء تھا۔ چنانچہ بانیٔ تحریک حضرت سید احمد شہیدؒ ایک

مقام پر فرماتے ہیں:۔

"سو زبان سے خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ مالکِ حقیقی کی اطاعت میں مشغول ہوں اور صرف اسی کی رضا مطلوب ہے۔ خدا کے سوا ہر چیز کی طرف سے آنکھیں اور کان بند کر لیے ہیں دنیا و ما فیہا سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور محض لوجہ اللہ علمِ جہاد بلند کیا ہے مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست اور حکومت و سلطنت کی طلب سے کاملاً الگ ہو چکا ہوں۔ خدا کے سوا کسی کی جستجو نہیں رہی[۵۵]"

حضرت امام صاحب نے نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کے نام ایک مکتوب میں فرمایا:۔

تمام عمر خود را بلکہ ہر ساعتے از ساعات روز و شب را در سعی اقامتِ جہاد صرف نمائند و جمیع اوقات عزیزہ را ہمیں مساعی جمیلہ معمور دارند و صرف عمر گراں مایہ در ہمیں شغل عین سعادت عظمیٰ شمارند خواہ سعی مذکور بانجام رسد یا نرسد چہ مقصود صرف عمر خود است در اطاعت رب العالمین و اتباع سید المرسلین[۵۶]" الخ

تمام عمر خود کو بلکہ ہر لحظہ و لمحہ، رات دن قیام جہاد کی کوشش فرمائیں اور اپنے تمام عزیزو و اقارب کو اسی نیک جد و جہد میں صرف کریں اور اپنی قیمتی عمر کو اس شغل میں بسر کرنے کو سب سے بڑی سعادت شمار فرمائیں خواہ سعی مذکور انجام کو پہنچے یا نہ پہنچے کیوں کہ اپنی عمر گزارنے کا مقصد پروردگارِ عالم کی اطاعت اور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی متابعت ہے

اسی طرح آپ ایک طویل مکتوب میں میر شاہ علی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

سبحان اللہ حق اسلام ہمیں است کہ بیخ رکنِ اعظم او را برکشند و کسیکہ با وجود ضعف و ناتوانی غیرتِ ایمانی و حمیتِ اسلامی در سینۂ او جوش زند او را ملام و مطعون سازند بے شک آں قوم از مجلہ مجوس یا سکھ یا ہنود اند کہ با ملت محمدیہ عداوت میدارند

سبحان اللہ! کیا اسلام کا حق یہی ہے کہ اس رکنِ اعظم جہاد کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور جس شخص کے دل میں با وجود ضعف و ناتوانی کے غیرتِ ایمانی اور حمیتِ اسلامی موجزن ہو اس کو لعنت و ملامت اور مطعون کریں بیشک ایسی قوم تو آتش پرستوں، سکھوں اور اہل ہنود

وما ذا بعد الحق الا الضلال ویا کہ مقتضائے محمدیہ ہمیں بود کہ اگر کسے کربطور لہو بازی ذکر جہاد بزبان میراند قلوب مسلمین از استماع آن لسان گل شگفتہ می گردید بسانِ سنبل سرسبزمی شد اگر از بلاد دور است ہم آوازہ قیامِ جہاد بگوش ہوش اہلِ غیرت اسلامی فی الفور دیوانہ وار در دشت وکہسار رمیدو ویدبلکہ مثلِ شہباز پریدیہ آیا امر جہاد باوجود این عظیم شان از پایۂ تعلیم و تعلّم مثلِ کتاب الحیض و النفاس ہم ساقط گردیدہ" الخ

یں سے ہے جو ملتِ محمدی سے دشمنی رکھتی ہے بلفحوائے "وما ذا بعد الحق الا الضلال" طریقہ محمدی کا تقاضا تو یہی تھا کہ اگر کوئی شخص جہاد کا ذکر کھیل کود کے طریقہ پر بھی زبان پر لائے تو مسلمانوں کے دل اسے سن کر مسرت سے پھول کی طرح کھل جائیں اور سنبل کی طرح شاداب ہوجائیں اگر دور دراز شہروں سے بھی جہاد کے قیام کا نعرہ اس کے غیرتِ اسلامی کے کان تک پہنچتا ہے تو فوراً ہی دیوانہ دار جنگل اور پہاڑوں میں دوڑتا پھرتا ہے بلکہ شہباز کی طرح اڑتا ہے تو کیا جہاد کا حکم باوجود عظمتِ شان کے حیض و نفاس کی تعلیم و تعلّم سے بھی گری پڑی چیز ہے۔

اسی طرح حضرت امام صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ کے بے شمار مکتوبات اور ارشادات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کے ان جانباز سپہ سالاروں کا مقصدِ وحید جہاد فی سبیل اللہ، رضائے الٰہی کا حصول اور نصرت و حمیتِ دین تھا۔ ہوسِ ملک گیری ان پاکبازوں پر محض تہمت، افتراء اور بہتان ہے اس کی تو پرچھائیں تک بھی ان کے قلبِ صافی پر نہ پڑی تھی۔

ان سطور میں افترا پردازوں کے چند بڑے بڑے اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں ورنہ ان کے دیگر چھوٹے چھوٹے فضول افترآت کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے ان میں سے اکثر اس قدر بے معنی ہیں کہ ان کے جواب کی ضرورت نہیں تاہم علماء اہلِ حدیث نے ان کے جملہ اعتراضات کے نہایت مدلّل و مفصّل اور مسکت جواب

دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی بلند پایہ تصنیف لطیف "اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جزاہ اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء

باب ۷

سیرت کی چند جھلکیاں

حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، حُبِ اسلام، حمیتِ دین، شجاعت و بسالت، ایثار و فدا کاری، بے غرضی و بے نفسی، عقائد و نظریات، تحریکِ تجدید و احیائے دین، کارنامہ ہائے جہاد اور سیرت و کردار سے متعلق دیگر اُمور بیان کیے جا چکے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاید برِ صغیر پاک و ہند کی چشمِ فلک نے آپ سے بڑا کوئی مفسّر و محدّث، فقیہہ و متکلّم اور غازی و مجاہد نہ دیکھا ہو۔

اگرچہ ایک غیر صحابی کو صحابیٔ رسُول سے کوئی بھی نسبت نہیں اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے کیا خوب فرمایا تھا۔ جب ان سے استفسار کیا گیا تھا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ کہ اللہ کی قسم! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رفاقت میں حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار پڑی وہ بھی حضرتِ عمر بن عبدالعزیزؒ سے۔ ان کے علم و تقویٰ

اور فضل و کمال کے باوصف، ہزار درجہ افضل ہے، تاہم بعض اہلِ علم کے بقول اگر برصغیر میں کمالات، ایمان، اخلاص، علم، عمل، جہاد، ایثار، تحمّلِ شدائد اور اتباعِ سنت کے لحاظ سے کسی شخصیت کو مکمل طور پر حضراتِ صحابہ کرام سے مشابہت ہے تو وہ امام محمد اسمٰعیل شہید ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

ذیل میں چند چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت مزید روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ برصغیر میں "اسلامیت کے اس لبِ لباب" کے کردار کے کچھ نقوش اور بصیرت کی چند مزید جھلکیاں قارئینِ کرام کے نظر نواز ہو جائیں۔

علم و فضل

آپ کے علم و فضل کا بڑے نامی گرامی اہلِ علم نے اعتراف فرمایا ہے۔ حضرت والاجاہ نواب صدیق حسن خانؒ فرماتے ہیں۔

در علوم معقول و منقول یادِ پیشینیاں از خاطر می برد۔ در علم فروع و اصول ائمہ آں را دور تر می نشاند۔ در ہر علم کہ با او سخن رانی دانی کہ وے امام ایں فن است و در ہر فن کہ با وے مناظرہ کنی، شناسے کہ وی حافظ ایں علم است	معقول و منقول میں پہلوں کی یاد بھلا دیتے تھے فروع و اصول میں ائمہ کو پیچھے بٹھا دیتے تھے جس علم میں ان سے بات کرو گے تو جان لوگے کہ وہ اس فن کے امام ہیں اور جس فن میں ان سے مناظرہ کی نوبت آئے گی تو پہچان لوگے کہ وہ اس علم کے حافظ ہیں۔

نواب صاحبؒ کے آخری فقرہ سے امام صاحبؒ کی وہ علمی گفتگو یاد آنے لگی ہے جو آپ نے لونڈ خوڑ کے ایک رئیس اور فقہ و اصول کے ماہر حافظ پشم سے فرمائی تھی آپ نے ایک روز تفریحاً اُن سے پوچھا "حافظ صاحب! افغانوں میں جو اسقاط رائج ہے یعنی نماز کا فدیہ، اس کی بنیاد کیا ہے؟ حافظ صاحبؒ نے جواب دیا "قیاس"۔ امام صاحب نے فرمایا: "مقیس علیہ کیا ہے"؟ انہوں نے جواب دیا: "مسئلہ شیخ فانی در باب فدیہ صوم" آپ نے اس پر اعتراض وارد کیا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ دونوں کا حکم یکساں نہیں، نہ قیاس کی تعریف شرع کی رو سے حمل النظیر علی النظیر ہے" اسقاط" اس پر ٹھیک نہیں اترتا۔ اس لیے کہ مسئلہ صوم مسائل صلوٰۃ سے الگ ہے نماز میں قصر ہے، روزے میں قصر نہیں بلکہ قضا ہے۔ حائضہ و نفسہ کو نماز

معاف ہے، روزہ معاف نہیں" حافظ صاحبؒ نے یہ سُن کر کہا: "آپ اسے صدقہ سمجھ لیں جو ہر حال میں مُردے کے لیے مفید ہے" آپ نے فرمایا: "مجھے اسقاط پر اعتراض ہے، صدقہ پر نہیں صدقہ میں حساب کی حاجت نہیں" حافظ صاحب کہنے لگے" اس میں قباحت کیا ہے"؟ آپ نے فرمایا: "اوّل یہ اصول اربعہ سے باہر ہے، اس لحاظ سے بدعت ہے۔ دوّم بعض مقامات پر اموالِ موتیٰ کے وارث یتیم ہوں گے۔ آپ لوگوں نے رواجاً اسے لازم قرار دے لیا ہے۔ اور اس کا ترک بعض کے نزدیک مثل ترک فرائض ہے یتامیٰ کے مال میں بدوں وصیّت تعرض ہوگا اور استعمالِ بے جا۔ اس لحاظ سے " اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ نَارًا ط کا مورد۔ سوّم جب رکعتوں پر صدقہ مقرر ہو گیا تو آپ کو حق حاصل نہ ہوگا کہ تارکِ صلوٰۃ پر احتساب جاری کریں۔ اس طرح یہ قاعدہ مسقط صلوٰۃ ہوا۔"[4]

بقول مولانا سید محمد علی رامپوری آپ حافظ قرآن، متبحر عالم اور بیس ہزار احادیث کے حافظ تھے۔ سرسیّد نے آپ کے رسالہ منطق کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے دلائل کی قوت ارسطو کو بھی حیرت میں ڈال دیتی اور وہ اپنے دلائل کو تارِ عنکبوت سے بھی سُست تر سمجھتا[5]۔ جب آپ نے سندِ فراغت حاصل کی تو راہ چلتے ہوئے بڑے بڑے علماء کے مُشکل ترین سوالات، کتابوں کی طرف مراجعت کیے بغیر ہی حل فرما دیتے[6]۔ حکیم جمال الدین فرماتے ہیں کہ آپ کا ذہن حد درجہ سریع الانتقال تھا۔ پانچ آدمیوں کو سامنے بٹھا کر پانچ مختلف مضامین لکھواتے تھے اور کسی کا قلم رکتا نہ تھا[7]۔ مولانا خیر آبادی کا قول پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے فرمایا وہ (امام صاحبؒ) اُمّتِ محمدیہ کے حکیم تھے کوئی شئے نہ تھی جس کی انیّت اور لمیّت ان کے ذہن میں نہ ہو[8]۔ آپ کے علم و فضل کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک مرتبہ سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ نے آپ اور آپ کے رفیقِ محترم حضرت مولانا عبدالحیؒ کو اپنے ایک مکتوب میں تاج المفسرین فخر المحدثین اور سرآمد علماء محققین لکھا نیز فرمایا کہ دونوں تفسیر، حدیث، فقہ، اصُول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں۔

سادگی | علم و فضل کے اس قدر کوہِ گراں ہونے کے باوصف آپ کے قلب صافی

پر کسی قسم کے تکلف کی پرچھائیں نہ پڑی تھی۔ کبھی کبھی جب گھوڑے کو کھریرا کرتے اور اس حالت میں بھی اگر کوئی دینی وعلمی مسئلہ پوچھتا تو آپ ساتھ ساتھ جواب دیتے جاتے۔ عام علماء کی طرح وعظ وارشاد کے موقعہ پر جبّہ ودستار کا قطعاً اہتمام نہ فرماتے تھے۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے میں نہایت سادہ تھے۔

جب آپ سفرِ حج کے سلسلہ میں دیگر احباب کے ہمراہ ہگلی پہنچے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل منشی امین الدین احمد کلکتہ سے استقبال کے لیے آئے۔ سید صاحبؒ سے ملاقات کے بعد جب وہ امام صاحبؒ سے ملے تو آپ کے لباس کی سادگی کے باعث انہیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ شاہ عبدالعزیز محدّث کے برادر زادے ہیں جب آپ کو بتایا گیا کہ یہی امام محمد اسمٰعیل ہیں جن کے علم وفضل سے ملک کے درو دیوار گونج رہے ہیں تو منشی صاحب آپ کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر بے اختیار آبدیدہ ہوگئے۔

آپ دیگر رفقاء کے ساتھ ہر کام میں شرکت فرماتے اور معمولی کام کرنے میں بھی قطعاً تأمل کا اظہار نہ فرماتے چنانچہ ایک مرتبہ جب مردان میں قیام تھا تو دیکھا کہ مسجد کے قریب کی جگہ ہاتھی باندھنے کے سبب گندی ہوگئی ہے تو سید صاحبؒ نے کدال لیا اور امام صاحبؒ نے ٹوکری اٹھائی اور تھوڑی دیر میں ساری جگہ صاف کر دی۔

حق گوئی وبے باکی

آپ کی حق گوئی وبے باکی بھی مشہور تھی۔ سید صاحبؒ کا آپ اس قدر ادب و احترام کرتے تھے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے لیکن اس کے باوجود سید صاحبؒ نے جب تالیفِ قلوب کی غرض سے حسن زئی قبیلے کی معافیِ عشر کی درخواست کو قبول فرمالیا اور آپ کو علم ہوا تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ :-

"عشر بھی خمس وزکواۃ کی طرح شرعی حقوق میں سے ہے اور اس کی معافی کا امام کو بھی اختیار نہیں بلکہ امام بھی اگر زراعت پیشہ ہو تو اسے بھی عشر دینا پڑے گا"[۹]

امب پر جب جنگ کے خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے تو سید صاحبؒ نے امام صاحبؒ

کو لکھا کہ مستورات کو قلعہ سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔ امام صاحبؒ اسے خلافِ مصلحت سمجھتے تھے سید صاحبؒ نے دوبارہ لکھا تو آپ نے جواب میں تحریر فرما دیا کہ اگر آپ کے اس حکم پر عمل پیرا ہونے سے شوکتِ اسلام کو نقصان پہنچا تو خدا کے نزدیک اس کی جوابدہی آپ کے ذمہ ہوگی۔ اکبر شاہ کے دربار میں آپ نے جو وعظ فرمایا تھا وہ بھی آپ کی حق گوئی و بے باکی پر ایک شاہدِ عدل کی حیثیت رکھتا ہے۔

زہد و تقویٰ

آپ کا زہد و تقویٰ اور تہجد گزاری و شب زندہ داری ضرب المثل ہے۔ اس سلسلہ میں وہ روایت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو جناب امیر خاں صاحبؒ نے مولانا عبدالقیومؒ (داماد مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ) سے نقل کی ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ تحصیل سکندر آباد ضلع بلند شہر میں امام صاحبؒ کے خاندان کی کچھ اراضی تھی آپ تحصیل کے لیے وہاں جایا کرتے تھے اور راستہ میں غازی آباد کی ایک بھٹیاری کے پاس رہا کرتے تھے ایک دفعہ تحصیل کے موقع پر آپ بیمار ہوگئے اور اپنی جگہ شاہ موسیٰ بن حضرت شاہ رفیع الدینؒ کو تمام تفصیلات اور غازی آباد کی بھٹیاری کے پتہ سے مطلع کر کے بھیج دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ بھٹیاری سے کہہ دینا کہ میں اسمٰعیل کا بڑا بھائی ہوں۔ شاہ موسیٰ جب غازی آباد میں بھٹیاری کے پاس پہنچے تو اس نے رات کو چارپائی کے نیچے پانی کے دو لوٹے، ایک چٹائی اور جانماز رکھ دی۔ شاہ صاحبؒ نے کہا اس سامان کی کیا ضرورت ہے؟ عشا کی نماز مسجد میں پڑھ آیا ہوں، صبح کی نماز پھر وہاں پڑھ لوں گا۔ بھٹیاری نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا اور کہا کہ "میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم اسمٰعیل کے بھائی نہیں ہو اور اب تو یقین ہو گیا۔ مولوی اسمٰعیل بھی نماز مسجد میں ہی پڑھا کرتے تھے مگر وہ رات کو تھوڑی دیر سو کر اٹھ بیٹھتے اور وضو کر کے صبح تک نفلوں میں قرآن مجید پڑھتے رہتے تھے، تم کہتے ہو مجھے پانی کی ضرورت نہیں، میں تو سمجھتی تھی کہ تم بڑے بھائی ہو اور عابد بھی ان سے زیادہ ہو گے مگر تم کچھ بھی نہ نکلے۔" شاہ موسیٰ کہتے تھے کہ میں بھٹیاری کی یہ بات سن کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور کوئی جواب بن نہ آیا۔ قارئین کرام غور فرمائیں کہ ہماری حالت بھی تو یہی ہے ؎

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

رفقاء کا احساس

آپ کو اپنے رفقاء و احباب کا حد درجہ احساس تھا اور ان کے ادائے حقوق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے جو کہ منشی صاحب کے نام سے معروف تھے آپ کو وعظ کے لیے مدعو کیا۔ آپ کے اس وعظ میں روایتی جوش و خروش نہ تھا بلکہ لہجہ نہایت کمزور تھا منشی صاحب نے امام صاحبؒ کے خصوصی جان نثار مولوی رستم خاں بریلوی سے لہجہ کی نرمی کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ آپ پر تین وقت سے فاقہ ہے منشی صاحب یہ سن کر اٹھے اور امام صاحبؒ سے کہا کہ آپ ذرا وعظ موقوف فرما دیجئے، وعظ موقوف ہوا تو وہ آپ کو ایک الگ مکان میں لے گئے اور وہاں آپ کے سامنے کھانا رکھا۔ آپ مسکرائے اور فرمایا: "منشی جی! تم سے کسی نے کہہ دیا ہے کہ میں کھانا نہ کھاؤں گا" انہوں نے پوچھا "حضرت کیوں؟" آپ نے فرمایا: "کہ میرے ساتھیوں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے اور میں ان سے الگ کھانا نہیں کھا سکتا۔" انہوں نے ساتھیوں کو بھی بلایا اور سب کو کھانا کھلایا اور کئی وقت تک دعوت کی۔[1]

سید صاحبؒ نے آپ کو سواری کے لیے ایک گھوڑا دے رکھا تھا، لیکن آپ کبھی اس پر سوار نہ ہوئے بلکہ اپنے احباب و رفقاء میں سے کسی ایک کو سوار کرا دیتے، خود پیدل چلتے اور فرماتے کہ یہ خدائی کام ہے، جتنی زیادہ مشقت اٹھائیں گے، اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔ اللہ اللہ یہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ کی کس قدر سچی اور عملی تفسیر ہے یہاں ان بزرگوں کو بھی غور فرمانا چاہیے جو آپ پر ہوس ملک گیری کا بہتان لگایا کرتے ہیں۔

شجاعت

علم و فضل اور زہد و اتقاء کے ساتھ ساتھ آپ کی شجاعتوں اور دلیرانہ کارناموں کے چرچے بھی چار دانگ عالم میں پھیل چکے تھے ایک مرتبہ ایک درانی سپاہی کسی عورت سے مال چھیننا چاہتا تھا۔ اس عورت نے امام صاحبؒ کا نام لیا تو سپاہی دم دبا کر بھاگ گیا۔ جنگ مایار کے موقع پر جب سید صاحبؒ نے خط لکھ کر آپ کو امب سے طلب فرمایا تو منشی محمدی انصاری نے اس مکتوب کے آخر میں اپنی طرف سے لکھ دیا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجئے اس لیے کہ آپ کی شجاعت اس علاقے کے

خاص و عام پر روشن ہے، کیا عجب ہے دشمن آپ کا نام سُن کر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ جذبہ جہاد آپ میں اس قدر موجزن تھا کہ بقول نواب وزیرالدولہ مرحوم :۔

مولانا جلیل و سعید حضرت محمد اسمٰعیل شہید قدس اللہ اسرارہ الحمید .... در اوقاتِ صعوبت امراض کہ تا دو روز از رنج و درد بخوابِ راحت نمی شدند و طاقت نشست و برخاست نمی داشتند ہمیں کہ امر امام عالی مقام بناء بر انصرام مہام و بازار جہاد انتظام صادر میگردید جناب مولانائے فخام بے تامل و درنگ با سلحۂ جنگ چوں شیرِ دمان و برق درخشان در درستی امور مومناں می شتافتند ۱۲

بعض اوقات بیماری کی تکلیف میں دو دو دن سو نہ سکتے، یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بھی نہ رہتی، تاہم سید صاحبؒ کی طرف سے جب کسی جنگی مہم کے انتظام کا حکم پہنچ جاتا تو بے توقف ہتھیار سنبھال کر شیرِ دمان اور برقِ تپاں کی طرح مسلمانوں کے امور کی درستی میں مصروف ہو جاتے۔

آپ تحریکِ جہاد میں اوّل سے آخر تک رُوحِ رواں رہے۔ ہر نازک سے نازک گھڑی میں بھی آپ نے سبقت کا مظاہرہ فرمایا۔ گولہ و بارود کی موسلا دھار بارش میں بھی اس قدر بے تکلفی سے چلے جاتے کہ دوسرے لوگ پھولوں کی بارش میں بھی اس طرح جانا پسند نہ کریں اس لیے سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کی شجاعت و بسالت اور بہادری و جوانمردی ہر طرح کی مدح و ستائش سے بلند و بالا ہے۔

اسوۂ صحابہؓ

مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ نے لکھا ہے کہ :۔

" جب بہت سے ولائتی مولوی بڑی بڑی پگڑیاں اور جبّے پہن کر مولوی محمد اسمٰعیل صاحبؒ کی ملاقات کے واسطے لشکرِ مجاہدین میں آئے تو اس وقت مولانا شہیدؒ چکی سے اپنے گھوڑے کا دانہ دل رہے تھے وہ سارے ولائتی مولوی یہ حال دیکھ کر بے اختیار رو پڑے اور کہنے لگے

کہ ٹھیک صحابہؓ کی چال پر یہی شخص ہے اور ہم دنیا کے کہتے ہیں [۱۳]

مولانا محمد یوسف بنوری نے بھی لکھا ہے کہ :-

فالشیخ اسمٰعیل الشہیدؒ من ذالک الجیل او من ذالک الرعیل الذی یشبہ تماما باولئک الصحابۃ الذین کانوا اولی نفوس قدسیۃ و ارواح ذکیۃ وقلوب تقیۃ [۱۴]

شیخ اسمٰعیل شہیدؒ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں نفوسِ قدسیہ، ارواحِ زکیہ اور قلوب تقیہ کے مالک حضرات صحابہ کرامؓ سے مکمل طور پر مشابہت حاصل ہے۔

مردم شناسی

امام صاحب حد درجہ مردم شناس بھی تھے چنانچہ جنگِ زیدہ کے بعد جب ایک رسالدار مقرر کر دینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سید احمد علی بریلوی نے حمزہ علی خاں لوہاری والے کا نام پیش کیا لیکن امام صاحب نے ان سے اختلاف کیا اور عبدالحمید خاں کو اس عہدے کے لیے مناسب قرار دیا عبدالحمید خاں چونکہ فنونِ سپہ گری میں بڑے ہوشیار، تجربہ کار اور بہادر تھے اس لیے ارباب بہرام خاںؒ اور خود سید احمدؒ نے بھی آپ سے اتفاق کیا اور عبدالحمید خاں کو ہی رسالدار مقرر کر دیا گیا۔

اسی طرح آپ نے ایک موقع پر فرمایا کہ دشمن سے رزم و پیکار کیلیے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں بعض صاحب تدبیر ہوتے ہیں بعض شجاع و دلاور بعض دونوں خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں یعنی مدبر بھی اور شجاع بھی محض باتدبیر لوگ ہمیں اس مقام پر کام نہیں دے سکتے اسلیے کہ یہ مقام شجاعت کا ہے نہ کہ تدبیر کا آپ کے فرمانے کا مقصد یہ تھا کہ ساز و سامان اور رفیقوں کی قلت کے باعث مجاہدین کو شجاعت و مردانگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے الغرض امام صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی اور دور اندیشی جیسی خوبیوں سے بھی نوازا تھا۔

حقانی ربانی بزرگ

آپ حقانی ربانی، ذی فراست و صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگرچہ بظاہر اساتذہ کرام سے کسبِ فیض کیا ہے لیکن میرا اصلی علمی سرمایہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میرے دل میں ڈال دیا ہے۔ دیگر علوم وفنون کے ساتھ ساتھ فہم قرآن و حدیث سے بہرہ وافر رکھتے

تھے۔ نماز میں خشوع و خضوع اور آداب کا خصوصی خیال رکھتے تھے سید جعفر علی نقویؒ کا بیان قبل ازیں ذکر کر آئے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی اقتدا میں دو رکعت نماز ادا کی تو اتنی لذت نصیب ہوئی کہ کبھی کسی امام کے پیچھے نصیب نہ ہو سکی۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ نماز میں غفلت نہیں ہوتی، اگر ہو بھی جائے تو جلد علم ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کے اصرار پر گومتی کے پُل پر ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں عصر سے مغرب تک مکمل قرآن مجید سنا دیا تھا۔ یہ آپ کی ایک واضح کرامت تھی۔

برجستگی

آپ اس قدر برجستہ جواب تھے کہ سامعین حیرت و استعجاب میں ڈوبے جاتے۔ ایک مرتبہ "محمد کالے" نامی ایک شخص نے عرض کیا کہ میرے نام کا سجع کہہ دیجئے۔ آپ نے بے تکلف فرمایا ؏

"ہر دم نام محمد کا لے"

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ یہ ناممکن ہے جانور میرے سامنے آئے اور پھر زندہ نکل جائے۔ ایک ساتھی نے ہنس کر فرمایا "اگر اس کی موت ہی نہ آئی ہو تو آپ کیوں کر اسے مار سکتے ہیں؟"

آپ نے جواب میں فرمایا "جب اس کی موت نہ آئی ہو گی تو میرے سامنے آنے ہی کا نہیں"۔ یہ آپ کی برجستہ جوابی کی ایک بہترین مثال ہے دوسری طرف اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نشانہ لگانے میں آپ کو بے مثال مہارت حاصل تھی۔

باب نہم

گلہائے رنگ رنگ

امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی پیغمبرانہ دعوتِ توحید سے جب کلکتہ سے پشاور اور شمالی ہند سے جنوبی ہند کے ایوانہائے شرک و بدعت میں تزلزل پیدا ہو گیا تو ان ایوان سے وابستہ اصحاب جبّہ و دستار کی زبانیں کترنی کی طرح چلنے لگیں، قلم بے لگام ہو گئے اور امام صاحبؒ کے خلاف انہوں نے وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا جس کی ایک ادنیٰ سی جھلک گزشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ؟

فی تعب من یحسد الشمس نورھا   ویجھد ان یأتی لھا بضریب

یا یہ کہ انہوں نے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ فرما لیا، امام صاحبؒ کی شخصیت

پر اس کا کوئی اثر پڑا اور نہ توحید کا وہ چراغ ان پھونکوں سے بجھ سکا جسے آپ نے اپنے مقدّس خون سے جلا بخشی تھی؛ چنانچہ آج برِ صغیر پاک و ہند میں کروڑوں فرزندانِ توحید ہیں جو آپ کے جلائے ہوئے چراغ سے کسبِ ضو کر رہے ہیں ان سطور میں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ آپ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں صرف آپ کے مخالفین ہی نظر نہیں آتے بلکہ تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ آپ کے زمانہ سے لے کر آج تک ایسے اصحاب کی کمی بھی نہیں رہی جنھوں نے آپ کے حضور علم و فضل، زہد و اتقاء، مجاہدانہ کارناموں اور سیرت و کردار کے دیگر حسین گوشوں کے باعث بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا ہے؛ چنانچہ ذیل میں چند اساطینِ علم و فضل کے ارشادات نقل کیے جاتے ہیں۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ کے گرامی قدر صاحبزادے سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ اپنے اس قابلِ فخر برادر زادے اور قابلِ رشک نواسے امام محمد اسحٰقؒ کی دینی خدمات پر اظہارِ مسرت فرماتے ہوئے نہایت والہانہ انداز میں پڑھا کرتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ

شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں سمٰعیل اور سحٰق جیسے بیٹے دیئے۔

یاد رہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام ایسے عظیم الشان صاحبزادے عنایت فرمائے تو انہوں نے ان الفاظ میں تحدیثِ نعمت کا اظہار فرمایا تھا۔

اسی مضمون کو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ و شاہ محمد اسحٰقؒ کی بابرکت مجلسوں کے فیض یافتہ، پچھتر سال تک درسِ حدیث کی مسند پر جلوہ افروز رہنے والے، اپنے دور کے جلیل القدر محدّث شیخ الکل حضرت میاں سیّد نذیر حسین محدّث دہلویؒ ان الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے ؎

برائے رہبریِ قومِ فسّاق
دوبارہ آمد اسمٰعیلؒ و اسحاقؒ

مولانا فضل حق خیر آبادیؒ اگرچہ آپ کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے، لیکن ان کے پاس حلقۂ درس میں جب آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو ان پر سناٹے کا عالم طاری ہو گیا، کتاب

بند کر دی اور کئی گھنٹے خاموش بیٹھے روتے رہے اور پھر فرمانے لگے :۔

"اسمٰعیل کو ہم (صرف) مولوی نہیں جانتے تھے بلکہ وہ اُمّتِ محمدیہ کا حکیم تھا کوئی شئے نہ تھی جس کی کیفیت اور لمیّت اس کے ذہن میں نہ ہو امام رازیؒ نے اگر حاصل کیا تو دُودِ چراغ کھا کر اور اسمٰعیل نے محض اپنی قابلیّت اور استعدادِ خداداد سے"[2]

صدر الصدور مولوی عبدالقادر خاں رامپوری (متوفی ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء) نے اپنے احوال و واقعات پر مشتمل "وقائع عبدالقادر خانی" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے، اس میں بسلسلہ واقعات ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء لکھتے ہیں :۔

"دہلی میں مولوی محمد اسمٰعیل خلف مولوی عبدالغنی خلف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جو حُسن بیان، قوّتِ استنباط اور تیزیٔ ذہن میں اس زمانہ میں اپنے دادا اور چچاؤں کی یادگار تھے۔ مخلوق کو ان بدعات سے روکنے پر جو مستحبات بلکہ واجبات میں مخلوط ہوگئی ہیں ہمّت باندھ رکھّی تھی جمعہ کے دن جامع مسجد میں اور دوسرے دنوں میں اس قسم کے مجمعوں میں بیان کرتے تھے عوام ان کے وعظ و پند سے بہت نفع اٹھاتے تھے"[3]

مولانا محمد یعقوبؒ خلف الرشید مولانا مملوک علیؒ نے لکھا ہے کہ :۔

"احقر مولوی اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کو اور اس کے خاندان کے علماء کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے اور بے تعصّب ان کی باتیں موافق قرآن و حدیث کے پاتا ہے اور ان کے مخالفین کو حق سے سرگرداں اور ہٹ دھرمیاں کرتے دیکھتا ہے"[4]

سرسیّد احمد خاںؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آثار الصنادید" میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

محی السنۃ قامع البدعۃ مولانا مولوی اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ

علم برکش اے آفتاب بلند | خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ | بخند اے لب برق چوں صبح گاہ
بہار اے ہوا قطرۂ ناب را | بگیر اے صدف ور کن ایں آب را
برآ اے دُر از قعر دریائے خویش | بتاج سر شاہ کن جائے خویش

یعنی شاہ کشور شریعت گستری ملک الملوک دیار دیں پروری قامع بنیان شرک طغیان حاوی موجبات علم و ایقان مؤسس اساس کمال مہذب اوضاع حال وقال سالک مسالک ہدایت و ارشاد مجلی آئینہ صافی اعتقاد مرکز دائرہ علوم منطقہ آسمان فہوم مرتقی مدارج درجات عالی پیشوائے ادانی و اعالی مرجع مآب فضائل کامرانی طبائع افاضل رموز فہم سرائر تفسیر قرآنی دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی جامع کمالات صوری و معنوی نکتہ سنج کلام الٰہی و حدیث نبوی قدوہ اہالی پیشگاہ قبول جلال غوامض معقول و منقول بانی مبانی فضل و افضال ممہد قواعد تکمیل و اکمال جامد حق و یقین مثبت دلائل دیں مولای مخدومی مخدوم الانامی مولوی محمد اسمٰعیل قدس سرہٗ الخ"

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد آپ کی خصوصیت کبریٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں رقمطراز ہیں :-

"...... دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے، اب اس سلطان و اسکندر عزم کی بدولت شاہجہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ اب برسر بازار کہی جا رہی اور ہو رہی تھیں اور خونِ شہادت کے چھینٹے حروف و حکایات کو نقوش و سواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔"

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم | حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

...... بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی، سب دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا، لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا؟ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چسپت آیا ونیا اس کے لیے خلعتِ عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدوار کیے بعد دیگرے گزرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔ ؎

بارِ غم او عرض بہر کس کہ نمودم
عاجز شدو ایں قرعہ بنامم زسر افتاد"

مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں :-

"ملک وملت کا وہ سرفروش مجاہد جس کا عمل فلسفۂ ولی اللہ کی تفسیر تھا اور جس کا ایثار قربانی ذبیح اللہ کی زندہ تصویر۔ جس کا دل دولتِ درد سے مالا مال تھا اور جس کا جگر سوزِ محبت کا سرمایہ دار جس کا علم ہمدوشِ عمل اور جس کا عمل آئینہ دارِ علم بے پایاں۔ آزادیٔ فکر کا سب سے بڑا حامی جمہوریت کا علمبردار، ملوکیت کا سب سے بڑا دشمن، شاہ پرستی کے لیے فرشتۂ موت، سرمایہ داری سے بیزار، غلامی کے ناپاک تصور سے ناآشنا، اس کی زندگی سعی پیہم تھی۔ کتابِ زندگی کا آغاز بابِ جہاد سے ہوا اور اسی جہاد پر زندگی کا آخری ورق پلٹا گیا"

مولانا غلام رسول مہرؔ فرماتے ہیں کہ ایک نیازمند نے لکھا ہے کہ :-

"ایسا عالم باعمل، فاضل بے بدل، صاحبِ اخلاق، شہرۂ آفاق، المعی زماں، لوذعی دوراں، واقفِ علوم معقول ومنقول، کاشفِ دقائق فروع واصول، رافع اعلام توحید وسنت، قامع بنیانِ شرک وبدعت، قوتِ کردار، شجاعت وایثار اس وقت میں ہم نے کہیں نہ سنا دیکھنا تو کجا ہے"

شیخ محمد بن یحییٰؒ نے اگرچہ مولانا فضلِ حق خیر آبادیؒ سے تلمذ کے باعث "تقویۃ الایمان" پر اعتراض بھی کیا ہے تاہم امام صاحبؒ کے متعلق ان کے یہ الفاظ پڑھنے کے قابل ہیں جو کہ انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تذکرہ کے ضمن میں لکھے ہیں۔

"ابن اخیہ اسمٰعیل بن مولوی عبدالغنی کان من اذکی الناس بایامہ وکان اشدھم فی دین اللہ و احفظھم للسنۃ یغضب لھا ویذب الیھا ویشنع علی البدع واھلھا"

حضرت علامہ عبدالحی بن فخر الدین حسنیؒ رقمطراز ہیں:-

"الشیخ العالم الکبیر العلامۃ المجاھد فی سبیل اللہ اسمٰعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی احد افراد الدنیا فی الذکاء والفطنۃ و الشھامۃ وقوۃ النفس والصلابۃ فی الدین . . . . وکان نادرۃ من نوادر الزمان و بدیعۃ من بدائعہ الحسان مقبلاً علی اللہ بقلبہ وقالبہ" الخ

حضرت والاجاہ نواب سید صدیق حسنؒ فرماتے ہیں۔

"محمد اسمٰعیل بن الشیخ عبدالغنی العمری بن مستند الوقت الشاہ ولی اللہ المحدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ یکے از ائمہ دین وفقہائے متقنین ونبلائے محدثین . . . . جوہر ذکاوتِ او بغایت عالی افتادہ بود ومقدمات عویصہ ومشکلات علوم را زود تر ادراک میکرد وبلغز سخن میرسید حکایات ذہانت وفطانت وے ہنوز نقل ہر مجلس وزیب ہر مجلس وزیب ہر محفل اہل علم است الیٰ" الخ

علامہ رحمان علیؒ نے بھی لکھا ہے:-

"مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی بن مولوی عبدالغنی بن مولانا شاہ ولی اللہ

در دیانت ورسائیِ فکر یگانہ روزگار و مشارالیہ علمار کبار بود۔ الخ[۱۲]"

اختصار کے پیشِ نظر علمار و فضلا کے اردو، عربی اور فارسی ہر سہ زبانوں میں فرمائے ہوئے "مشتے نمونہ از خروارے" ان چند ارشادات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ محبت، عقیدت اور احترام کے اگر ان تمام پھولوں کو یکجا کیا جائے جو اربابِ علم و فضل نے حضرت امام صاحبؒ پر نچھاور کیے ہیں تو گلہائے رنگ رنگ کا ایک چمن زار کھل جائے۔ ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

باب (۱)

حواشی و تعلیقات

۱۔ رہتک دہلی سے تیس میل کے فاصلہ پر ہانسی اور دہلی کے درمیان ایک قدیم شہر ہے جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ دُور دُور تک پھیل گیا اور ہندوستان میں بھی توحید کا غلغلہ بلند ہوا تو بہت سے اشرافِ عرب نے اس شہر میں آ کر سکونت اختیار کر لی یہ عجیب اتفاق ہے کہ برصغیر پاک وہند کی تین عظیم اور نامور شخصیتوں یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اسلاف نے بھی سب سے پہلے رہتک ہی کو اپنا مسکن بنایا۔

۲۔ الامداد فی مآثر الاجداد

۳۔ حیات ولی ص ۷ ۔ ۸ مطبوعہ افضل المطابع دہلی۔

۴۔ حیات ولی ص ۲۸ ۔ ۲۹

۵۔ یعنی وہ لڑائیاں جو ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء میں شاہجہان کی اچانک بیماری پر تخت نشینی کے لیے شہزادوں میں ہوئی تھیں۔ اورنگ زیب چونکہ ایک تجربہ کار سالار، پختہ کار سیاستدان اور قابل منتظم تھا اس لیے اس نے اپنی فطری صلاحیتوں سے تمام حریفوں پر قابو پا لیا تھا۔

۶۔ شاہ شجاع شاہجہان کا بیٹا اور اورنگ زیب کا بھائی تھا۔ وہ بڑا زیرک، سیر چشم اور حوصلہ مند تھا اور ساتھ ہی حد سے زیادہ علیش کوش تھا اس کا بیشتر وقت حرم سرا میں شاہد و شراب کی نذر ہو جاتا تھا۔

۷۔ مرزا محمد زاہد ہروی، قاضی اسلم کے فرزند ہیں آپ نے تیرہ سال کی عمر میں سندِ فراغت حاصل کر لی تھی۔ بے نظیر جودتِ ذہن اور عدیم المثال فہم و فراست کے مالک تھے۔ آپ نے شرح مواقف، شرحِ تہذیب، رسالہ تصور و تصدیق، شرح تجرید اور ہیاکل وغیرہ کئی کتب پر حواشی لکھے ہیں۔

۸۔ حیات ولی ص ۱۲۱

۹۔ فرخ سیر شہزادہ عظیم الشان کا لڑکا تھا اس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کے بعد بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اس نے سادات بارہ کو اپنے ساتھ ملایا اور بہادر شاہ اوّل کے بڑے لڑکے جہاندار شاہ کو آگرہ کے قریب لڑائی میں شکست دی تو اس نے بھاگ کر دلی میں پناہ لی جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ تخت نشینی کے وقت فرخ سیر کی عمر ۳۱ سال تھی اس کا دورِ حکومت ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک ہے۔

۱۰۔ ان مشائخ کے حالات "حیاتِ ولی" میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱۔ ان مشائخ کے حالات بھی "حیاتِ ولی میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۲۔ شیر شاہ کا اصلی نام فرید خاں تھا اس کا قبیلہ "سور" غوری سلاطین کی ایک شاخ تھی بہلول لودھی کے عہد میں اس کا باپ اور دادا برصغیر پاک و ہند میں آئے اور انہیں پنجاب میں جاگیریں ملیں حصار فیروزہ میں فرید خاں کی ولادت ہوئی (تاریخ شیر شاہی) البتہ اس کے سن ولادت میں اختلاف ہے قانون گو نے ۱۴۸۶ء کو اس کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ شیر شاہ نے مختلف جنگوں میں ہمایوں کو شکست دے کر دسمبر ۱۵۳۹ء میں تاجِ شاہی اپنے سر پر رکھا اگرچہ اسے صرف ۵ سال حکومت کرنا نصیب ہوئی اور ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء میں اس کی وفات ہو گئی تاہم اس نے اس قلیل عرصہ میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو کہ تاریخ کے طالبِ علم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

۱۳۔ حیات طیبہ ص ۱۲

۱۴۔ تذکرہ ص ۲۴۳۔ ۲۴۴، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

۱۵۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۲

۱۶۔ آثار الصنادید ص ۲۴۹ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء

۱۷۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۸۔ ۲۶۹

۱۸۔ حیات ولی ص ۳۲۵

۱۹۔ حکایاتِ اولیاء۔ ص ۵۶

۲۰۔ حیات طیبہ ص ۱۸

۲۱۔ حکایاتِ اولیاء ص ۴۹

۲۲۔ حکایاتِ اولیاء ص ۵۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء

۲۳۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۸

۲۴۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ شاہ رفیع الدین کے حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیے نزہۃ الخواطر، حدائق الحنفیہ، الیانع الجنی، ابجد العلوم، تذکرہ علماء ہند، ملفوظات شاہ عبدالعزیز، علم و عمل، تراجم علماء حدیث ہند، حیاتِ ولی، آثار الصنادید اور لائیڈن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (طبع اوّل) میں ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کا مقالہ۔

۲۵۔ آثار الصنادید ص ۲۶۹

۲۶۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی ص ۵۸۹

۲۷۔ حکایاتِ اولیاءؒ ص ۶۶

۲۸۔ حکایاتِ اولیاءؒ ص ۵۹

۲۹۔ حکایاتِ اولیاء ص ۶۰۔ ۶۱

۳۰۔ حیاتِ ولی ص ۳۵۲

۳۱۔ حیاتِ ولی ص ۳۵۲

۳۲۔ }
۳۳۔ } حکایاتِ اولیاء ص ۱۵۹۔ ۱۶۲

۳۴۔ حیاتِ سید احمد شہید ص مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ

باب (۲)

۱۔ یعنی برصغیر پاک و ہند کے نامور عالم فاضل محقق مؤرخ ادیب اور نقاد مولانا غلام رسول مہر جو کہ چالیس پچاس کتابوں کے مصنف و مؤلف اور مترجم و شارح ہیں تحریکِ مجاہدین کے سلسلہ میں "سید احمد شہید" "جماعت مجاہدین" اور "سرگزشت مجاہدین" آپ کی عظیم الشان کتابیں ہیں۔ افسوس کہ ۱۶ ر نومبر ۱۹۷۱ء کو ہم اس گنجِ گراں مایہ سے بھی محروم ہو گئے۔

آدمی بچ کر کہاں جائے قضا کے قہر سے
آج وہ اٹھا ہے کل اٹھ جائیں گے ہم دہر سے
مہر کا جانا مقدر تھا مگر وہ کیا گیا!
وضعداری کا جنازہ اٹھ گیا اس شہر سے

۲۔ جماعت مجاہدین ص ۱۲۸

۳۔ جنہوں نے "تقویۃ الایمان" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۴۔ حیات طیبہ ص ۲۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء۔

۵۔ امیر شاہ خاں ؒ متوطن خورجہ مقیم منیڈھو ضلع علی گڑھ جنہوں نے باوجود علم رسمی تحصیل نہ کرنے کے بزرگوں کے فیضِ صحبت سے وہ درجہ حاصل کیا کہ آج اصطلاحی عالم بھی ان پر رشک کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر و ذہن اور حافظہ بھی اس قدر وافر عطا فرمایا تھا کہ وہ حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ صاحب سے لے کر اپنے زمانہ تک کے بزرگوں کے حالات و واقعات سند کے ساتھ نقل فرماتے ہیں۔ آپ کی بیان کردہ حکایات کے مجموعہ کا نام "امیر الروایات" ہے امیر الروایات اور مولانا محمد طیب دیوبندی کی روایات کا مجموعہ "روایات الطیب" اور مولانا اشرف علی کا رسالہ "اشرف التنبیہ" جس میں انہوں نے بعض حکایات کے نکات کی شرح کی ہے ایک ہی جلد میں چھاپ کر "ارواحِ ثلاثہ" کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں اور اسی کا نام "حکایاتِ اولیاء" بھی ہے اسی لیے حوالہ کے وقت ہم نے کہیں ارواحِ ثلاثہ اور کہیں حکایاتِ اولیاء درج کیا ہے۔

۶۔ حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڑھانوی ؒ۔ آپ کی ولادت ۱۲۳۱ھ میں ہوئی آپ نے بچپن میں ہی قرآنِ مجید حفظ اور حضرت سید احمد صاحب ؒ کی بیعت کر لی تھی آپ نے کتب صرف و نحو شیخ نصیر الدین شافعی دہلوی اور بعض دیگر درسی کتب مولانا نصیر الدین لکھنوی ؒ سے پڑھیں فرائض شیخ یعقوب بن افضل سے پڑھے جب کہ فقہ و حدیث کی تعلیم شیخ اسحٰق بن افضل سے حاصل کی اور اسی شیخ موصوف کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ حجازِ مقدس سے واپسی کے بعد سکندر بیگم کی دعوت پر بھوپال کے منصب افتاء پر فائز ہو گئے اور وہیں آپ کو جاگیر بھی ملی۔ علم و حلم، تواضع و انکساری، وعظ و ارشاد اور راست بازی میں اسلاف کے نقش قدم پر تھے ساری زندگی درسِ قرآن و حدیث میں مشغول رہے

اور بہت سے لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ اپنے وطن مالوف بڑھانہ میں عمر شریف کی ستر بہاریں دیکھنے کے بعد ۱۲۹۹ھ میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ نزہۃ الخواطر ص ۲۹۷-۲۹۸

۷۔ حکایاتِ اولیاء ص ۱۰۰

۸۔ مرزا حیرت نے یہاں حضرت شاہ عبدالغنیؒ کا اسمِ گرامی لکھا ہے جو کہ صحیح نہیں کیوں کہ یہ آپ کی عمر شریف کے بارھویں سال کا واقعہ ہے جب کہ حضرت شاہ عبدالغنیؒ دو سال قبل اللہ تعالےٰ کو پیارے ہو چکے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس میں پیش آیا تھا۔

۹۔ حیاتِ طیبہ ص ۴۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء

۱۰۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین ص ۴۱۷

۱۱۔ حضرت نواب والاجاہ السید ابو الطیب صدیق بن حسن بن علی بن لطف اللہ الحسینی البخاری القنوجی۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام شہید حسین بن علی رضی اللہ عنہما تک منتہی ہوتا ہے آپ کی ولادت باسعادت بروز اتوار مورخہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد بہت بڑے عالم وفاضل اور عابد و زاہد تھے۔ شاہ رفیع الدینؒ و شاہ عبدالعزیزؒ کے تلمیذ اور حضرت سید احمدؒ کے مرید تھے۔ آپ کی ولادت ونشأت قنوج میں ہوئی قرآن مجید اور فنون کی مختصرات اپنے شہر کے علماء سے ہی پڑھیں پھر سُوئے دہلی روانہ ہوئے اور وہاں بہت سے علماء کرام سے فنونِ عقلیہ ونقلیہ کی بہت سے کتابیں پڑھیں اور پھر علامہ مفتی صدر الدین خاں صاحبؒ سے بھی استفادہ کیا اور ان سے اجازت عامہ تامہ حاصل کی اور اپنے وطن قنوج تشریف لے آئے پھر طلبِ معاش کے لیے بھوپال روانہ ہوئے چند روز بعد ایک درخواست مدار المہام مولانا محمد جمال الدینؒ کی خدمت میں پیش کی تو ۳۰ روپے ماہانہ مشاہرہ پر ملازمت مل گئی مگر ایک سال بعد ہی معزول ہو کر قنوج تشریف لے آئے پھر رئیسہ بھوپال جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ نے فرمان طلبی بھیجا مگر موسم کی ناہمواری کے سبب دیر سے پہنچے اور حاسدین کو شکایت کا موقعہ مل گیا لہٰذا حکم منسوخ ہوگیا۔ بتاریخ یکم صفر ۱۲۷۶ھ پھر بھوپال پہنچے اور ۷۵ روپے ماہانہ مشاہرہ پر تاریخ نگاری ریاست کی خدمت تفویض ہوئی مولانا محمد جمال الدین کی صاحبزادی سے نکاح کیا اور والدہ محترمہ اور بہنوں کو بھی وہیں بلا لیا رئیسہ بھوپال انتقال کر گئیں تو ان کی صاحبزادی جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ سریر آرائے سلطنت ہوئیں جو بیوہ ہو چکی

تھیں بیگم صاحبہ نے حضرت کی قابلیت اور دیانت کو دیکھ کر شریکِ اُمورِ سلطنت بنانا پسند فرمایا اور پھر آپ سے نکاح کر لیا۔ آپ نے دین کی بہت خدمت سر انجام دی ہے آپ نے بھوپال میں علم و ادب کی محفل سجائی اور دور و نزدیک کے بے شمار علماءِ کرام اس ماہتابِ علم کا ہالہ بن گئے آپ نے بہت سے مدارس کی بھی تأسیس کی اس طرح علم و فن کے اعتبار سے بھوپال کی قسمت بیدار ہوگئی آپ نے تفسیر میں "فتح البیان فی مقاصد القرآن" دس جلدوں میں، ایک تفسیر اردو میں "ترجمان القرآن" ۱۵ جلدوں میں اصولِ تفسیر میں "الاکسیر" حدیث میں "بلوغ المرام" کی تین شرحیں نیز صحیح بخاری و مسلم" کی شرحیں رجال حدیث میں "اتحاف النبلاء" فوائدِ صحاحِ ستہ میں "الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ" غرض کہ تفسیر میں ۹ اور فنِ حدیث میں ۱۳ عظیم الشان کتابیں تصنیف فرمائیں ویسے مختلف علوم و فنون میں آپ کی کل تصنیفات کی تعداد ۲۲۳ ہے اور پھر لطف یہ کہ آپ نے یہ تمام کی تمام ہزار ہا کی تعداد میں زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے مفت تقسیم فرمائیں نیز آپ نے زرِ کثیر خرچ کر کے "فتح الباری" "تفسیر ابنِ کثیر" اور "نیل الاوطار" وغیرہ کو بھی شائع کر کے مفت تقسیم فرمایا۔ آخر کار علم و فضل کا یہ آفتاب جہاں تاب شبِ جمعرات ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ موافق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو ۵۹ سال اور تین ماہ کی عمر میں افقِ بھوپال پر غروب ہوگیا نور اللہ مرقدہٗ و برد مضجعہٗ۔ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیے، "مآثر صدیقی" "ابقاء المنن بالقاء المحن"، "رحلۃ الصدیق الی البیت العتیق"، "ابجد العلوم"، "التاج المکلل" ص ۵۴۱ - ۵۵۰ - تراجم علماء حدیث ہند" ص ۲۳۶ - ۲۶۱ راقم الحروف حضرت والا جاہ نواب صاحب مرحوم کے مفصل سوانح حیات لکھنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے وبیدہ التوفیق۔

۱۲۔ اتحاف النبلاء ص ۴۱۶

۱۳۔ سر سید احمد خاں دلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے آپ کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی اور آپ نے درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ والد کی وفات (۱۸۳۶ء) کے بعد تلاشِ روزگار ہوئی اور کمپنی کی ملازمت میں صدر امین بن گئے پھر ۱۸۴۱ء میں دہلی کی منصفی پر مامور ہوئے اور نو سال تک دہلی میں مقیم رہے یہیں انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آثار الصنادید" مکمل کی۔ اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا جس کی بناء پر سر سید کو ۱۸۶۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا اعزازی رکن بنایا گیا جب ۱۸۵۷ء

میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو سرسید بجنور کے منصف تھے ۱۸۵۷ء میں ان کو مراد آباد میں متعین کر دیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں غازی پور تبادلہ ہو گیا اور یہاں انہوں نے انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنے کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی جو بعد میں سائنٹیفک سوسائٹی آف علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوئی پھر ان کا تبادلہ علی گڑھ اور وہاں سے بنارس ہو گیا اس اثناء میں ان کے لڑکے محمود کو حکومت کی طرف سے غیر ملکی تعلیم کے لیے وظیفہ مل گیا۔ سرسید نے بھی اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور ۱۸۶۹ء میں اپنے لڑکے کے ساتھ خود بھی انگلستان چلے گئے محمود نے کیمبرج میں تعلیم حاصل کی اور سرسید نے برطانوی سوسائٹی اور برطانوی یونیورسٹیوں کے نظام کا بغور مطالعہ کیا نیز انہوں نے سر ولیم میور کی کتاب " لائف آف دی محمد" کے جواب میں مضامین لکھے جو کہ "خطباتِ احمدیہ" کے نام سے شائع ہوئے ہیں ۱۸۷۰ء میں وطن واپس پہنچ کر بنارس میں ملازمت کے فرائض سنبھال لیے اور ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجراء کیا ۱۸۷۲ء میں انہوں نے "محمڈن کالج فنڈ کمیٹی" قائم کی ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کے مقام پر سکول کی جماعتوں کا افتتاح ہوا چند سال بعد سکول کالج بن گیا اور مولوی سمیع اللہ خاں اس کے مہتمم تھے ۱۸۷۶ء میں سرسید نے ملازمت سے ریٹائر ہو کر اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سرسید جب دہلی سے نکلے تو عقیدۂ اہلِ حدیث پر تھے چوں کہ انہوں نے حدیث جناب شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ سے پڑھی تھی اس لیے کبھی وضع الیدین علی الصدر اور آمین بالجہر ترک نہ کی۔ مولانا شبلیؒ نے اپنے خطوط میں اپنے بعض احباب و رفقاء کو لکھا تھا:۔

"مغرب کی نماز! سبحان اللہ! کیا شان و شوکت ہوتی ہے کہ بس دل بیٹھا پڑتا ہے خود سید صاحبؒ بھی شریکِ نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں آمین زور سے کہتے ہیں ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے" (مکاتیب شبلی حصہ اوّل ص ۴۶)

مگر بقول مولانا ابو یحیٰی امام خاں نوشہرویؒ۔ افسوس ہے کہ ہمارے عقائد کی سادگی سرسید کے بعض شذوذ کی وجہ سے مرحوم کو اپنے ساتھ رکھنے سے آخر معذور ہو گئی یا اَسَفیٰ عَلیٰ یُوسُفَ! ۱۸۹۸ء میں اکیاسی سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی اور علی گڑھ کالج کی مسجد میں

دفن کیے گئے۔

۱۴۔ آثار الصنادید ص ۲۷۲

۱۵۔ سعادت یار خاں رنگینؔ سرہند میں ۱۱۶۹ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے آکر چند دن لاہور میں حسین الملک میر منوّر خاں کی سرکار میں ملازم رہے اس کے بعد دلّی آئے جہاں پیش گاہِ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکوم الدولہ اعتضاد جنگ بہادر عنایت ہوا۔ رنگینؔ نے شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ بہت اچھے شہسوار اور فنونِ سپہ گری سے خوب واقف تھے دکن میں نظام حیدر آباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے۔ بعد میں نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے انشاء کے بڑے دوست تھے اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے میرؔ سے بھی اصلاح لینا چاہی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ تو پھر انہوں نے محمد امان نثارؔ کو کلام دکھانا شروع کر دیا بقول جرمن مستشرق بلوم ہارٹ مصحفیؔ سے بھی اصلاح لیتے تھے، امیر، حسین، عیش و عشرت کے دلدادہ، خلیق، متواضع اور مہذب آدمی تھے ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیق کے مطابق ۸۰ برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں انتقال کیا جب کہ شیفتہ اور گارسن ڈیتاسی ان کی عمر ۸۱ برس اور سنِ وفات ۱۲۵۰ھ بتاتے ہیں ان کی تصنیفات یہ ہیں

(۱) مثنوی دلپذیر (۲) ایجادِ رنگین (۳) دیوانِ ریختہ (۴) دیوانِ بیختہ (۵) دیوانِ انگیختہ (۶) دیوانِ آمیختہ (ان چار دیوانوں کے مجموعہ کا نام چار عنصر رنگین ہے) (۷) مثنوی مظہر العجائب (۸) مجالسِ رنگین (۹) فرس نامہ، تاریخ ادب اردو ص ۲۰۲-۲۰۴

۱۶۔ جماعتِ مجاہدین ص ۱۲۱

۱۷۔ حیات سید احمد شہید ص ۳۰۳

۱۸۔ مولانا رشید الدین خاں صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے اور اپنی ذکاوت و استعدادِ کامل کے پیشِ نظر رشید المتکلمین کے نام سے مشہور تھے۔ دہلی میں ولادت و نشاُت ہوئی آپ نے شاہ عبدالعزیزؒ کے علاوہ مفتی علی کبیر بنارسیؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ سے بھی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے "الشوکۃ العمریۃ"۔ "الصولۃ الغضنفریۃ" ایضاح لطافۃ المقال، تفضیل الاصحاب اور اعانۃ الموحدین و

اھانۃ الملحدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۲۴۳ھ میں فوت ہوئے

۱۹۔ حکایاتِ اولیاء ص ۱۰۹۔ ۱۱۰

۲۰۔ آثار الصنادید ص ۲۷۲

۲۱۔ مولانا فضل حق خیر آبادی ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد کے علاوہ شیخ عبدالقادرؒ سے بھی پڑھا۔ چار ماہ میں قرآنِ مجید حفظ کیا۔ چار ہزار کے قریب اشعار کہے بہت بڑے ادیب اور منطقی و فلسفی تھے امکان و امتناعِ نظیر کے سلسلہ میں حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ سے آپ کا زبردست اختلاف تھا لیکن حضرت امام کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے انہوں نے رسالہ "یک روزی" آپ کے جواب میں ہی تحریر فرمایا تھا۔ آپ کی کتابوں میں سے "المجنس الغالی فی شرح الجوہر العالی"۔ الھدیۃ السعیدیۃ فی الحکمۃ الطبیعۃ، الروض المجود فی حقیقۃ الوجود، حاشیہ تلخیص الشفا، حاشیہ الافق المبین، حاشیہ شرح سلم، تحقیق العلم و المعلوم، تحقیق الاجسام، تحقیق الکلی الطبعی، رسالہ فی التشکیک وفی الماہیات، تاریخ فتنۃ الہند اور حضرت امام صاحبؒ کی تردید میں کچھ رسائل وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ میں جزائر سیلان میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

۲۲۔ الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۲

۲۳۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین ص ۴۱۷

۲۴۔ سید احمد شہید ص ۱۱۸

۲۵۔ جماعت مجاہدین ص ۱۲۲

۲۶۔ حکایاتِ اولیاء

۲۷۔ یعنی مغلیہ خاندان کا آخری فرمانروا بہادر شاہ ثانی (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) وہ اردو کا غزل گو شاعر تھا اور ظفر تخلص کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں نے اسے اپنا قائد بنایا مگر شومیٔ قسمت کہ تحریک ناکام رہی اور انگریزوں کو فتح ہوئی۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے شہزادوں کو گولی مار دی اور اسے معزول کر کے رنگون میں قید کر دیا۔ وہیں جلاوطنی کی حالت میں اس نے ۱۸۶۲ء میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

۲۸۔ شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ موضع بلتھوا ضلع مونگیر (بہار

یں ۱۲۲۰ھ بمطابق ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے ۱۶ سال کے بعد آپ نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور ۱۸۲۱ء میں وطنِ مالوف سے صادق پور روانہ ہو گئے اور وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں پھر ۱۸۲۹ء میں دہلی تشریف لے گئے اور پنجابی کٹڑے کی مسجد اورنگ آبادی میں قیام فرمایا اور مولانا عبدالخالق دہلویؒ، مولانا جلال الدین ہرویؒ، مولانا محمد بخشؒ، مولانا عبدالقادر رامپوریؒ، اخوند شیر محمد قندھاریؒ اور مولانا کرامت علی اسرائیلیؒ سے تعلیم حاصل کی اور پھر حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ سے حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی ہجرت کے بعد آپ نے دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں مستقل دارالعلوم کی بنیاد ڈال دی اور ساٹھ سال تک مسلسل تدریس کے فرائض سرانجام دیئے اور شیخ الکل کا لقب حاصل کیا۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ۱۲۸۰ھ میں انبالہ کے مشہور مقدمہ کی لپیٹ میں آپ بھی آ گئے تھے اور ایک سال تک راولپنڈی جیل میں سنتِ یوسفی ادا فرماتے رہے ۱۳۰۰ھ میں آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۲۲ جون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ "معیار الحق" آپ کی عظیم الشان علمی یادگار ہے ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں آپ نے انتقال فرمایا۔ غفر اللہ لہٗ۔ ملاحظہ فرمایئے "الحیاۃ بعد المماۃ" "تاریخ دہلی" ص ۹۲، "تراجم علماء حدیث ہند" ص ۱۳۶ - ۱۵۵ طبع جدید۔

۲۹۔ الحیات بعد المماۃ ص ۱۱۴

۳۰۔ حکایاتِ اولیاء ص ۱۶۷

۳۱۔ یعنی سیدنا حضرت امام شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے پیر و مرشد، مجاہد کبیر امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ بن حضرت سید محمد عرفانؒ۔

۳۲۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے برادرِ اکبر حضرت شاہ اہل اللہؒ کے پوتے تھے۔ حضرت سید صاحبؒ نے تمام انتظامی امور آپ کو سونپ رکھے تھے حافظِ قرآن بھی تھے قضاءِ حوائج بشریہ کے سوا ہر وقت قرآنِ حکیم کی تلاوت میں رطب اللسان رہتے تھے سفرِ جنگِ شیدو میں علیل پڑ گئے تو سید صاحبؒ نے گاؤں نیج بھیج دیا جو کہ اوحج اور بھانڈا کے درمیان تھا مرض شدت اختیار کرتا گیا اور وہ بالآخر اسی گاؤں میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قاضی احمد اللہ میرٹھیؒ نے تجہیز و تکفین کا سامان پیدا کیا، سید صاحبؒ نے جنازہ پڑھایا اور حضرت امام صاحبؒ سے

مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا " یوسف جی اس لشکرِ اسلام کے قطب تھے آج لشکر قطب سے محروم ہو گیا " آپ بڑے قانع ، زاہد، متوکل، مستقیم الحال اور مستقل مزاج تھے ملاحظہ فرمایئے وصایا الوزیر ج ۲ ص ۱۱۰ - ۱۶۲

۳۳ - حضرت مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بن نور اللہ بڑھانہ ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے آپ کی پھوپھی حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے نکاح میں تھیں اور ان کی ایک دخترِ نیک اختر آپ کے حبالۂ عقد میں تھیں تہجد گزار و شب زندہ دار بزرگ تھے علم وفضل کے اعتبار سے آپ کا پایہ بہت بلند تھا خصوصاً " فقہ حنفی میں تو آپ کو کمال عبور حاصل تھا۔ ۱۲۳۷ھ میں حضرت امام شوکانی بھی حج کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے اس موقع پر مولانا عبدالحی صاحب کو مولانا منصور الرحمٰن دہلوی کی معیت میں آپ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ امام شوکانی نے ان دونوں کو " اتحاف " کا ایک ایک نسخہ تحفتہً عنایت فرمایا۔ آپ کچھ عرصہ میرٹھ میں مفتیٔ عدالت بھی رہے ۔ سفر و حضر میں حضرت سید صاحب کی رفاقت میں رہتے تھے آپ ۸ رشعبان ۱۲۴۳ھ بمطابق ۲۴ر فروری ۱۸۲۸ء کو لعارضۂ بواسیر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سید صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی یہ جلیل القدر عالم دین اور عظیم المرتبت مجاہدِ اسلام نہر (سوات) کے قریب جنوب مشرق میں ایک قبرستان میں محو استراحت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے وصایا الوزیر ج ۲ ص ۱۰۷ - ۱۰۸، ابجد العلوم ص ۹۱۵-۹۱۶ الیانع الجنی ص ۷۶ ، سید احمد شہید ج ۱ ص ۱۱۶ - ۱۱۷ ، جماعت مجاہدین ص ۱۱۱ - ۱۱۸، تراجم علماء حدیث ہند طبع دوم ص ۱۳۲ - ۱۳۴ ، فتاوی عزیزی ج ۱ ص ۸۶ ، سوانح احمدی ص ۱۶ - ۱۹ ، آثار الصنادید ص ۲۷۰

۳۴ - مخزنِ احمدی ص ۲۴ - ۳۵ - اس کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے

۳۵ - حدیثِ جبرئیل میں ہے " ان تعبد اللہ کأنک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک " الحدیث رواہ مسلم۔ یعنی احسان یہ ہے کہ عبادت میں اس قدر حضورِ قلب اور خشوع وخضوع پیدا ہو جائے کہ عابد گویا خدا کو دیکھ رہا ہے اور یہ استغراق و محویت کا وہ آخری مقام ہے جو کسی عابد کو عبادت میں حاصل ہو سکتا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ خیال تو ضرور رہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں اگر یہ تصور بھی پیشِ نظر رہے تو عابد خوفِ خداوندی ملحوظ

خاطر رکھے گا۔ اس کی حرکات وسکنات خشیّتِ الٰہی کا مظہر ہوں گی، افعال واحوال سے خوفِ خدا ٹپک رہا ہوگا۔ اور وہ لرزاں و ترساں کیفیت میں ایک مؤدب غلام کی طرح حاضری کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کھڑا ہوگا۔

۳۶۔ خداوندا! مجھے معاف فرما دے، اور مجھ پر رحم کر، مجھے ہدایت دے، رزق عنایت فرما، میرے درجات بلند کر دے اور میرے نقصان کو پورا کر دے۔

۳۷۔ مخزنِ احمدی ص ۳۴۔ ۳۵

۳۸۔ حنفی مکتبِ فکر کے یہ مشہور بزرگ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری حضرت سید احمد صاحبؒ کے خلفاء میں سے تھے مگر افسوس کہ بالاکوٹ میں حضرت سید صاحبؒ، حضرت امام محمد اسمٰعیلؒ اور دیگر رفقاء کی شہادت کے بعد انہوں نے نہ صرف تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی بلکہ شدت سے اس کی مخالفت بھی شروع کر دی چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی رقم طراز ہیں :۔

"مجاہدین اور اتباع سید احمدؒ کے سب سے بڑے واقف کار مسٹر جیمس اوکنلی (JAMES OKINLEY) نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے (PERSISTENT OPPONANT OF WAHABIS) یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا (وہ خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے مشہور ادیب مولوی عبد الاول صاحب جونپوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے اس کے علاوہ راقم یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحابِ خاص کی روش سے بالکل الگ تھے"

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۸۴ (حاشیہ)

اسی طرح پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی لکھا ہے :۔

"آپ نے انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا تھا"
تذکرہ علماء ہند ص ۳۹۶

اس طرح حنفی مکتبِ فکر سے وابستہ دیگر اکثر و بیشتر بزرگوں کا بھی یہی حال تھا۔

۳۹۔ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ بڑے عالم و فاضل اور زاہد و عابد بزرگ تھے ۱۱۵۶ھ میں بٹالہ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ ابتداً اپنے علاقہ میں علم حاصل کیا اور پھر علمی تشنگی کی مزید تسکین کے لیے سوئے دہلی روانہ ہوگئے اور وہاں دودمانِ عالی ولی اللٰہی کے چشمۂ صافی سے سیرابی حاصل کرنے کے لیے شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے "صحیح بخاری" کا درس لیا۔ ۲۲ سال کی عمر میں شیخ جانجاناں علوی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرصۂ دراز تک ان کے پاس اوراد و وظائف میں مشغول رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جانشین بن گئے آپ کا معمول تھا کہ روزانہ دس ہزار مرتبہ نفی و اثبات کا وظیفہ کرتے، اسم ذات کے وظیفہ، استغفار اور درود شریف کا تو شمار ہی نہ تھا اس کے علاوہ دس پارے یومیہ تلاوتِ قرآنِ پاک کرتے۔ پانی سے روزہ افطار کرتے اور زمین سے ہی بستر کا کام لیتے قریباً پندرہ برس آپ کا یہ معمول رہا ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ میں آپ اللہ کو پیارے ہوگئے اور دہلی میں مدفون ہیں نور اللہ مرقدہٗ

مزید حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۳ - ۱۵۵ برکات الاولیاء ص ۱۸۵، گلزارِ اولیاء ص ۴۷ - ۵۴، تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان ص ۴۶۱ - ۴۶۷ انوار العارفین ص ۴۷۰ - ۴۸۱، ضمیمہ مقامات مظہری ص ۱ - ۳۸، رودِ کوثر ص ۶۴۲ - ۶۵۳ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) ج ۱ ص ۳۶۰، نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۶ - ۳۵۸، خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۹۳، حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۰۸ - ۳۴۰، تاریخ اولیائے دہلی ص ۱۳۰، تذکرہ علماء ہند اردو ص ۳۶۴، آثار الصنادید ص ۲۰۷ - ۲۱۲

۴۰۔ سیرت سید احمد شہیدؒ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ج ۱ ص ۱۲۰ - ۱۲۵

۴۱۔ بحوالہ سید احمد شہید ص ۱۱۸

۴۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان

۴۳۔ منظورۃ السعداء بحوالہ سید احمد شہید ص ۱۲۰

۴۴۔ ہندوستان میں اہلِ حدیث کی علمی خدمات ص ۱۹

۴۵۔ حضرت امام ابو سلیمان اسحٰق بن محمد افضل محدث دہلویؒ ۸ ذوالحجہ ۱۱۹۶ھ یا ۱۱۹۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ "کافیہ" تک صرف و نحو مولانا عبدالحی صاحبؒ سے پڑھی، فقہ و حدیث اور دیگر درسی کتابیں شیخ عبدالقادرؒ سے پڑھیں اور اس کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے سندِ فراغت حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ آپ پر بڑی شفقت فرماتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے اپنی تمام کتابیں بھی آپ کو عنایت فرما دی تھیں ان کی وفات کے بعد آپ ان کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے ۱۲۴۰ھ میں آپ کو حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی اور آپ نے شیخ عمر بن عبدالکریم بن عبدالرسول مکی المتوفی ۱۲۴۷ھ سے بھی سند حاصل کی اور ہندوستان تشریف لے آئے۔ سولہ سال تک دہلی میں تدریس میں مشغول رہے اور پھر ۱۲۵۸ھ میں اپنے بھائی شاہ محمد یعقوب اور دیگر اہل و عیال سمیت مکہ معظمہ ہجرت کر گئے، وہاں شیخ شریف محمد بن ناصر حازمیؒ نے آپ سے کسبِ فیض کیا۔ آپ کے تلامذہ میں محدث عبدالغنی بن ابی سعید دہلوی، شیخ الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی، شیخ عبدالرحمان بن محمد پانی پتی، سید عالم مراد آبادی، مولانا عبدالقیوم بن عبدالحی بڑھانوی، شیخ قطب الدین دہلوی شیخ احمد علی سہارنپوری، شیخ عبدالجلیل شہید کوٹلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، شیخ احمد اللہ انامی رحمہم اللہ اور دیگر بہت سے بڑے بڑے علماء کرام شامل ہیں حتیٰ کہ پاک و ہند میں آپ کی سند کے علاوہ اور کوئی سند باقی ہی نہیں و ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء حضرت شاہ عبدالعزیزؒ مسرت کی وجہ سے یہ آیت کریمہ بکثرت تلاوت کیا کرتے تھے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحَاقَ" حضرت شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے آپ سے افضل کسی عالم کی صحبت میسر نہیں ہوئی آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

؎ برائے رہبری قوم فساق — دوبارہ آمد اسمٰعیل و اسحٰق

آپ بروز سوموار ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں روزہ کی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور قبرستان معلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کے پاس مدفون ہیں مزید حالات کے لیے ملاحظہ فرمایئے واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص ۱۲۴، تاریخ دہلی ص ۱۰۶، حدائق

الحنفیہ ص ۲۷۴، الحیاۃ بعد المماۃ ص ۳۸، آثار الصنادید ص ۲۷۵، نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۱ - ۵۲، حکایات اولیاء ص ۱۱۴ - ۱۳۰، تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۲۵ - ۱۲۹

۴۶۔ حکایات اولیاء ص ۱۲۷

۴۷۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲ - ۱۹۳ نیز ملاحظہ فرمایئے "تجلیٔ نور"

۴۸۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۲

۴۹۔ ایضاً ص ۲۴۲ - ۲۴۴

۵۰۔ آثار الصنادید ص ۳۲۵

۵۱۔ تذکرۃ الشعراء ص ۹۲ طبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

۵۲۔ مزید حالات کے لیے ملاحظہ فرمایئے :۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۰۶ - ۳۰۷، آثار الصنادید ص ۳۲۵ - ۳۳۱، ریاض الفردوس ص ۱۱۸، سخن الشعراء ص ۳۴۳، تذکرۃ الشعراء ص ۹۲ تذکرۂ اہلِ دہلی ص ۱۳۱ - ۱۳۸، تذکرۂ شمع انجمن ص ۳۱۸

۵۳۔ العلم الخفاق من علم الاشتقاق ص ۱۶۰

۵۴۔ سلسلۃ العسجد نمبر ۲۵ ص ۱۰۶

۵۵۔ ماہنامہ "رحیق" لاہور ج ۲ ش ۴ ص ۱۸۷ مجریہ نومبر ۱۹۵۷ء

۵۶۔ حضرت سید ابو احمد حسن بن علی حسینی بخاری قنوجی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۳ھ میں وفات پا گئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، رفیع الدین اور عبدالقادر رحمہم اللہ سے آپ کو تلمذ حاصل تھا۔ اور حضرت امام صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے حضرت سید صاحبؒ سے بیعت تھے۔ ان کی معیت میں خراسان بھی گئے اور لسان، حبان بیان اور شمشیر و سنان ہر طرح سے جہاد کیا پھر وطن واپس تشریف لے آئے اور تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر میں مصروف ہو گئے۔ جن لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے ہدایت حاصل کی ان کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے۔ آپ تقویٰ، عمل، تاثیرِ وعظ، قلتِ حرص، ایثار اور وجاہت و ہیبت کے اعتبار سے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک تھے ساری زندگی اطاعتِ الٰہی میں لگے رہے متقلد اور عامل بالکتاب والسنہ تھے۔ آپ کا ارادہ تھا کہ ہندوستان سے ترکِ سکونت کر کے حرمین

شریفین کی طرف ہجرت کر جائیں لگر اللہ کو یہ منظور نہ تھا اور عین عالم شباب میں دارِ آخرت کی طرف ہجرت کر گئے حدیث و تفسیر کی کتابوں کے علاوہ اور کوئی چیز ترکہ میں نہ چھوڑی ان میں سے بھی زیادہ تر آپ کے دستِ مبارک سے لکھی ہوئی تھیں آپ کی تصنیفات نہایت نفع بخش اور زیادہ تر اردو میں اور نظم و نثر دونوں میں کچھ کتابیں عربی و فارسی میں بھی ہیں۔ وفات کے بعد آپ کی قبر پر نور دکھائی دیتا رہا آپ کے احباب میں سے کسی نے " بات بخیر " (۱۲۵۳) سے تاریخ وفات نکالی رحمہ اللہ برحمۃ واسعۃ وجعل الجنۃ مثواہ و منزلہ۔ حضرت نواب صاحب آپ کے صاحبزادہ گرامی ہیں، التاج المکلل ص ۴۹۲ نیز ابجد العلوم اور حضرت نواب صاحب کی کئی دیگر تصنیفات میں بھی آپ کے حالات مرقوم ہیں۔

۵۷۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۱۶ - ۳۱۷

۵۸۔ ایضاً ص ۴۱۳

۵۹۔ ایضاً ص ۴۸۶

۶۰۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۲۲ - ۵۲۳

۶۱۔ "تذکرہ صادقہ ص ۱۴۹ ــ ۱۵۰ مطبوعہ دی آزاد پریس پٹنہ ۱۹۶۴ء

۶۲۔ "تذکرۂ صادقہ ص ۱۵۴

۶۳۔ مولانا ولایت علی صاحب کے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیے "تذکرۂ صادقہ ص ۱۴۸ - ۱۸۴ طبع سوم، نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۲۴ - ۵۲۵، سرگزشتِ مجاہدین ۲۲۵ ۲۸۱ ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۱۳۳ - ۱۷۵

۶۴۔ الحیاۃ بعد المماۃ ص ۹۰ مطبوعہ ۱۹۵۹ء کراچی

۶۵۔ آثار الصنادید ص ۲۹۱

۶۶۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۶

۶۷۔ جماعتِ مجاہدین ص ۱۹۳ - ۲۱۳، نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۱۹

۶۸۔ مولانا خرم علی ضلع کانپور کے ایک گاؤں بلہور میں پیدا ہوئے۔ درسی کتب پڑھنے کے بعد آپ سید صاحب سے بیعت ہوئے اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے پھر ابتدا میں نواب ذو الفقار

خاں کے پاس چلے گئے اور ترجمہ و تصنیف کے فرائض انجام دینے لگے۔ آپ نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الدر المختار" کا اردو میں "غایۃ الاوطار" کے نام سے ترجمہ شروع کیا۔ ابھی باب الاذان تک ہی پہنچے تھے کہ پیام اجل آگیا، اس کے علاوہ آپ نے "مشارق الانوار" کا ترجمہ و شرح اور "القول الجمیل" کا ترجمہ "شفاء العلیل" کے نام سے کیا۔ علاوہ ازیں "نصیحۃ المسلمین" اور قرأت فاتحہ خلف الامام" آپ کے رسائل ہیں۔ ۱۲۷۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۸-۱۵۹، تراجم علماء حدیث ہند ص ۳۹۴-۳۹۶، تذکرہ علماء ہند ص ۵۶، حیات سید احمد شہید ص ۲۹۷، جماعت مجاہدین ص ۲۹۴

۶۹- نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۲۰، تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۸۱-۲۸۲

۷۰۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی ولادت ۱۱۶۲ھ میں کاندھلہ میں ہوئی آپ کا سلسلۂ نسب امام رازیؒ کے واسطے سے حضرت صدیق اکبر تک جا پہنچتا ہے آپ نے اپنے نانا شیخ محمد مدرس کاندھلویؒ کی گود میں تربیت حاصل کی۔ کتابت، حساب اور چند چھوٹے چھوٹے رسائل اپنے والد صاحب سے پڑھے پھر دہلی چلے گئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تعلیم حاصل کی۔ ایک مدت تک ان کے پاس رہے اور ان سے بیعت بھی ہوئے طب کی تعلیم اپنے والد صاحب اور دادا جان سے حاصل کی اور پھر نواب ضابطہ خاں کے پاس منصبِ افتاء پر فائز ہوئے ان کی وفات پر بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں بھی یہی خدمت انجام دیتے رہے کچھ مدت بعد اپنے شہر واپس آگئے اور بھائی الحاج کمال الدین کاندھلویؒ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے اور اذکار و اشغال میں مشغول ہوگئے پھر حضرت سید صاحبؒ سے طریقۂ نقشبندیہ کو حاصل کیا اور "الملحقات الاحمدیہ" تصنیف فرمائی جس میں اسی طریقہ کے اذکار و اشغال کے ساتھ ساتھ سید صاحبؒ کے مدائح کو بھی قلمبند کیا اس کے علاوہ آپ "جوامع الکلم"، "شیم الحبیب فی ذکر خصائل الحبیب" "شرح حضرات الخمس" تکملہ مثنوی معنوی" اور کئی دیگر کتابوں کے مصنف ہیں بروز اتوار مورخہ ۱۵ رجمادی الآخری ۱۲۴۵ھ کو اللہ کو پیارے ہوگئے نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۷۰

۷۱- حکایاتِ اولیاء ص ۶۸

۷۲- جماعتِ مجاہدین ۲۷۹

۷۳۔ مولوی محبوب علی بن مصاحب علی دہلوی محرم ۱۲۰۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے علم پڑھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے سندِ اجازت حاصل کی انہوں نے سید صاحب سے بیعت بھی کی تھی اور آپ کی مدد کے لیے اپنے رفقاء سمیت یاغستان کی طرف جا رہے تھے کہ شیطان نے وسوسوں میں مبتلا کر دیا اور واپس آ گئے۔ اسی کا تذکرہ متن میں کیا جا رہا ہے۔ ۱۰ ذوالحجہ ۱۲۸۰ھ کو دہلی میں فوت ہوئے۔ ترجمہ کے لیے ملاحظہ فرمایئے نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۹ ۴۰۷، آثار الصنادید ص ۲۷۸، واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ۴۱۴

۷۴۔ بالاکوٹ میں حضرت سید احمدؒ اور حضرت امام صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہر ایک کی نگاہ بار بار جس پر پڑتی تھی وہ شیخ ولی محمد پھلتی ہی تھے کیونکہ سید صاحبؒ کے رفقاء خاص میں سے جو لوگ زندہ رہ گئے تھے ان میں سے شیخ صاحب ہی افضل تھے۔ لیکن ان کی حالت یہ تھی جیسے کوئی دیوانہ یا حواس باختہ ہو۔ سید صاحب کے غم میں ہوش بجا نہ تھے اکابرین، مجاہدین میں سے تین بزرگ ایسے تھے جو جنگِ بالاکوٹ میں شریک نہ تھے ایک شیخ حسن علی، دوسرے مولوی محمد قاسم پانی پتی تیسرے مولوی نصیر الدین منگلوری۔ بالاکوٹ کے سانحہ اور سید صاحب کے فراق کا غم انہیں بھی سب کے برابر تھا لیکن ان پر حواس باختگی کی وہ کیفیت طاری نہ تھی جس سے دوسرے مجاہدین بُری طرح متاثر تھے انہوں نے شیخ ولی محمد کو سمجھایا کہ جماعتی نظام سے بے پروائی اور بے تعلقی کا اظہار سراسر خلافِ مصلحت ہے چنانچہ شیخ صاحب نے ان تینوں مشیروں اور جماعت کی بہت بڑی اکثریت کے اصرار پر امیر بننا قبول کر لیا اور سرکردہ اصحاب کے مشورہ اور اتفاق سے باقاعدہ بیعت کا انتظام کیا گیا۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ فرمایئے سرگزشتِ مجاہدین ص ۲۱ - ۱۲۸

۷۵۔ آپ کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ آپ کا نام پہلے پہل اس فوج کے سلسلے میں مذکور ہے جو حضرت امام صاحب کی سرکردگی میں پکھلی (ہزارہ) بھیجی گئی تھی ڈمگلہ پر شبخون میں یہ میاں محمد مقیم کے نائب و مشیر تھے انہیں کے ایماء پر غازی سکھ لشکرگاہ سے باہر آئے تھے اور مولوی صاحب خود ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اس وقت تک سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے جب تک غازیوں کا بڑا حصہ باہر نکل کر محفوظ مقام پر نہ پہنچ گیا۔ مولوی صاحب علم و فضل، جنگ تدبیر اور سیاست و ملک داری میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے علم دین میں بھی ان کا رتبہ بہت

اونچا تھا راویوں نے لکھا ہے کہ بہت متین دُور اندیش اور حلیم تھے ملاحظہ فرمائیے جماعتِ مجاہدین ص ۱۵۵۔ ۱۶۰

۷۶۔ پائندہ خاں تنولی ریاست امب کا والی تھا جنگِ امب میں اسے مجاہدین کے ہاتھوں شکست ہوئی اور یہ بھاگ گیا شیخ ولی محمد کے دورِ امارت میں اس نے پیغام بھیجا کہ میں سید بادشاہ کے وقت میں شامتِ نفس کے باعث خدمت گزاری کی سعادت سے محروم رہا اب آپ لوگ پنجتار سے اُٹھ کر امب چلے آئیے شاید آپ کی خدمت گزاری کی برکت سے اللہ تعالیٰ میری سابقہ خطائیں معاف کر دے لیکن درحقیقت بات یہ تھی کہ پائندہ خاں کی ہمشیرہ عبدالغفور خاں رئیس اگرور سے منسوب تھی پھر دونوں کے حالات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ شادی توقف میں پڑ گئی جنگِ امب میں شکست کھانے کے بعد جب یہ فرار ہو گیا تو حضرت امام صاحبؒ نے عبدالغفور خاں رئیس اگرور کے بھائی کمال خاں سے کہہ دیا کہ پائندہ خاں کے متعلقین اور اس کا جملہ سامان اس کے پاس پہنچا دیا جائے اس حکم کی تعمیل ہوئی اور خان اگرور نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر منسوبہ سے بطور خود شادی کر لی اس وجہ سے پائندہ خاں اور خوانینِ اگرور کے درمیان مستقل عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ مجاہدین کو حبسی کوٹ میں بٹھانے اور اگرور ان کے حوالے کر دینے کی غرض یہی تھی کہ خوانینِ اگرور کو اپنے علاقے میں استقلال کا موقع نہ ملے گویا اس نے مجاہدین کو آلۂ کار بنا کر خانِ اگرور کو اس علاقہ سے نکلوا دیا۔ آخر کار جب اس کی آرزو پوری ہو گئی، خوانینِ اگرور بھی کسی نہ کسی طرح اپنے انجام کو پہنچ گئے تو پائندہ خاں نے پھر عہد شکنی کر دی اور ۱۸۴۶ء کو سکھوں سے لڑتا ہوا مارا گیا سرگزشت مجاہدین ص ۱۰۶۔ ۱۸ ا سید احمد شہید ص ۵۲۸۔ ۵۷۴، حیاتِ سید احمد شہید ص ۲۴۹۔ ۲۵۲

۷۷۔ سید احمد علی کی جنگِ پھولڑہ میں ہی شہادت ہوئی جب آپ کا سنگِ چقماق خراب ہو گیا اور بندوق سے کام لینے کی کوئی صورت نہ رہی تو خالی بندوق ہاتھ میں لے کر لٹھ، کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس طرح بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر نیزوں۔ تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو کر گر گئے، گرتے ہی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔

(سید احمد شہید ص ۵۷۰)

۷۸۔ جماعت مجاہدین ص ۲۷۹۔ ۲۸۰

(۳)
باب

۱۔ آثار الصنادید ص ۲۷۳-۲۷۴ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۶ء

۲۔ یعنی وہ تبرکات جو کہ محمد شاہ کے دور میں قلعہ سے جامع مسجد میں منتقل کر دیئے گئے تھے لوگوں کے کہنے کے مطابق ان میں سے موئے مبارک، جبۂ شریف، نعلین شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے ایک پارہ کلام مجید حضرت علی رضؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا نیز ان کا پنجہ بھی تھا امام حسنؓ کا لکھا ہوا قرآن مجید اور امام حسینؓ کا ایک پارہ تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اشیاء اور بھی تھیں لیکن ان تبرکات کی صحت کے متعلق کوئی صحیح تاریخی شہادت نہیں تھی۔

۳۔ سورۂ توبہ آیت ۵۱

۴۔ حیاتِ طیبہ ص ۸۴-۹۰، حکایاتِ اولیاء ص ۷۰-۷۲

۵۔ حیاتِ سید احمد شہید ص ۱۴۳

۶۔ ارواحِ ثلاثہ ص ۸۵-۸۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء

۷۔ جس نے ہمارے اس دین (اسلام) میں کوئی ایسی چیز ایجاد کر دی جو درحقیقت اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

۸۔ ارواحِ ثلاثہ ص ۱۰۱-۱۰۳

۹۔ " " " ۱۰۳-۱۰۴

۱۰۔ حیاتِ طیبہ ص ۱۳۱

۱۱۔ حیاتِ طیبہ ص ۱۳۲

۱۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۱

۱۳۔ مرزا حسن علی کی ولادت و نشائت لکھنؤ میں ہوئی ابتدا میں آپ حنفی تھے پھر شافعی ہو گئے مولانا حیدر علی بن حمد سندیلوی، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز رحؒ سے علم حاصل کیا۔ محسن بن یحییٰ ترہتی نے "الیانع الجنی" میں لکھا ہے کہ آپ کو حدیث میں تبحر حاصل تھا اور دیگر علوم میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے آپ کی تصنیفات میں سے "تحفۃ المشتاق فی النکاح

والصداق" برہان الخلاف" اور حرمت نجوم و رمل و جفر" مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے رسائل اور فتاویٰ فقہیہ ہیں۔ ہفتہ کے دن ۲۶ رجب المرجب ۱۲۵۵ھ کو فوت ہوئے۔

۱۴۔ حیات سید احمد شہید ص ۱۱۱

۱۵۔ مولانا امام بخش عمری دہلوی بہت بڑے عالم و فاضل اور شاعر تھے صہبائی تخلص کرتے تھے لغت، بیان، بدیع اور لغز میں خصوصی مہارت رکھتے تھے مولانا عبداللہ علوی اور دیگر علماءؒ سے علم حاصل کیا۔ دہلی کالج میں عرصہ تک تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے سحر البلاغہ دیوانِ فارسی، انشاء کے بارے میں چند رسائل اور فارسی کی چند درسی کتابوں کی شروح آپ کی علمی یادگار ہیں ۱۲۷۳ھ میں گھر میں مقتول پائے گئے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۷۳، آثار الصنادید ص ۳۳۱ - ۳۴۰

۱۶۔ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) شاہ عالم ثانی (ف ۱۸۰۶ء) کا لڑکا اور بہادر شاہ ظفر کا باپ تھا۔ اس کی بادشاہت محض شاہانہ القاب تک محدود تھی اور اس نے اپنی زندگی محل کے گوشۂ عافیت میں برطانوی کمپنی کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے گزاری۔

۱۷۔ سید محمد اسحٰق صاحبؒ نے علم و مشیخت کی گود میں آنکھ کھولی ابتدا میں تحصیل علم کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے پھر دہلی چلے گئے اور شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ سے حدیث و تفسیر کی کتابیں پڑھیں اور ان علوم میں درجۂ کمال حاصل کر لیا خصوصاً تفسیر کے ساتھ تو آپ کو بہت زیادہ شغف تھا۔ آپ کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا صرف فن تفسیر کی دو سو کتابیں آپ کے پاس تھیں عربی و فارسی میں شعر بھی کہتے تھے دو سو شعر کا ایک قصیدہ علم میراث میں لکھا اور اس کی شرح بھی کی۔ لغوی مسائل بھی نظم کیے اور ایک فارسی قصیدہ میں اہل بدر کے اسمائے گرامی جمع کر دیئے آپ ۶ رجمادی الاخریٰ ۱۲۳۴ھ (۲ اپریل ۱۸۱۹ء) کو رائے بریلی میں فوت ہوئے اور وہیں اپنے نانا سید ابو سعید صاحبؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۲ - ۵۳، سید احمد شہید ص ۵۷

۱۸۔ سید احمد شہید ص ۱۴۷

۱۹۔ حیاتِ سیّد احمد شہید ص ۳۰۵

۲۰۔ جلال الدّین محمد اکبر عمر کوٹ (سندھ) میں ۲۳ نومبر ۱۵۴۲ء (۱۴ شعبان ۹۴۹ھ) کو پیدا ہوا۔ وہ ہمایوں کا پہلا فرزند تھا۔ ہمایوں کی وفات پر ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء میں تخت پر بٹھا دیا گیا اور اس کا اتالیق بیرم خاں نائب السلطنت مقرر ہوا۔ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء میں اکبر نے پانی پت کے تاریخی میدان میں جرنیل ہیمو بقال کو شکست دی۔ ۱۵۸۱ء میں اس نے اپنے نام نہاد "دینِ الٰہی" کو سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء میں بعارضہ پیچش آگرہ میں وفات پائی اور وہاں سے تین میل کے فاصلہ پر سکندرہ میں دفن کیا گیا جہاں اس نے اپنے مقبرہ کی تعمیر کا کام شروع کرا رکھا تھا۔

۲۱۔ بیرم خاں بدخشاں کا رہنے والا تھا۔ تمام عمر ہمایوں کا نہایت وفادار ساتھی رہا۔ جنگِ قنوج میں شیر شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوا مگر بعد میں بچ نکلا اور ہمایوں کی صحرا نوردی میں شریک رہا ہمایوں کے قیامِ ایران اور تخت کی بازیابی میں یہ ہمیشہ اس کا دست و بازو رہا۔ خدمات اور خوبیوں کی بدولت ہمایوں کی طرف سے اسے خانِ خاناں کا خطاب ملا اور اکبر کا اتالیق مقرر کر دیا گیا۔ اکبر کی تاجپوشی کے بعد بیرم خاں نے نائب السلطنت کے فرائض سنبھالے اور چار سال تک اس قدر گراں خدمات سرانجام دیں کہ سلطنتِ مغلیہ کو استحکام نصیب ہو گیا۔

۲۲۔ نور الدّین محمد جہانگیر اکبر کا لڑکا تھا۔ ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو پیدا ہوا۔ اکبر نے وفات سے کچھ پہلے اس کے سر پر شاہی پگڑی رکھنے اور اس کی کمر میں ہمایوں کی تلوار لٹکا دینے کا اشارہ کیا؛ چنانچہ ۱۶۰۵ء میں جہانگیر تختِ شاہی پر بیٹھا ۱۶۱۱ء میں مرزا غیاث بیگ کی لڑکی مہر النساء سے شادی کی جو بعد میں نور جہاں کے نام سے مشہور ہوئی جہانگیر نہایت زیرک ذہین، وسیع قلب اور انصاف پسند تھا، علماء، فضلاء، شعراء اور فن کاروں کا قدردان تھا خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا لیکن اچھا جرنیل ہونے کے باوجود آہنی قوتِ ارادی کا اس میں فقدان تھا۔ اور اس کی دوسری بڑی کمزوری کثرتِ شراب نوشی تھی ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر نے راجوری کے مقام پر بعارضہ دمہ وفات پائی اس کی نعش کو لاہور لایا گیا اور شاہدرہ کے قریب دِل کشا باغ میں دفن کر دیا گیا۔

۲۳۔ بہادر شاہ اوّل کا اصلی نام محمد معظم تھا وہ ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا اور اورنگ زیب کا دوسرا لڑکا تھا اورنگ زیب نے اسے شاہ عالم کا خطاب دیا تھا۔ عہدِ عالمگیری میں ۱۲ سال تک دکن کا صوبے دار رہا۔ ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کی مہم کے دوران قطب شاہ سے سازباز کے الزام میں گرفتار ہوا اور سات سال تک قید میں رہا۔ ۱۶۹۹ء میں اورنگ زیب کی وفات تک کابل کا صوبیدار رہا ان کی وفات کے بعد بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا، اپنے نام کا خطبہ و سکّہ جاری کیا اور دہلی و آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے پانچ سال کی حکومت کے بعد ۱۷۱۲ء میں وفات پائی۔

۲۴۔ تاریخ ہندوستان ج ۹ ص ۳۷ از مولانا ذکاء اللہ دہلوی مطبوعہ شمس المطابع دہلی ۱۸۹۸ء۔

۲۵۔ قمر الدین حسینی سونی پتی دہلوی نے خود امام عبد العزیزؒ سے شاہ عبد القادرؒ و شاہ رفیع الدینؒ کی مشارکت میں علم پڑھا اور مدّت دراز تک ان کے پاس رہے۔ ان کا شمار جلیل القدر شعراء میں ہوتا تھا۔ جب یہ لکھنؤ گئے تو وہاں شیعہ کے جال میں پھنس گئے اور مذہب شیعہ اختیار کر لیا پھر جب حیدر آباد گئے تو چندو لعل کی طرف سے انہیں بڑی جاگیریں اور انعام ملے ان کا دیوان اردو و فارسی کے ڈیڑھ لاکھ اشعار پر مشتمل ہے۔ انچاس برس کی عمر میں ۱۲۰۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۰، تاریخ ادب اُردو ص ۲۵۴۔ ۲۵۵ مصنفہ رام بابو صاحب سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری مطبوعہ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور۔

۲۶۔ مولوی دلدار علی نصیر آبادی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اجتہاد کا دعویٰ کیا انہوں نے ہی پہلی دفعہ شیعہ جماعت کی مذہبی تنظیم کی اور نماز جمعہ و نماز باجماعت کا سلسلہ شروع کیا ان کی ولادت نصیر آباد میں ۱۷۵۳ء میں ہوئی ہندوستان میں علوم عقلیہ کی تحصیل کے بعد عراق چلے گئے اور کربلا و نجف کے اساتذہ سے فقہ و حدیث اور اصول کی تعلیم حاصل کی پھر مشہد بھی گئے اور واپسی پر لکھنؤ میں تصنیف و تالیف اور تنظیم شیعہ میں مصروف ہو گئے۔ ۴ مئی ۱۸۲۰ء میں فوت ہوئے اور لکھنؤ میں مدفون ہیں۔

۲۷۔ مرزا محمد کامل بن عنایت احمد خاں کشمیری مقیم دہلی حاذق طبیب تھے شیعہ و سُنّی

مسائل میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے شاہ عبدالعزیزؒ سے ان عنوانات پر بحث کرتے رہتے تھے جب آپ کی کتاب "تحفہ اثناء عشریہ" چھپ کر آئی تو انہوں نے اس کے جواب میں نزہت اثناعشریہ" لکھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتب لکھیں۔ ۱۸۲۰ء میں فوت ہوئے اور دہلی میں دفن کیے گئے۔

۲۸۔ مفتی محمد قلی کنتوری مشہور شیعہ علماء میں سے ہیں ۱۱۸۸ھ میں پیدا ہوئے۔ اساتذۂ لکھنؤ سے علم کی تحصیل کی اور پھر مولوی دلدار سے فقہ و اصول اور حدیث کی تعلیم حاصل کی یہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں ان پانچ کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر متن میں کیا گیا ہے انہوں نے شیخ رشید الدین کی ایک کتاب — جو کہ انہوں نے "سیف ناصری" کی تردید میں لکھی — کا جواب "الاجوبۃ الفاخرہ" کے نام سے لکھا "صراط مستقیم" کے جواب میں" الفتوحات الحیدریہ" لکھی، شیخ رشید الدین کی کتاب" الشوکۃ العمریتہ" کے رد میں" الشعلۃ الظفریۃ" نامی کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے" نفاق الشیخین بحکم احادیث الصحیحین" ۔" تطہیر المؤمنین عن نجاستہ المشرکین" " تقریب الافہام فی تفسیر آیات الاحکام" اور بہت سے دیگر رسائل لکھے۔ ۱۲ محرم الحرام ۱۲۶۰ھ کو فوت ہوئے نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۰ - ۴۶۱

۲۹۔ مولوی محمد بن دلدار علی ۱۷ صفر ۱۱۹۹ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ زیادہ تر علم اپنے والد سے پڑھا انیس سال کی عمر میں مسندِ تدریس پر بیٹھے علم کلام اور اصول میں بڑی مہارت رکھتے تھے شاہانِ اودھ بالخصوص امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے انہوں نے "تحفہ" کی تردید میں دو رسالے لکھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب اور رسائل لکھے ۱۲۸۴ھ (۲۴ جولائی ۱۸۶۷ء) کو فوت ہوئے اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہیں۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۵ - ۴۱۶ ، رود کوثر ص ۶۲۴ - ۶۲۵

۳۰۔ ماخوذ از رود کوثر ص ۵۹۲ - ۵۹۳

۳۱۔ حیات سید احمد شہید ص ۱۰۹ - ۱۱۰

باب (۴)

۱۔ پرتگیزی یعنی اہل پرتگال یورپین اقوام میں سے سب سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں آئے

واسکوڈے گاما نے کالی کٹ کے راجہ زمورن کے دربار میں حاضر ہوکر مراعات حاصل کر لی تھیں ابتدا میں پرتگیزوں کو ایران اور عرب کے تاجروں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ یہ تمام حریفوں پر غالب آ گئے اور برِ صغیر کی بحری تجارت پر مکمل طور پر ان کا کنٹرول ہو گیا۔ انہوں نے راجہ زمورن کو بھی شکست دے دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں گوا، دمن، کوچین، کالی کٹ اور ہگلی وغیرہ بہت سے مقامات پر تجارتی مراکز قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور بہت سے دیگر مقامات پر انہوں نے اپنے قلعے بھی تعمیر کیے ان کا بحری بیڑا بہت مضبوط اور جدید اسلحہ سے لیس تھا اس لیے انہوں نے مسلمان تاجروں کو بحری لڑائیوں میں شکست دی۔

۲۔ تفسیر عزیزی بحوالہ سید احمد شہید ص ۱۷۸

۳۔ سید زین العابدین حضرت سید احمد صاحبؒ کے خواہر زادہ تھے آپ انتہائی عابد و زاہد بزرگ تھے نواب وزیر الدولہ والئی ٹونک کے پاس مدت تک قیام پذیر رہے وہ آپ کا بہت احترام کرتے تھے آپ ان کی نیابت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ۶۱ سال کی عمر میں ۲۳ رجب ۱۲۸۱ھ کو انتقال فرمایا سیرت علمیہ، نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۰

۴۔ وقائع بحوالہ سید احمد شہید ص ۱۸۰

۵۔ ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان بن حیدر علی خان ۱۷۵۰ء میں دیوان ہلی کے مقام پر پیدا ہوئے انہوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد یہ قرار دیا کہ وطن کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دیں ۱۷۹۰ء میں سلطان اور انگریزوں کے درمیان میسور کی تیسری جنگ ہوئی بعض اپنوں کی غداریوں اور غیروں کے عدمِ تعاون کے سبب سلطان کو فتح نہ ہو سکی مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور کمال مستعدی اور لیاقت سے ملک کو پھر خوشحالی سے ہمکنار کر دیا مگر ۱۷۹۹ء میں میسور کی چوتھی جنگ میں سالاروں کی غداروں کی وجہ سے نہ صرف شکست ہوئی بلکہ دادِ شجاعت دیتے ہوئے سلطان نے شہادت پائی۔ ٹیپو سلطان ایک جانباز مجاہد، شیر دل سپہ سالار، عظیم مدبر، ناظم مملکت، مادر وطن کا عظیم سپوت اور ملتِ اسلامیہ کا نامور مجاہد تھا۔ آپ کی شہادت کی خبر سنتے ہی جنرل ہارس نے کہا تھا "آج ہندوستان ہمارا ہے" آپ کا یہ ارشاد تاقیامت غازیانِ راہِ حریت کے لیے مشعلِ راہ رہے گا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

۶۔ مولانا وجیہہ الدین سہارنپوری ؒ مشہور حنفی عالم ہیں۔ آپ مولانا عبدالحیٔ صاحب ؒ کے شاگرد تھے سندِ فراغت بھی انہی سے حاصل کی مدت تک سہارنپور میں درس و تدریس میں مشغول رہے مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری ؒ کے آپ تایا اور استاد تھے انہوں نے "صحیح بخاری" کا درس آپ سے لیا تھا۔ آپ ابتداءً حضرت امام صاحب ؒ کے مخالف تھے حتیٰ کہ "تقویۃ الایمان" کا رد بھی لکھا لیکن بعد میں مخالفت سے تائب ہو گئے اور اپنی کتاب دہلی میں جا کر حضرت امام صاحب ؒ کے سامنے پھاڑ ڈالی اور اس روز سے حضرت امام صاحب کے عاشقِ زار بن گئے۔

۷۔ یہ بات درست نہیں کیوں کہ حضرت سید صاحب ؒ "دریا لبقا" نامی جہاز پر سوار جماعت کی قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور حضرت امام صاحب ؒ "فیضِ ربانی" جہاز کے امیر تھے اور پھر خود اس حکایت کے ابتدا میں بھی صراحت ہے کہ آپ سید صاحب کے جہاز میں سوار نہیں ہوئے بلکہ دوسرے جہاز میں سوار ہوئے تھے۔

۸۔ حکایاتِ اولیا ص ۸۸ - ۹۰

۹۔ حیات سید احمد شہید ص ۱۵۵

باب (۵)

۱۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۱

۲۔ الصف آیت ۱۰ - ۱۱

۳۔ التوبہ آیت ۱۹ - ۲۰

۴۔ الصف آیت ۴

۵۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم۔ عن ابی ہریرہ رضؓ

۶۔ " " " " " "

۷۔ " " " " " "

۸۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۶

۹۔ سورہ توبہ آیت ۲۴

۱۰۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۹۰

۱۱۔ " " " " ۸۹

۱۲۔ ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۲۹ مصنفہ ڈاکٹر قیام الدین مترجمہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی مطبوعہ کراچی

۱۳۔ سید احمد شہید ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

۱۴۔ مولانا محمد جعفر ولد میاں جیون تھانیسر ضلع انبالہ کے باشندے تھے تقریباً ۱۸۳۲ء میں ولادت ہوئی دس بارہ برس کے تھے کہ والد کے سایہ سے محروم ہو گئے مروجہ تعلیم کے حصول کے بعد ۱۸۵۶ء میں مقامی عدالتوں میں عرائض نویسی شروع کر دی مولانا عنایت علیؒ کی ہجرت سرحد کے بعد جب جماعتی نظام ۱۸۴۹ء میں مولانا یحییٰ علی کے سپرد ہوا تو مولانا تھانیسریؒ نے بھی ان کے زیر ہدایت اپنے فرائض انجام دیئے اور یہ تو یقینی امر ہے کہ ۱۸۵۶ء سے قبل آپ ذمہ دارانہ طور پر تحریک میں شامل ہو گئے تھے ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء میں مجاہدین کے ساتھ تعاون کے پیش نظر خانہ تلاشی ہوئی اور مقدمہ چلایا گیا ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا کہ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد ضبط ہے اور پھانسی کی سزا ہے ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۰ء تک آپ انبالہ جیل میں رہے ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو لاہور جیل سے روانہ ہوئے آخر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو انڈیمان روانگی ہوئی اور بمبئی سے ہوتے ہوئے ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈیمان پہنچ گئے ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو ۷ سال ۱۰ ماہ کے بعد انڈمان سے ایک بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپیہ نقد لے کر ہندوستان آئے اور ۱۳ نومبر ۱۸۸۳ء کو کلکتہ پہنچ گئے اور پھر انبالہ میں سکونت اختیار کر لی بالآخر ۱۹۰۵ء میں اس مرد مجاہد کا انتقال ہو گیا "سوانح احمدی" (حیات سید احمد شہید۔ نئے ایڈیشن کا نام) اور "کالا پانی" (تواریخ عجیب) آپ کی تصنیفات ہیں، "مکتوبات سید احمد شہید" بھی آپ کے ترتیب دیئے ہوئے ہیں مفصل حالات کے لیئے ملاحظہ فرمایئے "کالا پانی عرف تواریخ عجیب" "سرگذشت مجاہدین، ہندوستان میں وہابی تحریک،" "آور انڈین مسلمانس" "سلیکشن فرام بنگال گورنمنٹ ریکارڈ آن وہابی ٹرائلس، سلیم التواریخ از صوفی اکبر علی (جالندھر ۱۹۱۹ء)

۱۵۔ اصل کتاب میں یہ لفظ اسی طرح ہے صحیح لفظ "نار" ہے

۱۶۔ حیاتِ سید احمد شہید ص ۱۲۵

۱۷۔ تواریخ عجیبہ ص ۵۷

۱۸۔ مکاتیب شاہ اسمٰعیل ص ۵۷

۱۹۔ روشنیہ فرقہ کا بانی میاں بایزید انصاری المعروف بہ پیر روشن یا پیر روخاں ۱۵۲۵ء میں جالندھر میں پیدا ہوا ان کے والد عبد اللہ عالم و قاضی تھے۔ بایزید نے قرآن مجید اپنے والد کے ایک خلیفہ سے پڑھا اور "عمدۃ الاسلام" اور "منیر" وغیرہ فقہ کی کتابیں بھی پڑھیں اور اپنے والد سے "قدوری" اور "لباب الاخبار" کو پڑھا۔ مرشد کامل کی جستجو میں لگے رہے حتیٰ کہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اپنے چچازاد بھائی خواجہ اسمٰعیل انصاری کے مرید ہو جائیں مگر والد نے مخالفت کی اور شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کے خاندان سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا جسے انہوں نے تسلیم نہ کیا بالآخر خود ہی بڑی ریاضتیں اور عبادتیں شروع کر دیں اور نتیجۃً ان عقائد اور خیالات کا اظہار کیا جنہیں وہاں کے علماء و رؤسا نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو پیر روشن کابل سے پشاور چلے گئے وہاں کا حاکم بھی ان کا مخالف ہو گیا پھر پشاور سے علاقہ مہمند زئی میں چلے گئے اور وسیع پیمانے پر کام شروع کر دیا یہاں سے انہوں نے اپنی کتاب "صراط التوحید" اکبر کے پاس بھیجی اکبر نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور ان کی خدمت میں تحائف بھیجے لیکن اس کے بعد جلد ہی پیر روشن اور مغلوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہو گئیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہی تھا کہ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں پیر روشن کا انتقال ہو گیا تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ "پاکستان میں فارسی ادب" از ڈاکٹر ظہور الدین احمد "تذکرہ صوفیائے سرحد" از مولانا اعجاز الحق قدوسی، "حالنامہ" قلمی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری "مخزن الاسلام" بزبان پشتو از اخوند درویزہ صاحب۔

۲۱۔ کننگھم ص ۲۶۵ بحوالہ ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۵۴۔ ۳۵۵ مصنفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد۔ مترجمہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۷۲ء۔

۲۲۔ مثلاً مولانا عبد الرحیم عظیم آبادیؒ مولف "تذکرہ صادقہ" نے انگریزوں کی رحمدلی، عدل گستری اور رواداری کی تعریف کی ہے نیز مولانا ولایت علیؒ و عنایت علیؒ کی انگریزوں کے خلاف جد و جہد کو خفیف کر کے دکھایا ہے۔

بعد میں یہ سلسلۂ مضامین سوسائٹی اخبار میں ۲۴ر نومبر ۱۸۷۱ء سے ۲۲ر فروری ۱۸۷۲ء تک اُردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوتا رہا ۱۸۷۲ء میں میڈیکل ہال بنارس سے کتابی شکل میں شائع ہوا حافظ احمد حسین بدایونی (المتوفی ۱۸۸۷ء) نے بھی اسے بصورتِ کتاب اُردو انگریزی میں لندن سے شائع کیا۔ حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی نے اپنے مجلہ "اشاعت السنہ" ج ۱۱ نمبر ۴ میں اس کا اردو ترجمہ شائع کر دیا تھا۔ (اور پھر اقبال اکیڈمی لاہور نے بھی اس کا اردو ترجمہ شائع کیا۔

۲۳۔ حضرت مولانا ابو سعید محمد حسین بن شیخ عبدالرحیم بٹالہ ضلع گورداسپور میں ۱۷ر محرم ۱۲۵۶ھ کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وطنِ مألوف میں حاصل کی اور پھر سوئے دہلی روانہ ہو کر مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا گلشن علی جونپوری اور مولانا نور الحسن سے علومِ معقول و منقول، فقہ اور اصولِ فقہ کی تکمیل کر کے ۱۲۸۱ھ میں سندِ فراغت حاصل کی۔ آپ نے حدیث شریف کی سب کتابیں حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں اور ۱۲۸۲ھ میں آپ سے سند حاصل کی حضرت میاں صاحب نے آپ کی سند میں خاص طور پر یہ فقرہ تحریر فرمایا "ان لہ زیادۃ صحبۃ معی ومزید اختصاص بی علی غایرہ من الطلبۃ" آپ حضرت میاں صاحب اور حضرت شیخ عبداللہ غزنوی (متوفی ۱۲۹۸ھ) سے بیعت بھی تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ دہلی سے لاہور تشریف لے آئے اور مسجد چینیاں والی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا اور ساتھ ہی "سفیر ہند" امرتسر میں مضامین کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں اپنے ماہنامہ "اشاعت السنۃ النبویہ" کا اجراء فرمایا جو کم و بیش ۲۵ سال تک جاری رہا اس میں تمام مضامین و مقالات اپنے ہی ہوتے تھے شاذو نادر ہی کسی دوسرے کے مضمون کے لیے گنجائش نکلتی تھی بہت سے لوگوں نے استفادہ و تلمذ کی شکل میں بھی آپ سے کسبِ فیض کیا ۱۸۹۵ء میں امیر عبدالرحمٰن کی دعوت پر آپ کابل تشریف لے گئے آپ کی تصانیف میں سے البرہان[۱] الساطع المشروع فی ذکر الاقتداء بالمخالفین فی الفروع" (غیر مطبوعہ) "منح[۲] الباری فی ترجیح البخاری" ۔ البیان فی ردّ[۳] البرہان"۔ الاقتصاد[۴] فی مسائل الجہاد"۔ ترجمہ[۵] رسالہ الانصاف فی سبب الاختلاف" (مصنفہ مولانا محمد حیات سندھی متوفی ۱۱۶۳ھ) التحذیر[۶] عن التدبیر"۔ مفتح[۷] الکلام فی حیٰوۃ المسیح علیہ السلام رسالہ مذہب[۸] و معاشرت"۔۔ رسالہ اثبات[۹] نبوت"۔ رسالہ النظر[۱۰] فی التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ للغزالی مذہب ولا[۱۱] مذہبی، رسالہ تقدیر[۱۲] اور جبر و اختیار، اعادہ[۱۳] رحمانی، بعض[۱۴] و تہاجر"، ولادت[۱۵] مسیح، تورات و انجیل[۱۶] کی نسبت

اسلامی اعتقاد"، احکام نکاح وطلاق" پر اعتراضات کے جواب، رسالہ[۸۱] متعلقہ بحث امامت و پیری و مریدی، نصیحت نامہ" نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ وغیرہ۔ لیکن اوّل الذکرتین کے سوا باقی رسالے وہ ہیں جو "اشاعت السنہ" میں طویل مقالات کی شکل میں شائع ہوئے مورخہ ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ (۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) کو بیاسی برس کی عمر میں بعارضہ فالج انتقال فرمایا اور بٹالہ ہی میں دفن کیئے گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ"

۲۴۔ شیخ الاسلام حضرت ابوالوفا مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت امرتسر میں ہوئی والد ماجد کا اسمِ گرامی خضر جو تھا جو کہ اسلام آباد ضلع سرینگر سے ترک سکونت کرکے امرتسر تشریف لے آئے تھے۔ سات سال کی عمر میں آپ والد ماجد اور چودہ سال کی عمر میں والدہ محترمہ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے آپ نے شرح جامی اور قطبی تک کی امرتسر میں مولوی احمد اللہ صاحبؒ سے تعلیم حاصل کی پھر استاذ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادیؒ کی خدمت میں پہنچے اور کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد ۱۸۸۹ء میں ان سے سندِ فراغت حاصل کی اس کے بعد آپ شمس العلماء حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے بھی آپ نے سند حاصل کی پھر دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں بھی آپ نے کتب معقول و منقول پڑھیں پھر کانپور جا کر مولانا احمد حسن صاحبؒ سے بھی تعلیم حاصل کرکے ۱۸۹۲ء میں سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ تائید الاسلام امرتسر میں مسند تدریس کو رونق بخشی تصنیف کے میدان میں بھی آپ کے اشہب قلم نے خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں اور بے شمار کتابیں آپ کی یادگار ہیں ردِّ عیسائیت مرزائیت اور آریہ ازم آپ کے خاص موضوع تھے مرزائیت کی تردید میں تو آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں حتیٰ کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ "قادیانی تحریک کے متعلق میری کتابیں اتنی ہیں کہ مجھے خود ان کا شمار یاد نہیں" اسی وجہ سے تنگ آ کر مرزا جی نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو "مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ" نامی اشتہار شائع کیا اور نتیجۃً وہ حضرت ابوالوفاؒ سے بہت عرصہ پہلے مر گیا حضرت مرحوم کو تفسیر کے ساتھ بھی خصوصی شغف تھا "تفسیر ثنائی"، "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن"، "بیان الفرقان علی علم البیان" اور "تفسیر بالرائے" آپ کی مشہور کتب تفسیر ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے "اخبار اہلحدیث" کے نام سے ایک ہفت روزہ کا بھی اجراء کیا جو قریباً پینتالیس سال تک نشر و اشاعتِ اسلام اور خدمتِ دین میں گامزن رہا۔ فنِ مناظرہ میں تو آپ یکتائے روزگار تھے شاید چشمِ فلک نے آپ سے بڑا مناظر کوئی نہ دیکھا ہو" قیامِ پاکستان کے بعد

آپ امرتسر سے لاہور اور لاہور سے گوجرانوالہ تشریف لائے۔ چند ماہ قیام کے بعد اہل وعیال سمیت سرگودہا تشریف لے گئے۔ سرگودہا میں مسجد اہلحدیث نہ تھی۔ اس کے لیے کوشش فرمائی اور چند دن کے بعد، تمام زندگی اسلام وملتِ اسلامیہ کی خدمت میں بسر کرنے والے یہ نابغۂ روزگار، عبقری زماں اور "رجل الٰہی" ۱۹۴۸ء کو اپنے اللہ کے حضور جا پہنچے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء گوجرانوالہ) ایک مقام پر رقمطراز ہیں

"سرگودہا کا قبرستان کس قدر خوش نصیب ہے جس نے ایک محدث، ایک مفسر، مجالس کے بادشاہ اور فنِ مناظرہ کے امام کو اپنی آغوش میں جگہ دی۔ آہ! جو دنیا کے ہر گوشہ میں مجالس کی رونق تھا جس کے بغیر مجلسیں بے رونق اور سونی ہوتی تھیں آج پورے سکون کے ساتھ گوشۂ تنہائی میں آرام کی نیند سو رہا ہے اور جماعتِ اہلحدیث ان کے فیوض سے اس وقت محروم ہوئی جب کہ وہ ان کے مشوروں کی پیشتر سے زیادہ محتاج تھی۔ ؎

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

۲۵۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۷۳

۲۶۔ " " " " ۳۱۵

۲۷۔ " " " " ۱۷۹

۲۸۔ تفصیل ان کی خود نوشت سوانح حیات "کالا پانی" میں ملاحظہ فرمایئے۔ مطبوعہ طارق اکیڈمی فیصل آباد۔

۲۹۔ مرزا غلام احمد قادیانی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوا یہ ایک معمولی آدمی تھا، ملازمت کے سلسلہ میں کچھ عرصہ سیالکوٹ رہا، اسی عرصہ میں اس نے ایک کتاب لکھی جو کہ اتفاق سے لوگوں کو پسند آئی بس اسی وقت سے مرزا جی کے دل میں حبِ جاہ کا شوق پیدا ہوا اور پھر اس نے مہدی، مسیح موعود، نبی اور نہ معلوم کیا کیا ہونے کا ڈھونگ رچایا۔ مرزا جی چونکہ انگریز کا خود کاشتہ پودا تھے اس لیے اس نے اپنی عمر کا اکثر حصہ سلطنتِ انگریزی کی تائید وحمایت میں گزارا۔ مرزا جی نے اپنے نہ ماننے والوں کو حرامزادے

ولد الحرام، جنگلوں کے سؤر اور ان کی عورتوں کو کتیوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے اور اسی طرح اس کے "الہامات" بھی اس قدر خرافات کا پلندہ ہیں کہ انہیں نقل کرتے ہوئے بھی حیا آتی ہے۔

۳۰۔ تبلیغ رسالت ج ۷ ص ۱۹

۳۱۔ نور الحق حصہ اول ص ۳۳۔ ۳۴

۳۲۔ تریاق القلوب ص ۲۶

۳۳۔ ستارۂ قیصرہ ص ۷۰

۳۴۔ تریاق القلوب ص ۲۵

۳۵۔ "الفضل" ۷ ستمبر ۱۹۱۸ء

۳۶۔ "الفضل" ۳ دسمبر ۱۹۱۸ء

۳۷۔ ستارۂ قیصرہ ص ۱۰

۳۸۔ مکتوبات سید احمد شہید ص ۸۰ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

۳۹۔ سید احمد شہید ص ۲۳۹۔ ۲۴۰

۴۰۔ شہادت گاہِ بالاکوٹ ص ۳۱۷۔ ۳۱۸

۴۱۔ ازالہ اوہام ص ۴۰۰۔ ۴۰۱

۴۲۔ " " " "

۴۳۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کا ایک مضمون "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مرزائے قادیانی کی گستاخی اور مرزائیوں کا غلط پروپیگنڈہ" ملاحظہ فرمایئے ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور ج ۲۳ شمارہ ۳۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء شمارہ ۴، ۲۷ اگست ۱۹۷۱ء۔

۴۴۔ مکاتیبِ شاہ اسمٰعیلؒ ص ۵۲

۴۵۔ مکاتیبِ شاہ اسمٰعیلؒ ص ۵۵

۴۶۔ " " " " و مکتوباتِ سید احمد شہید ص ۳۷، ۳۸

۴۷۔ مکاتیبِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ص ۱۷۰

۴۸۔ حکیم مومن خاں مومن ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے عربی کی کتابیں

پڑھیں۔ والد اور چچا سے طب کی تعلیم حاصل کی اور نجوم میں بھی کمال حاصل کیا ابتداء میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور اپنی ہی ذہانت و طباعی پر بھروسہ کرتے تھے۔ فارسی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے فارسی دیوان اب ناپید ہے اردو کلیات میں غزلیں، رباعیاں، قطعات، قصیدے اور مثنویاں سب کچھ موجود ہے آپ کے دیوان کو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے ترتیب دیا تھا جو کہ ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب نے شائع کیا۔ مومن کے تلامذہ میں سے نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، میر حسین تسکین۔ میر غلام علی وحشت اور اصغر علی خاں نسیم وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں مومن خاں کا انتقال ہوا۔ تاریخ ادب اُردو ص ۳۶۰ - ۳۶۵، واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۲۴، آثار الصناوید ص ۳۴۲ - ۳۴۷ نیز ملاحظہ فرمائیے حیاتِ مومن، آبِ حیات، گلِ رعنا، گلشنِ بے خار، گلستانِ بے خزاں، گلستانِ سخن وغیرہ۔

۴۹۔ فتاویٰ عزیزیہ ج ۱ ص ۷، مطبوعہ مجتبائی۔

۵۰۔ " " " ص ۱۰۵

۵۱۔ مولانا عبید اللہ سندھی جنوری ۱۸۹۱ء میں دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد سندھ تشریف لے آئے اور امروٹ ضلع سکھر میں مولانا ابو الحسن تاج محمود کے پاس سکونت اختیار کرلی انہوں نے آپ کی شادی کا انتظام کیا، گھر دیا اور مطالعہ کے لیے ایک کتب خانہ کا انتظام بھی کر دیا دورانِ مطالعہ مولانا سندھیؒ نے امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے سوانح حیات، تحریکِ احیائے دین اور دعوتِ تجدید کا مطالعہ کیا بلکہ "تقویۃ الایمان" کا مطالعہ ہی آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذریعہ بنا تھا جیسا کہ انہوں نے خود "التمہید" میں تصریح فرمائی ہے۔ سندھ کے دورانِ قیام میں ہی مولانا سندھی نے حضرت امام صاحبؒ کے مکتوبات سے استفادہ کر کے ایک اسلامی و انقلابی پروگرام بھی بنایا تھا اور سندھ میں کچھ عرصہ اس کے مطابق کام بھی کرتے رہے۔ آپ نے "جمعیتہ الانصار" اور "نظارۃ المعارف" کے نام سے دو تنظیمیں بھی قائم کیں ۱۹۱۵ء میں کابل گئے، سات سال قیام کے بعد ۱۹۲۲ء میں روس گئے وہاں سے ۱۹۲۳ء میں ترکی گئے اور ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد حجاز تشریف لے گئے یہ تمام دقات آپ نے سیاسی سرگرمیوں میں بسر کیے اور آزادی کے متعلق گفتگو کی۔ ہندوستان واپس آنے

کے بعد بھی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہے بالآخر ۱۹۴۴ء میں انتقال فرما گئے رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۵۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۶۴ - ۶۵ مطبوعہ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۵۲ء۔

۵۳۔ فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۲۹۱

۵۴۔ فتاویٰ بر عقائد وہابیہ و دیوبندیہ ص ۴ مرتبہ منشی محمد لعل خاں صاحب مدراسی رضوی خلیفہ مولانا احمد رضا خاں۔

۵۵۔ حکایاتِ اولیاء ص ۹۲۔

۵۶۔ آثار الصنادید ص ۲۷۴۔

۵۷۔ سید محمد یعقوبؒ۔ سید صاحبؒ کے برادرِ اکبر سید ابراہیم کے صاحبزادے تھے ان سے سید صاحب کا دوہرا رشتہ تھا کہ ان کی والدہ سیدہ فاطمہ سید صاحب کی دوسری اہلیہ سیدہ ولیّہ کی حقیقی بہن تھیں اس لیے سید صاحب آپ کو بہت عزیز جانتے تھے آپ سید صاحبؒ کے ساتھ حج کو بھی گئے اور ہجرت بھی کی سید صاحبؒ نے آپ کو بھی سید عبد الرحمٰن کے ساتھ ٹونک سے واپس بھیج دیا تھا پھر مستورات کے ساتھ سندھ میں رہے۔ نواب وزیرالدولہ نے آپ کو ایک بڑے عہدہ کی پیشکش کی لیکن اسے قبول نہ فرمایا اور پچاس روپے ماہوار وظیفہ پر زندگی گزار دی نہایت عابد و زاہد تھے ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں وفات پائی۔

۵۸۔ امجد خاں گنتی کے باشندے تھے میمنہ کی قیادت کرتے ہوئے سرحد پہنچے۔ شنکیاری کی جنگ تک سرحد میں موجود تھے اس جنگ کی تفصیلات آپ سے بھی منقول ہیں پھر آپ کو ایک خاص کام کے لیے ہندوستان بھیج دیا گیا۔

۵۹۔ سید صاحبؒ نے جب پہلی مرتبہ کانپور کا دورہ کیا تو سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں سے ایک اللہ بخش خاں بھی تھے آپ اس وقت نہایت سجیلے اور کڑیل جوان تھے اکوڑہ میں جب سکھوں پر شبخون مارنے کا فیصلہ کیا گیا تو اللہ بخش کو غازیوں کا سپہ سالار بنا دیا گیا تھا آپ نے شجاعت کے جوہر دکھاتے ہوئے، اپنے سے پچاس ساٹھ گنا لشکر کو مارتے مارتے

پیچھے ہٹا دیا اور بالآخر خود بھی جام شہادت نوش فرما گئے۔

۶۰۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان

۶۱۔ حیات سید احمد شہید ص ۲۱۷

۶۲۔ عبدالمجید خاں آفریدیؒ جہان آباد (رائے بریلی) کے باشندے تھے آپ بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئے تھے اس لیے آپ کا نام فہرست میں شامل نہیں کیا گیا تھا جو کہ ان قوی و توانا غازیوں کی تھی جو جنگ اکوڑہ میں شبخون کے لیے منتخب کیے گئے تھے جب آپ کو معلوم ہوا تو فوراً سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور بڑے اصرار کے ساتھ اپنا نام بھی درج کرا لیا آپ نے بہت کمزوری کے باوجود شجاعت کے خوب جوہر دکھائے چودہ آدمیوں کو ایک تلوار سے قتل کیا۔ وہ ٹوٹ گئی تو مولانا امیرالدین نے اپنی تلوار دے دی اور "از آں ہم چندکس را کشتند" اور بالآخر خود بھی جام شہادت نوش فرما گئے۔ سقی اللہ ثراہ۔

۶۳۔ مولوی خیرالدین شیر کوٹیؒ نے سید صاحبؒ کے حکم سے قاسم خیل میں گولے ڈھالنے کا کارخانہ بنایا تھا اور مولوی احمد اللہ ناگپوری بھی ان کے شریک کار تھے۔ جنرل ونتورا سے بھی انہوں نے ہی سید صاحبؒ کی طرف سے گفتگو کی تھی۔ فتح امب کے بعد آپ کو چھتر بائی کی حکومت دے دی گئی تھی فتح پشاور کے بعد آپ کو قاضی القضاۃ کے عہدہ کی پیشکش کی گئی مگر آپ نے معذرت کر دی ۱۰ فروری ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ پہنچ گئے تھے لیکن بعد میں سید صاحبؒ کے فرمانے سے اس لشکر میں شریک ہو گئے جسے مظفر آباد بھیجا گیا تھا مظفر آباد سے واپسی پر جنگ بالاکوٹ کی صبح کو دریا کے مشرقی کنارے اس جگہ پہنچ گئے جہاں پل بنا ہوا تھا۔ مگر پل کو ٹوٹا ہوا پایا کیونکہ بحکم سید صاحبؒ اسے توڑ دیا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ اور آپ کے ہمراہ دیگر غازی درۂ کاغان کی طرف لوٹے تاکہ کسی گھاٹ سے دریا عبور کر سکیں جب وہ بالاکوٹ کے شمالی پہاڑوں پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور بہت سے غازی جام شہادت نوش فرما گئے ہیں۔ مولانا شیر کوٹیؒ علم و فضل، جنگ، تدبیر اور سیاست و ملک داری اور علم دین میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے بہت ہی متین، دور اندیش اور حلیم تھے جماعت مجاہدین ص ۱۵۵ - ۱۶۰

۶۴۔ ملا شاہ سید پیر منگ (درہ نندھیار) سے تعلق رکھتے تھے ضلع ہزارہ میں مجاہدین کی ابتدائی پیش قدمی کے وقت آپ حضرت امام صاحبؒ کے شریک کار تھے اور یورش ہنڈ میں بھی شریک تھے فتح

ہنڈ کے بعد خادے خاں کے رشتہ داروں نے اس کے قتل کے بعد لوگوں کو برانگیختہ کرنا شروع کیا تو حضرت امام صاحبؒ نے آپ کو خط دے کر پنجتار بھیجا تاکہ سید صاحبؒ کو صورتِ حال کی اطلاع دی جا سکے دس بارہ مجاہدین بھی آپ کے ہمراہ تھے جن میں سے آپ اور کالے خاں شاہین چی تھے اس گروہ نے ہنڈ سے چار میل کے فاصلہ پر شاہ منصور میں رات بسر کی خادے خاں کے اقربا کو جب علم ہوا تو انہوں نے اچانک اس چھوٹی سی جماعت پر ہلہ بول دیا ملا شاہ سیدؒ نے کئی آدمیوں کو مارا اور زخمی کیا آپ پر ہجوم ہوا تو پیچھے ہٹتے ہٹتے کنوئیں میں گر گئے بد طینت دشمنوں نے اوپر سے دو تین پتھر ڈال دیئے اور یہ عاشق پاک طینت جام شہادت نوش فرما گیا۔ حضرت امام صاحبؒ نے آپ کی میت کنوئیں سے نکلوائی اور دوسرے شہداء کی میتوں کے ساتھ چارپائیوں پر ڈال کر ہنڈ لے آئے اور وہاں ان تمام مقدس شہداء کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جماعتِ مجاہدین ص ۲۵۷-۲۵۹۔

۶۵۔ سید محمد مقیمؒ، نواب احمد علی خاں والئ رامپور کے نائب میاں کریم اللہ کے بھائی تھے سید صاحب کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جو اصحاب ہجرت سے پہلے مجاہدین کے قافلے لے کر سرحد پہنچے ان میں سید محمد مقیمؒ بھی تھے جو چالیس پچاس غازیوں کے ساتھ گئے تھے جنگِ ڈمگلہ میں آپ سالارِ لشکر تھے۔ ہزارہ سے واپسی کے بعد انہیں اپنے بھائی کی وفات کی اطلاع پہنچی آپ تو واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن سید صاحبؒ نے حکماً واپس بھیج دیا۔ رامپور میں اونچے عہدے پر فائز رہے ایک ریاستی کی سرکشی کے انسداد کے لیے پالکی میں بیٹھ کر اچانک گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور آپ شدید زخمی ہو گئے اور کچھ دیر بعد وفات پا گئے۔

۶۶۔ آپ اہلِ سرحد میں سے تھے حضرت امام صاحبؒ نے اپنے مکتوبات میں آپ کے علم و فضل، اخلاص و تقویٰ اور عقل و دانش کی بہت ستائش فرمائی ہے ایک موقع پر لکھا:۔

> "ملا اسمٰعیل اخوند زادہ نہایت ہوشیار و دیانتدار ہیں اور مشاورت و مصالحت میں پختہ کار وہ ان اطراف (ہزارہ) کے تمام فضلاء کے پیش کار ہیں اور جملہ خوانین کے معتمد۔ دین کے کام میں بجان مصروف ہیں اور تالیف و ترغیب میں بدل مشغول"

بحوالہ جماعت مجاہدین ص ۲۸۱

۶۷۔ بہبٹ گرام (علاقہ نندھیاڑ) کے رئیس تھے ابتداء میں ہی سید صاحب سے وابستگی پیدا

کرلی تھی بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے ساتھ اور مختلف مشوروں میں شریک تھے جب میدان میں یہ افواہ پھیلی کہ سید صاحبؒ کو گوجر اٹھا کرلے گئے ہیں تو دوسرے مجاہدین کے ساتھ یہ بھی روانہ ہوکر بالاکوٹ کے عقبی پہاڑ پر پہنچے تھے آپ نے جنگِ بالاکوٹ کے دو تین سال بعد وفات پائی۔ جماعت مجاہدین ص ۲۸۳

۶۸۔ سید احمد شہید ص ۴۱۹

۶۹۔ خواجہ صاحبؒ، سید صاحبؒ کے خاص مریدوں میں سے تھے ہر اہم موقع پر مشیروں یا رفیقوں میں آپ کا نام ضرور آتا ہے جنگِ بالاکوٹ کے وقت سید صاحبؒ نے ایک ارخالق سفید پاجامہ، دستار اور پشاوری لنگی خاص طور پر زیب تن فرمانے کے لیے دی۔ معرکہ بالاکوٹ میں ہی آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

۷۰۔ سید احمد شہید ص ۴۲۱ - ۴۲۲

۷۱۔ سید احمد شہید ص ۴۲۲

۷۲۔ منظورۃ السعداء بحوالہ سید احمد شہید ص ۴۲۵

۷۳۔ سید احمد شہید ص ۴۲۷

۷۴۔ کمال خان رئیس اگرور عبدالغفور خاں کا بھائی تھا یہ دونوں بھائی اس توقع پر مجاہدین کے ساتھ تعاون کرتے تھے کہ اگرور میں از سرِ نو ریاست قائم کرنے کا بندوبست ہوجائے گا لیکن مجاہدین پائندہ خاں کے تعاون سے جبی کوٹ پہنچے تھے اور اس کا تعاون مقاصدِ جہاد کے لیے زیادہ مفید تھا اس لیے مجاہدین عبدالغفور خاں اور کمال خاں کو اگرور میں آباد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے عبدالغفور خاں نے سکھوں سے خفیہ ساز باز شروع کردی اس لیے مقامی آبادیوں اور ولایتی مجاہدوں نے بطورِ خود عبدالغفور خاں اور کمال خاں کو ختم کرنے کی سکیم بنالی۔ اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے سرگزشتِ مجاہدین ص ۹۹ - ۱۰۴

۷۵۔ ناصر خاں بھٹ گرام (علاقہ نندھیاڑ) کے رئیس تھے ابتدائی دور ہی میں سید صاحبؒ سے وابستگی پیدا کرلی تھی۔ اور بالاکوٹ میں بھی ساتھ تھے ان کا مورچہ ست بنے کے کنارے شیخ ولی محمد کی جماعت کے بائیں ہاتھ تھا۔ اس جنگ میں ان کا ہاتھ زخمی ہوا۔ جنگِ بالاکوٹ سے دو

تین سال بعد وفات پائی ۔ جماعتِ مجاہدین ص ۲۸۲

۷۶۔ حیاتِ سیّد احمد شہیدؒ ص ۲۳۸ ۔ نفیس اکیڈمی کراچی دسمبر ۱۹۶۸ء

۷۷۔ سیّد احمد شہیدؒ ص ۴۵۳ ۔ ۴۵۴ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۸ء

۷۸۔ سیّد ابو محمد نصیر آبادیؒ، سیّد صاحبؒ کی پہلی اہلیہ محترمہ زہرہ بی بیؒ کے خالہ زاد بھائی تھے آپ نے مختلف جنگوں میں شرکت فرمائی جب دُرانیوں نے یورش کی اور غازی پیچھے ہٹے تو آپ بھی ان میں شامل تھے۔ چھیدا جو کہ آپ کے گھر کا آدمی تھا جب درانیوں میں گھر گیا تو اس نے گھبرا کر آپ کو آواز دی اسی کا بیان ہے کہ میری آواز سنتے ہی آپ نے باگ موڑی اور آ کر درانی سواروں سے لڑنے لگے میں موقع پا کر نکل گیا وہ لڑتے رہے۔ میں نے دور سے دیکھا کہ انہوں نے دو دُرانی سواروں کو مار گرایا پھر خود ہی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گئے قاضی گل محمد فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ سیّد ابو محمدؒ کو زخمی پڑے ہوئے دیکھا زخم ایسے کاری تھے کہ ان کے حواس بجا نہ تھے۔ میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کر کہا۔" سیّد ابو محمد! حضرت امیر المومنین کو فتح حاصل ہوئی ہے۔" وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے اور آہستہ آہستہ الحمدللہ الحمدللہ کہہ رہے تھے مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے ساتھیوں کو آواز دی کہ انہیں اٹھاؤ۔ کمل میں رکھ کر اٹھایا۔ کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے غفر اللہ لہٗ۔ جماعت مجاہدین۔ ص ۱۴۷ ۔ ۱۴۹

۷۹۔ میاں جی محی الدین چشتیؒ سیّد صاحبؒ کے مخلص ارادت مند تھے جب شاہِ بخارا کے پاس سفارت بھیجنے کی تجویز پختہ ہو گئی تو سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ کوئی موزوں آدمی منتخب کیا جائے تو حضرت امام صاحبؒ نے آپ کا نام تجویز فرمایا۔ آپ نقد روپیہ، سامان اور نو رفقاء کو لے کر باجوڑ ہوتے ہوئے چترال، چترال سے بدخشاں اور پھر فیض آباد پہنچے۔ پانچ دن کے بعد وہاں سے قندز روانہ ہو گئے۔ آپ نے چھ ساتھیوں کو قندز میں چھوڑا اور تین کو ہمراہ لے کر بخارا پہنچے شاہِ بخارا نے عزت و تکریم سے اتارا۔ پہلے تو بڑی گرمجوشی سے ملتا رہا۔ لیکن بعد میں درباریوں کی غلط بیانیوں کی وجہ سے شاہ بدظن ہو گیا۔ میاں جی پانچ مہینے ٹھہرے رہے اور جب محسوس فرمایا کہ مزید قیام کا کوئی فائدہ نہیں تو واپسی کا ارادہ کر لیا۔ شاہ نے کچھ تحائف دے کر رخصت کر دیا۔ میاں جی کے اس سفر میں دو سال صرف ہوئے۔ آپ کا ذکر جنگ ناماہ میں بھی آیا ہے۔

معذوری کے باعث آپ جنگِ بالاکوٹ میں شرکت نہ کر سکے۔ جماعتِ مجاہدین ص ۱۸۶۔ مولانا تھانیسریؒ نے یہاں "میاں نظام الدین چشتی" نام لیا ہے۔ حیات سید احمد شہیدؒ ص ۲۳۹ واللہ اعلم بالصواب۔

۸۰۔ ان نو حضرات کے اسماءِ گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ شیخ عجب اللہ ساکن کھڈّا اشکار پور ضلع مظفر نگر، نصیر الدین، رحیم بخش، اسمٰعیل خاں، ہمت خاں، فتح یاب خاں، حکیم عبد الحکیم دہلوی اور دو آدمی قندھاری تھے۔

۸۱۔ نامہ مبارک کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ فرمائیے "مکتوباتِ سید احمد شہید ص ۷۷۔ ۸۵ از مولانا تھانیسریؒ"، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔ طبع اوّل جنوری ۱۹۶۹ء

۸۲۔ قاضی سید محمد حبان کانڑا غوربند (سرحد آزاد) کے باشندے تھے بہت بڑے عالم، ذکی الطبع، غیور اور خوش تقریر تھے کچھ مدت کلکتہ میں مدرس بھی رہے۔ سید صاحبؒ کے زمانۂ قیام میں بیعت ہوئے۔ پائندہ خاں تنولی سے صلح ان ہی کی کوششوں سے ہوئی تھی انہوں نے حضرت امام صاحبؒ کی معیت میں چھ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر پورے علاقہ سرحد کا دورہ کیا اور ہر جگہ شرعی احکام نافذ کر دیئے۔ ہوتی اور مردان کے رئیس نے مخالفت کی اور درانیوں کو ساتھ ملا کر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تو آپ نے بھی حضرت امام صاحبؒ اور رسالدار عبد الحمید خاں کے مشورہ سے مردان پر یورش کر دی۔ اگرچہ قصبہ قبضے میں آ گیا لیکن آپ کو جامِ شہادت بھی نوش فرمانا پڑا۔ آپ کے بھائی قومی دستور کے مطابق میّت کو چار پائی پر ڈال کر وطن لے گئے چنانچہ آپ اپنے وطن میں ہی آسودۂ خاک ہیں۔ نور اللہ مرقدہٗ۔ جماعت مجاہدین ص ۱۵۱۔ ۱۵۲

۸۳۔ سید احمد شہید ص ۴۶۳۔ مولانا غلام رسول مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۸ء

۸۴۔ حیات سید احمد شہیدؒ۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۸ء

۸۵۔ چنگیز خاں (۱۱۵۵ء۔ ۱۲۲۷ء) روس کی اقلیم میں پیدا ہوا یہ مشہور تاتاری بادشاہ اور خاندانِ مغلیہ کا جدِ اعلیٰ تھا کہتے ہیں کہ یہ جب پیدا ہوا تو اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک

خون آلود ٹکڑا تھا جو کہ اس کی خون ریزیوں کی طرف اشارہ تھا چنانچہ اس کی فتوحات نے چین سے لے کر بحرِ اسود تک کی سلطنتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خونیں فتوحات کی وجہ سے اسے قہرِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ یاد رہے برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر (۱۴ فروری ۱۴۸۳ء ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) کا شجرۂ نسب ماں کی طرف سے چنگیز خاں سے ملتا ہے۔

۸۶۔ ہلاکو خاں بن تولی خاں بن چنگیز خاں نے ۶۵۶ھ میں بغداد پر حملہ کر کے اسے محاصرہ میں لے لیا تھا محاصرہ طول پکڑ گیا تو بغداد کے لوگ اشیائے خوردنی کے میسر نہ آنے کے باعث بھوک مرنے لگے۔ عباسی خلیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے ہلاکو خاں سے صلح کی درخواست کی اور اپنے بیٹوں کو ہمراہ لے کر اس کے پاس چلا گیا۔ ہلاکو نے صلح کی درخواست مسترد کر کے ان کے قتل کے احکام جاری کر دیئے اور دوسرے روز شہر کے لوگوں کو گھروں سے باہر نکال کر تاتاری فوج نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مسلمانوں کے قیمتی کتب خانوں کو بھی نذرِ آتش کر دیا اور ہزارہا کتابوں کو دریائے دجلہ میں بہا دیا۔ الغرض ہلاکو خاں نے بغداد کو کھنڈرات اور راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

۸۷۔ تیمور لنگ (۱۳۳۶ء۔ ۱۴۰۵ء) سمرقند کے قریب مقام "کش" میں پیدا ہوا اس نے رعب و دبدبہ کے ساتھ اقتدار پر تسلط جمایا اور خوارزم، کاشغر، خراسان، فارس، سوریا اور مصر وغیرہ بے شمار علاقوں کو فتح کر لیا۔ بغداد کی اس نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ سمرقند اس کا دارالحکومت تھا جہاں اس نے کاریگروں، ہنرمندوں، ماہرینِ فنون اور علماء کے ایک جمِ غفیر کو جمع کر دیا تھا یہ انتہائی سنگدل بادشاہ تھا۔ بابر کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے ایشیا کے اسی نامور فاتح سے جا ملتا ہے۔

۸۸۔ حیاتِ سید احمد شہید ص ۲۰۴ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۸ء

۸۹۔ مرزا احمد بیگؒ نے تمام لڑائیوں میں شرکت کی۔ بالاکوٹ میں پرانے پہاڑی راستہ پر تعین ہوئے تھے؛ چنانچہ سکھوں کی سب سے پہلے مرزا احمد بیگؒ کی فوج سے ہی مڈبھیڑ ہوئی تھی آپ بڑی مردانگی سے لڑے تھے اور سید صاحبؒ کو خبر بھی بھیج دی لیکن کمک پہنچنے سے پیشتر سکھ فوج کے سیل نے مرزا کی چھوٹی سی جماعت کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچا دیا تھا۔ مرزا کے

کچھ ساتھی چلے نالے پر شہید ہوئے اور غالباً وہیں دفن ہوئے، اس مقام کو آج کل شہید گلی کہتے ہیں۔ اس کے بعد مرزا کو بالاکوٹ بلایا گیا۔ وہ خود اور ان کے بقیۃ السیف ساتھیوں میں سے غالباً اکثر بالاکوٹ ہی میں شہید ہوئے۔ جماعت مجاہدین ص ۲۵۰ - ۲۵۲ از مولانا غلام رسول مہر کتاب منزل۔ لاہور۔

۹۰۔ سیّد احمد شہید ص ۴۹۰

۹۱۔ سورۃ النساء آیت ۵۹

۹۲۔ سیّد احمد شہید ص ۴۹۱

۹۳۔ " " " ۴۹۶

۹۴۔ سیّد احمد شہید ص ۴۹۶ — ۴۹۷

۹۵۔ ارباب بہرام خاں تہکال کے رئیس تھے سیّد صاحبؒ کے خہر جانے سے پیشتر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا جمیع مال و اسباب سیّد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر کر دیا، سیّد صاحبؒ نے دو گھوڑے اور دو تلواروں کے سب کچھ واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہتھیار اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دو اور انہیں ایک تلوار تبرکاً اپنے پاس سے بھی دی ارباب بہرام خاںؒ سیّد صاحبؒ سے وابستگی کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی الگ نہ ہوئے تنگی پر شبخون کے علاوہ باقی کارہائے نمایاں میں سے اوتمان زئی اور پشاور پر پیش قدمی کے موقع پر خہر کی سمت کے قبائل کو امداد پر آمادہ کرنا، پنجتار میں متعلقین سمیت ایک تیر کے فاصلہ پر شہتوت کے باغ میں قیام، کوہ کنیز ڑی (نزد عشرہ) کی جنگ میں مجاہدین کی سالاری، قیامِ پنجتار کے دوران سیّد صاحبؒ کو علاقے کے دورے کا مشورہ اور پشاور پر پیش قدمی کے موقعہ پر گور کھتری کے دروازہ کلاں پر قیام، جس کے اندر کی حویلی میں سیّد صاحبؒ ٹھہرے تھے وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ آپ نے بھی بالاکوٹ میں ہی جامِ شہادت نوش فرمایا۔ تلخیص از جماعت مجاہدین ص ۱۷۴ - ۱۷۷ - مولانا غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور۔

۹۶۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادیؒ نے سیّد صاحبؒ کی دعوت کے آغاز میں ہی بیعت کی آپ بلند پایہ عالم دین اور بڑے غیور شخص تھے آپ کے وعظ و ارشاد سے بہت سے لوگوں نے ہدایت

پائی آپ نے کئی جنگوں میں شرکت فرمائی جنگِ مردان میں سخت زخمی ہونے کے باوجود اپنی حقیقی حالت جنگ ختم ہونے تک کسی پر ظاہر نہ ہونے دی اسی وجہ سے ان غازیوں میں سے آپ دوسرے ہیں جن کے اس جنگ میں کارناموں کو امام صاحبؒ نے بطورِ خاص قابلِ ذکر قرار دیا۔ فتح پشاور کے بعد آپ کو وہاں کا قاضی مقرر کیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد سلطان محمد خاں نے آپ کو ضروری مشورہ کے بہانے ایک کمرے میں بلایا اور دھوکہ سے شہید کر دیا۔ آپ بہت بڑے عالم، متقی، ذکی الطبع صاحب اخلاق پسندیدہ اوصاف حمیدہ، سید صاحبؒ کے مخلص معتقد اور محبِ راسخ تھے۔ موصوف سپہ گری کے فن میں یکتائے زمانہ اور شجاعت و بہادری میں یگانہ مانے جاتے تھے" جماعت مجاہدین ص ۱۶۶ - ۱۶۹ حیات سید احمد شہید ص ۲۷۶ - ۲۷۷ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔

۹۷۔ سید احمد شہید ص ۵۲۷ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۸ء

۹۸۔ شیخ بلند بخت سرہند میں سید صاحبؒ سے ملے تھے فنونِ سپہ گری اور دیگر اوصاف و محاسن کی وجہ سے ممتاز تھے پائندہ خاں تنولی نے فرار ہوتے وقت جو زنبورکیں چھوڑیں انہیں آپ ہی احتیاط کے ساتھ لائے۔ امب کے محصورین سے گفتگو بھی آپ نے ہی کی چھتر بائی کے محاصرہ کے طول پکڑ جانے کی وجہ سے جب آپ پنجتار توپیں لینے کے لیے چلے گئے تو آپ کے برادر اصغر شیخ علی محمد شہیدؒ ہو گئے جب آپ کو اس غم انگیز خبر کا علم ہوا تو فرمانے لگے "الحمد للہ، ہمارا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا، وہ پوری ہو گئی، ہم سب کو اللہ تعالےٰ شہادت نصیب کرے۔ چنانچہ آپ نے بھی بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ جماعتِ مجاہدین ص ۱۶۱ - ۱۶۵ -

۹۹۔ آپ نے مختلف جنگوں میں شرکت فرمائی۔ جنگِ عشرہ میں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ حضرت امام صاحبؒ نے آپ کی شہادت کی خبر سنی تو فرمایا:-

> دشمن سے رزم و پیکار کے لیے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں بعض صاحبِ تدبیر، بعض شجاع و دلاور اور بعض دونوں خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں۔ آپ کا یہ ارشاد اس حقیقت کے اظہار کے لیے تھا کہ امام خاں دونوں خصوصیتوں کے جامع تھے۔

۱۰۰۔ صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ موتہ من ارض الشام

۱۰۱۔ رسالدار عبدالحمید خاں ٹونک میں ممتاز عہدے پر فائز تھے آپ نے پھلانہ میں سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تمام لڑائیوں میں شریک رہے جنگِ زیدہ کے بعد جب کسی مستقل رسالدار کی ضرورت محسوس ہوئی تو امام صاحبؒ نے آپ کا نام تجویز فرمایا اور ارباب بہرام خاں نے تصدیق کی انتظام عُشر کے سلسلہ میں آپ قاضی سید حبانؒ کے ساتھ رہے۔ جنگِ مایار میں شجاعت وجوانمردی کے خوب جوہر دکھائے جس طرف باگ اٹھاتے، دشمن کی صفیں چیر کر رکھ دیتے۔ تین چار مرتبہ درانی لشکر میں گھسے اور تلواریں مارتے ہوئے بالکل پار نکل گئے۔ ان حملوں میں خود بھی زخموں سے چُور ہو گئے حتیٰ کہ گھوڑے سے بھی گر پڑے لیکن زبان سے اُف تک نہ کی۔ وفات کے متعلق اختلاف ہے ایک روایت کے مطابق تو رو لیکن دوسری کے مطابق پنجتار میں واصل بحق ہوئے۔ (جماعت مجاہدین ص ۱۷۸ - ۱۸۱)

۱۰۲۔ حافظ عبداللطیف مولوی عبدالحیؒ کے بھائی اور شیخ فضل اللہ کے صاحبزادے تھے آپکا اصل وطن نیوتنہ ضلع اناؤ تھا۔ چھتر بائی کا واقعہ کسی بدنیتی نہیں بلکہ سوء تدبیر کا نتیجہ تھا۔ جنگِ بالاکوٹ کے بعد آپ واپس آ گئے تھے۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ میرٹھ کی ایک مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے کسی نے کہہ دیا کہ یہ سید صاحبؒ کے پاس سے بھاگ کر آئے ہیں یہ سن کر آپ کو بہت غصّہ آیا اور منبر پر کھڑے ہو کر بہت گرم وعظ فرمایا جسے سن کر سب لوگ مدارات کے لیے بڑھے لیکن آپ مسجد سے باہر تشریف لے گئے اور کسی کی مدارات قبول نہ کی۔ جماعت مجاہدین ص ۲۸۴ - ۲۸۵

۱۰۳۔ سید عبدالرؤف باڑہ ضلع ہشت نگر کے باشندے تھے تحریک کے آغاز میں ہی اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جنگِ شیدو، سفرِ پنجگلی اور جنگِ اتمان زئی میں شریک رہے اتمان زئی کے رئیس عالم خاں کی خرابیِ نیت کی پہلی اطلاع آپ ہی نے سید صاحبؒ کو پہنچائی تھی۔

(جماعت مجاہدین ص ۲۷۱)

۱۰۴۔ سید احمد شہید ۵۸۷

۱۰۵۔ وصایا الوزیر حصّہ دوم ص ۱۰۸

۱۰۶۔ منظورۃ السعداء بحوالہ سید احمد شہید ص ۶۴۲

۱۰۷۔ 〃 〃 〃 〃 .. .. ص ۶۴۳

۱۰۸۔ "دہلی اور اس کے اطراف" ص ۱۱۳۔ مولانا حکیم سید عبدالحی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ طبع اوّل جون ۱۹۵۸ء۔

۱۰۹۔ دہلی اور اس کے اطراف ص ۱۱۸

۱۱۰۔ وصایا الوزیر حصّہ دوم ص ۱۰۹

۱۱۱۔ مولانا نصیر الدین منگلور ضلع سہارنپور کے باشندے تھے۔ ابتدائی دور سے سیّد صاحبؒ کے ساتھ رہے اور آپ کی شہادت کے بعد جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو اعلیٰ پیمانے پر قائم رکھنے کا سہرا انہیں کے سر تھا۔ آپ شجاعت اور حسنِ تدبّر کا پیکر تھے تقریباً ۱۸۳۸ء تک مجاہدین کی سالاری عامہ کا منصب بھی آپ کو حاصل رہا۔ فتح خاں پنجتاری کے ساتھ جنگ میں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ سرگزشتِ مجاہدین ص ۱۲۳۔ ۱۲۸

۱۱۲۔ سیّد احمد شہید ص ۲۱۷

۱۱۳۔ منظورۃ السعداء ص ۱۱۴۳۔ سیّد جعفر علی نقوی۔ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۱۱۴۔ ایضاً ص ۱۱۵۹

۱۱۵۔ سیّد صاحبؒ کی مہر پر "اِسْمُہٗ اَحْمَدُ" اور امام صاحبؒ کی مہر پر "وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِسْمٰعِیْلَ" کے الفاظ کندہ تھے۔

۱۱۶۔ سید احمد شہید بحوالہ وقائع احمدی جلد ۳ ص ۸۳۔ ۸۴

۱۱۷۔ سید احمد شہید ص ۳۸۷

۱۱۸۔ آپ مولانا عبدالحی کے چچازاد یا علاتی بھائی تھے۔ آپ علم و تقویٰ کے اعتبار سے بہت بلند پایہ تھے نہر میں سیّد صاحبؒ کی جب ملاقات کی تو فوراً بیعت کرلی۔ آپ مختلف فنون میں باکمال ہونے کے باعث غازیوں کی تربیت بھی فرمایا کرتے تھے پنجتار کے قریب ایک گاؤں قاسم خیل میں آپ نے لوٹے ڈھالنے کا ایک کارخانہ بنایا ہوا تھا سیّد صاحبؒ کی مجلس شوریٰ کے بھی اہم رکن تھے تمام فنونِ حرب خصوصاً نیزہ بازی میں بڑے ماہر تھے نیزہ بازی کے کچھ پیچ آپ نے سیّد صاحبؒ سے بھی سیکھے۔ جنگِ بالاکوٹ میں ہی جامِ شہادت نوش فرمایا لیکن شہادت کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ جماعتِ مجاہدین ص ۲۳۲، ۲۳۴ وقائع احمدی۔

۱۱۹۔ تواریخ ہزارہ ص ۸۷

۱۲۰۔ منظورۃ السعداء ص ۱۱۹۴

۱۲۱۔ ایضاً حاشیہ ص ۱۱۹۴

۱۲۲۔ وقائع احمدی جلد ۳ ص ۲۰۹

۱۲۳۔ ایضاً ص ۲۲۵

۱۲۴۔ وقائع احمدی ج ۳ ص ۲۲۸

۱۲۵۔ سیّد احمد شہید ص ۹۱۷

۱۲۶۔ ایضاً ص ۹۱۷ - ۹۲۷

۱۲۷۔ حارق الاشرار

۱۲۸۔ دیباچہ "مقالاتِ یوم شاہ اسمٰعیل شہید" مرتبہ عبداللہ بٹ

باب ۶

۱۔ حیات طیّبہ ص ۴۴۶ طبع سوم ۱۹۵۸ء

۲۔ حیات بعد الممات

۳۔ اتحاف النبلاء ص ۸۱

۴۔ " " ص ۴۱۷

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۷۵۳ طبع اوّل مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور نیز ملاحظہ فرمائیے بروکلمان ج ۲ ص ۸۵۳

۶۔ حکایاتِ اولیاء ص ۹۱ - ۹۲

۷۔ نواب محمد میر خاں بن شاہ نظام الدین قادری نقشبندی کے حالات" علم وعمل" ص ۲۹۴ ج ۱ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۸۔ ان سوالات وجوابات کے لیے ملاحظہ فرمائیے مجلّہ اشاعت السنۃ النبویہ (لاہور) ص ۷۹ ش ۳ ج ۷ مجریہ ۱۸۸۴ء نیز تصدیر "اکمل البیان" ص ۱۲ - ۱۳

۹- مولانا حافظ عزیز الدین بن سراج الدین احمد مراد آبادیؒ ۱۲۹۵ھ میں تولد ہوئے ابتدائی کتب مدرسہ شاہی و مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں پڑھیں اور وہاں قرآن مجید بھی حفظ کیا عربی فارسی اور اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے توحید و سنت سے بے پناہ شغف تھا انجمن اہلحدیث و مدرسہ محمدیہ مراد آباد اور اپنے محلہ کی مسجد کے متولی و منتظم تھے علمی ذوق بہت بلند رکھتے تھے مولوی نعیم مراد آبادی کی "اطیب البیان" کے جواب میں "اکمل البیان" ایک دیوبندی حنفی کی "التحقیق الجدید" کے جواب میں "مطرق الحدید" اور علاوہ ازیں کئی دیگر بلند پایہ کتب تصنیف فرمائیں بالآخر ۸ر فروری ۱۹۴۸ء (۱۳۶۷ھ) کو عمر شریف کی تہتر بہاریں دیکھنے کے بعد یہ مرد مجاہد اور عاشق توحید و سنت راہگرائے عالم جاودانی ہوا۔ اکمل البیان ص ۲۷ - ۳۱، تراجم علمائے حدیث ہند ص ۴۳۲ - ۴۳۴ طبع دوم ۱۹۳۱ھ۔

۱۰- اکمل البیان ص ۱۰۸، حافظ عزیز الدین مراد آبادیؒ مطبوعہ "المکتبۃ السلفیۃ" لاہور

۱۱- فتاویٰ رشیدیہ ص ۴۴ - ۴۶ مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی۔

۱۲- مولانا محمد یعقوب بن مولانا محمد افضل دہلویؒ۔ دہلی میں ۲ر ذوالحجہ ۱۲۰۰ھ میں تولد ہوئے آپ نے شرح جامی اور جلالین شاہ عبدالعزیز سے پڑھیں اور دیگر درسی کتب کی تعلیم شاہ رفیع الدینؒ سے حاصل کی۔ آپ کو شاہ عبدالعزیزؒ سے علم و تصوف میں سند حاصل تھی۔ فراغتِ تحصیل علم کے بعد مدت تک درس و تدریس میں مصروف رہے پھر برادرِ اکبر شاہ محمد اسحٰقؒ کی معیت میں ۱۲۵۸ھ کو مکہ ہجرت کر کے وہاں سکونت پذیر ہو گئے نواب صدیق حسن خاںؒ، خواجہ احمد بن یٰسین نصیر آبادی کے علاوہ اور بھی بہت سے اہل علم نے آپ سے تلمذ حاصل کیا مکہ مکرمہ میں ہی ۲۷ر ذی القعدہ ۱۲۸۲ھ کو رہگرائے ملک عدم ہو گئے ملاحظہ فرمایئے نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۳۴ - ۵۳۵، آثار الصنادید ص ۲۷۶، واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۱۳

۱۳- مولانا نصیر الدین بن نجم الدین دہلویؒ باپ کی طرف سے امام ناصر الدین حسینی سونی پتیؒ کے خاندان سے متعلق تھے اور ماں کی طرف سے شیخ رفیع الدینؒ کے نواسہ تھے دہلی میں ولادت و نشأت ہوئی شاہ محمد اسحٰق سے تعلیم حاصل کی، انہی کی صاحبزادی سے نکاح ہوا ۱۲۵۰ھ میں مجاہدین کے ساتھ ہجرت کی اور کچھ مدت سندھ میں رہے پھر مرکز ستھانہ میں تشریف لے آئے اور امیر المجاہدین

منتخب ہوئے ۱۲۵۶ھ کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۰۳ سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۵-۲۱۰

۱۴- یک روزہ ص ۱ مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان۔

۱۵- سورۂ یٰسین آیت ۸۱

۱۶- علامہ حیدر علی ٹونکی رح دہلی میں تولد ہوئے اور بچپن میں ہی رامپور چلے گئے اور سید غلام علی اور شیخ عبدالرحمٰن قہستانی و شیخ رستم علی رامپوری سے نحو اور ادب کی کتابیں پڑھیں پھر لکھنؤ جا کر شیخ مبین بن محب اللہ اور دہلی جا کر شاہ رفیع الدین رح و شاہ عبدالعزیز رح سے علم حاصل کیا۔ حکیم شریف بن اکمل سے طب سیکھی اور حضرت سید صاحب رح سے تصوف میں فیض حاصل کیا۔ تحصیلِ علم کے بعد آپ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ نواب وزیر الدولہ والئ ٹونک نے بہت سے امور آپ کے سپرد کر دیئے تھے بہت سے لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا آپ کی تصنیفات میں "صیانتہ الاناس عن وسوستہ الخناس" اور "رسالہ فی اثبات رفع الیدین" مشہور ہیں۔ آپ امام صاحب رح کی مدافعت میں لکھا کرتے تھے بالآخر ۷۰ برس کی عمر میں ۱۲۷۳ھ کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۳-۱۵۴

۱۷- مولانا سراج الدین بجنوری لکھنوی رح بہت بڑے عالم تھے آپ نے مولانا خیرآبادی رح اور مرزا محسن علی لکھنوی رح سے علم حاصل کیا فراغت کے بعد مدتِ دراز تک لکھنؤ میں مسندِ تدریس پر فائز رہے بہت سے اہلِ علم نے آپ سے علم حاصل کیا۔ مصنفات میں رسالہ "امکان نظیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و امتناعہٗ" خاص طور پر مشہور ہے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۷۔

۱۸- مفتی صدر الدین دہلوی ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے مولانا فضل امام رح، شیخ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحٰق رح سے تحصیلِ علم کیا۔ آپ بہت سے علوم و فنون میں یگانۂ روزگار تھے ۱۲۷۳ھ میں حکومتِ انگریزی نے بغاوت کے جرم میں پکڑ لیا اور تمام مال و جائیداد کو چھین لیا تو آپ اپنے گھر میں محصور ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ۲۵ طلبہ کے وظائف اور تعلیم کا بندوبست کیا کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے "منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال"۔ "الدر المنضود فی حکم امراۃ المفقود" اور بہت سے فتاویٰ آپ کی یادگار ہیں ۱۲۸۵ھ میں ۸۱ برس کی عمر میں وفات پائی۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۰-۲۲۱، ابجد العلوم ص ۹۱۷، گلشنِ بے خار ص ۱۰ از نواب

مصطفیٰ خاں شیفتہ، اتحاف النبلاء ص ۲۶۰، علم و عمل ص ۲۷۴ ترجمہ اردو فارغ عبد القادر خانی از محمد ایوب قادری، غدر کے چند علماء ص ۶۴ از انتظام اللہ، خم خانہ جاوید ج ۱ از لالہ سری رام حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱ از فقیر محمد، آثار الصنادید ص ۲۵۲ از سر سید احمد خاں

۱۹۔ نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۳۷۶

۲۰۔ مولانا فضل امام خیر آبادی خیر آباد میں پیدا ہوئے، مولانا عبد الواحد سے علم حاصل کیا فراغت کے بعد تدریس میں مصروف ہو گئے سرکارِ انگریزی کے خیر خواہ تھے فقہ و حدیث میں بہت کم معلومات رکھتے تھے۔ المرقاۃ، تلخیص الشفاء، حاشیہ میر زاہد، حاشیہ میر زاہد ملا جلال آپ کی قلمی یادگاریں ہیں ۵ ذی القعدہ ۱۲۴۳ھ میں خیر آباد میں وفات پائی۔

۲۱۔ بحوالہ اکمل البیان ص ۸۰۷۔ ۸۰۸

۲۲۔ ابجد العلوم ص ۹۱۶

۲۳۔ ملاحظہ فرمائیے باغی ہندوستان ص ۱۱۴۔ ۱۱۷ طبع اوّل ۱۹۴۷ء

۲۴۔ مفتی عنایت احمد بن محمد بخش کاکوروی ۹ شوال ۱۲۲۸ھ کو پیدا ہوئے سید محمد بریلوی، مولانا حیدر علی ٹونکی، مولانا نور الاسلام، شاہ محمد اسحٰق اور بہت سے دیگر علماء سے تحصیلِ علم کیا۔ دو سال علی گڑھ میں منصبِ قضا پر فائز رہے پھر چار سال تک رائے بریلی میں صدر الامین رہے انگریزی حکومت نے آپ کو جزائر سیلون کی طرف جلاوطنی کی سزا دی مگر تقویم البلدان کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے رہائی مل گئی، رہائی کے بعد حج بیت اللہ کے لیے گئے اور آخر کار ۷ ار شوال ۱۲۷۹ھ کو دنیا سے رخصت ہو گئے "علم الفرائض" "ملخصات الحساب"، "تصدیق المسیح"، "الکلام المبین"، "محاسن العمل"، "الدر الفرید"، "ہدایات الاضاحی" "ضمان الفردوس" اور "اربعین من احادیث النبی الامین" آپ کی قلمی یادگاریں ہیں۔

۲۵۔ اکمل البیان ص ۸۱۰

۲۶۔ حکایاتِ اولیاء ص ۴۰۱۔ ۴۰۲

۲۷۔ "افق المبین" میر باقر داماد کی یہ فلسفہ کی انتہائی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

۲۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے "دہلی اور اس کے اطراف" ص ۱۰۹۔ ۱۱۰

۲۹۔ نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۱۲۲

۳۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" ص ۲۹۳ از مولانا محمد یوسف کوکن عمری۔

۳۱۔ مولوی فضلِ رسول بدایونی صفر ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوا۔ درسی کتابیں اپنے دادا عبدالمجید سے پڑھیں اور سندِ فراغت مولانا نور الدین لکھنوی سے حاصل کی۔ مولانا سید عبدالحی رح نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بڑے جھگڑالو، متعصب، مناظر، سنت کے بہت بڑے مخالف اور بدعت کے شیدائی، اہلِ حق کے دشمن اور دنیا پرستی کے دوست تھے۔ آپ سرکارِ انگریزی کے ملازم اور بعض دیسی ریاستوں کے وظیفہ خوار تھے آپ کے رشحاتِ قلم کبھی انگریزی سرکار کے پریس میں چھپتے تھے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۷۷ - ۳۷۸، اکمل التاریخ (ان کی سوانح عمری مرتبہ منشی محمد یعقوب حسین بدایونی) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۳ - طبع کراچی۔

۳۲۔ مولوی احمد رضا خاں ۱۲۷۲ھ میں بانس بریلی میں پیدا ہوئے، انہوں نے نزاعی اور اختلافی مباحث میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھیں جن میں نہایت شدت سے قدیم حنفی طریقوں کی حمایت کی وہ تمام رسوم فاتحہ خوانی، چہلم، برسی، گیارہویں، عرس، تصورِ شیخ، قیام، میلاد، استمداد از غیر اللہ مثلاً یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ وغیرہ کے قائل ہیں۔ مولوی صاحب ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء کو فوت ہوئے۔

۳۳۔ انوار آفتاب صداقت ص ۵۳۸ - ۵۴۰ از قاضی فضل احمد مطبوعہ لاہور ۱۹۵۱ء

۳۴۔ تاریخ وہابیہ ص ۳۹

۳۵۔ اکمل البیان ص ۱۷

۳۶۔ سیرت سید احمد شہید ص ۳۵۷ - ۳۵۸ طبع دوم

۳۷۔ "نصیحتہ المسلمین" توحید و سنت کی تائید میں مشہور رسالہ ہے اور اس کے مصنف پر پیچھے نوٹ دیا جا چکا ہے۔

۳۸۔ سورۂ آلِ عمران آیت ۱۰۴ ترجمہ یہ ہے

اور دیکھو! ضروری ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو، وہ نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے اور

بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں ۔"

۳۹ ۔ بقرہ آیت ۲۱۸ ترجمہ یہ ہے :۔

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے وطن چھوڑا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

۴۰ ۔ آل عمران آیت ۴۷ ۔ ترجمہ یہ ہے :۔

"اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے خاص کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۔"

۴۱ ۔ فتاویٰ نذیریہ ج ۱ ص ۱۰۳ مطبوعہ اہلحدیث اکادمی لاہور ۱۹۷۱ء

۴۲ ۔ حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیے ابجد العلوم ص ۹۲۵، نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۰

۴۳ ۔ اکمل البیان ص ۷۹۵

۴۴ ۔ فتاویٰ نذیریہ ج ۱ ص ۱۰۵ ۔ ۱۰۶ اہلحدیث اکادمی لاہور

۴۵ ۔ فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۴۱ محمد سعید اینڈ سنز کراچی

۴۶ ۔ " " " ۴۲۰۰ ۔ ۴۲۳

۴۷ ۔ حکایاتِ اولیاء ص ۹۲

۴۸ ۔ الجہد المقل حصہ اول ص ۲ ۔ ۴

۴۹ ۔ یعنی مولانا ندوی صاحبؒ کے برادرِ اکبر مولانا حکیم سید ابو حبیبؒ صاحب جو کہ مولانا عبداللہ صاحب غازی پوریؒ کے شاگرد، توحید و سنت کے شیفتہ اور بڑے عابد و زاہد تھے ۔

۵۰ ۔ مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں ص ۸ ۔ ۹ مرتبہ محمد عمران خاں ندوی مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۔

۵۱ ۔ " " " " " ص ۲۹

۵۲ ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۷۵ از مولانا عبید اللہ سندھی مطبوعہ سندھ ساگر اکادمی لاہور

۵۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۷۵ - ۷۶ از مولانا عبید اللہ سندھی مطبوعہ سندھ ساگر اکادمی لاہور۔

۵۴۔ خارق الاشرار ص ۲۸ - ۳۸ از جناب شیخ فتح اللہ ملحق بہ تقویت الایمان مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان۔

۵۵۔ سلسلۃ العسجد ص ۱۰۶ نمبر ۵۲۵

۵۶۔ موج کوثر ص ۳۹۔ ایڈیشن ہشتم ۱۹۶۸ء

۵۷۔ تقویۃ الایمان ص ۲۹ مطبوعہ اہلحدیث اکادمی لاہور ۱۹۷۳ء

۵۸۔ آب حیات ص ۲۶۔ مولانا محمد حسین آزاد طبع ہفت دہم ۱۹۵۷ء

۵۹۔ ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۶۰ مصنفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد مترجمہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء۔

۶۰۔ تاریخ ادب اردو ص ۳۴

۶۱۔ مولانا محی الدین احمد قصوری میاں محمود علی قصوری کے برادر اکبر اور مولانا عبد القادر قصوری کے صاحبزادے تھے آپ معروف دینی راہنما تھے۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغ اسلام میں گزارا تحریک پاکستان اور اس سے قبل کی کئی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کئی کتابوں کے مصنف اور جمعیت دعوت تبلیغ کے بانی تھے مرحوم نے ۲۵ جنوری ۱۹۷۱ء بروز اتوار بوقت صبح انتقال فرمایا۔

۶۲۔ دیباچہ "تذکیر الاخوان"

۶۳۔ ترجمہ از مقدمہ صراط المستقیم

۶۴۔ سیرت سید احمد شہید ج ۱ ص ۳۲۴ - ۳۲۵ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

۶۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۲۱

۶۶۔ " " " ص ۴۶۱

۶۷۔ افسوس کہ "غالب نامہ" "یادگار شبلی"۔ "آب کوثر"۔ "رود کوثر"۔ "موج کوثر"۔ مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان۔ کلچرل ہیریٹیج آف پاکستان" اور کئی دیگر کتب کے مصنف جناب شیخ محمد اکرام ایم اے، ڈی لٹ، اکیڈیمک ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو

انتقال فرما گئے۔ حالات کے لیے ملاحظہ فرمایئے ماہنامہ "المعارف" لاہور ج ۶ شمارہ ۲-۳ فروری مارچ ۱۹۷۳ء۔

۶۸۔ موجِ کوثر ص ۲۰ - ۲۱

۶۹۔ عبقات ص ۳۔ مجلسِ علمی کراچی ۱۳۸۰ھ

۷۰۔ " " " ۶ " " "

۷۱۔ " " " ۲۲۰ - ۲۲۱

۷۲۔ آثار الصنادید ص ۲۷۲

۷۳۔ حالات کے لیے ملاحظہ فرمایئے "حیات عبدالحی" از مولانا ابوالحسن علی ندوی، "دہلی اور اس کے اطراف" از حکیم سیّد عبدالحی رح

۷۴۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۹

۷۵۔ منصبِ امامت ص ۹۸

۷۶۔ " " " ۹۶

۷۷۔ " " " ۹۷

۷۸۔ " " " ۱۱۴ مطبع فاروقی دہلی۔

۷۹۔ مشاہیرِ اہلِ علم کی محسن کتابیں ص ۲۹

۸۰۔ ایضاح الحق ص ۳۔ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

۸۱۔ اتحاف النبلاء المتقین ص ۴۴

۸۲۔

۸۳۔ تنویر العینین

۸۴۔ حضرت شاہ مخصوص اللہ صاحب علم وفضل بزرگ تھے ساری زندگی درس و تدریس میں بسر فرمائی آخر عمر میں مسندِ تدریس کو خیرباد کہہ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو وفات پائی۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۸ - ۴۶۹ واقعات دارالحکومت دہلی حصّہ دوم ص ۵۸۹، آثار الصنادید ص ۲۶۸۔

۸۵۔ حضرت امام الہند سیاست ہی میں عبقری نہ تھے، علم میں بھی کامل اور کلام کے بادشاہ تھے خطابت میں جلال وجمال کی حسین آمیزش، طرزِ نگارش والہانہ بھی اور عالمانہ بھی اس میں نقل بھی اور عقل بھی ؛ ناممکن ہے کہ قلبِ سلیم اس سے اثرِ حق قبول نہ کرے آپ نے ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو ۲ بجے رات کے مبارک وقت میں بر مقام دہلی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

۸۶۔

۸۷۔ اتحاف النبلاء ص ۴۳

۸۸۔ الحیات بعد الممات ص ۱۹۹ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء

باب ۷

۱۔ سورہ لقمان آیت ۱۳

۲۔ تقویۃ الایمان ص ۳۴، اہلحدیث اکادمی لاہور مطبوعہ فروری ۱۹۷۳ء

۳۔ آلِ عمران آیت ۱۲۳

۴۔ عوارف المعارف ص ۴۵

۵۔ روض الریاحین۔

۶۔ فوائد الفواد ص ۶۱

۷۔ فتوح الغیب مقالہ ۱۷

۸۔ مکتوباتِ قدوسی، مکتوب صد وپنجاہ ونہم ص ۳۱۳

۹۔ فتوحاتِ مکیہ ص ۶۰۰

۱۰۔ مکتوبات ج ۱ ص ۱۲۵

۱۱۔ تقویۃ الایمان ص ۶۷-۶۸ اہلحدیث اکادمی لاہور، ۱۹۷۳ء

۱۲۔ اطیب البیان ص ۳۴۵ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء

۱۳۔

۱۴۔ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۳۰ طبع اوّل، مصر ۱۳۰۸ھ

۱۵۔ مکتوبات شیخ یحییٰ منیری

۱۶۔ تقویۃ الایمان ص ۱۱۰۔ ۱۱۱

۱۷۔ صحیح بخاری

۱۸۔ صحیح مسلم

۱۹۔ اطیب البیان ص ۳۴۳ طبع ششم۔ کراچی ۱۹۵۶ء

۲۰۔ تقویۃ الایمان ص ۱۱۶

۲۱۔ " " " "

۲۲۔ مثنوی ملکِ نور ص ۱۸ مطبوعہ لاہور ۱۳۴۰ھ

۲۳۔ صراط مستقیم

۲۴۔ انتباہ فی اسناد حدیث رسول اللہ ص ۵۸

۲۵۔ تفرید التوحید ص ۴۶

۲۶۔ اخبار الاخیار ص ۱۹۱

۲۷۔ بہارِ شریعت حصہ سوم ص ۱۶۱

۲۸۔ " " " " ص ۱۰۵

۲۹۔ فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۶۷

۳۰۔ تحریک آزادی فکر ص ۲۹۔ مطبوعہ ۱۶ جون ۱۹۶۹ء

۳۱۔ اطیب البیان ص ۳۳۳ طبع ششم ۱۹۵۶ء

۳۲۔ تقویۃ الایمان ص ۲۵۔ مطبوعہ ۱۹۷۳ء لاہور

۳۳۔ " " ص ۱۱۹۔ ۱۲۰

۳۴۔ " " ص ۱۱۲

۳۵۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۳ ص ۴۶۹

۳۶۔ سورۂ زمر آیت ۳۰

۳۷۔ صحیح بخاری

۳۸۔ صحیح بخاری

۳۹۔ جیسا کہ مولوی احمد رضا خاں نے ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۱۶۰

۴۰۔ الطیب البیان ص ۲۵۵

۴۱۔ " " ملاحظہ فرمائیے ۔ ۲۵ - ۳۰۵

۴۲۔ تقویتہ الایمان ص ۶۷

۴۳۔ سورۂ یونس آیت ۱۸

۴۴۔ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۲

۴۵۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

۴۶۔ سورۂ یونس آیت ۳

۴۷۔ سورۂ مریم آیت ۱۰۹

۴۸۔ تقویتہ الایمان ص ۷۰

۴۹۔ برکات الامداد ص ۸

۵۰۔ بہار شریعت حصہ اوّل ص ۲۲

۵۱۔ شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان ۱۱۱۵ھ میں نجد کی بستی عینیہ میں تولد ہوئے جب آپ نے دعوت و تبلیغ شروع کی تو درعیہ تشریف لے گئے اور وہاں کے امیر محمد بن سعود نے ۱۱۵۹ھ میں آپ کی اطاعت کرلی۔ امام موصوف ؒ صاحب علم بزرگ تھے آپ کا طبعاً دینی قیادت کی طرف رجحان تھا۔ آپ کی ساری زندگی دعوت و تبلیغ اور ردِ شرک و بدعت میں گزری۔ تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور "کتاب التوحید" ہے۔ جس طرح ہندوستان کے "خوش فہموں" میں امام محمد اسمٰعیل شہید ؒ کی "تقویتہ الایمان" بدنام ہے اسی طرح عرب و عجم کے اکثر "خوش عقیدہ" لوگوں میں کتاب التوحید بھی مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی اس کتاب کی کئی شروحات لکھی گئی ہیں علاوہ ازیں (۲) کتاب الشبہات من التوحید (۳) الاصول الثلاثۃ وادلتھا (۴) شروط الصلاۃ وارکانھا (۵) اربع قواعد (۶) اصول الایمان (۷) کتاب فضل الاسلام (۸) کتاب الکبائر (۹) نصیحۃ المسلمین (۱۰) ستۃ مواضع من السیرۃ (۱۱) تفسیر الفاتحہ (۱۲) مسائل الجاہلیۃ (۱۳) تفسیر الشہادۃ (۱۴) تفسیر علی بعض سور القرآن (۱۵)

کتاب السیرۃ اور (۶) الہدی النبوی وغیرہ آپ کی قلمی یادگاریں ہیں۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ محمد بن عبدالوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح ــــ از مولانا مسعود عالم ندوی۔ طارق اکیڈمی فیصل آباد۔

۵۲۔ ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۵۳

۵۳۔ " " " " "

۵۴۔ مولوی فضل رسول بدایونی سرکارِ انگریزی کے ملازم اور بعض دیسی ریاستوں کے وظیفہ خوار تھے ملاحظہ ہو ان کی سوانح عمری اکمل التاریخ حصہ دوم ص ۳۷۲، ۳۸۰، ۵۱۲ مرتبہ منشی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی، آپ کی کتابیں بھی سرکارِ انگریزی کے پریس میں چھپتی تھیں۔ حوالہ مذکور نیز ملاحظہ فرمایئے تذکرہ علمائے ہند اردو ص ۳۸۱، طبع کراچی، اسی طرح مولوی احمد رضا خاں کے پردادا کاظم علی خاں بھی انگریزوں کے خصوصی آدمی تھے انگریزوں نے انہیں بدایوں کی تحصیل داری عنایت کر رکھی تھی۔ انگریزوں سے ان کے تعلقات کا اندازہ اس سے لگایئے کہ سلطنتِ مغلیہ اور انگریزوں کے مناقشات کے تصفیہ کے لیے انہوں نے بڑی جدوجہد کی اسی مقصد کے لیے کلکتہ بھی گئے ملاحظہ فرمایئے "حیات اعلیٰ حضرت" ج ۱ ص ۳

۵۵۔ ہندوستان میں وہابی تحریک (اردو) ص ۵۷

۵۶۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۹۸ مطبوعہ سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۵۲ء

۵۷۔ الحطۃ بذکر الصحاح الستہ۔

۵۸۔ اطیب البیان ص ۵ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء

۵۹۔ مکاتیبِ سید صاحبؒ ص ۱۸ بحوالہ سید احمد شہید

۶۰۔ مکتوباتِ سید احمد شہید ص ۱۶۴ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۹ء

۶۱۔ " " " " ص ۱۷۲

باب ۸

۱۔ دیباچہ عبقات ص ۳

۲۔ اتحاف النبلاءؒ ص ۴۱۷

۳۔ سید احمد شہید ص

۴۔ تنبیہہ الضالین قلمی بحوالہ جماعتِ مجاہدین ص ۱۲۶

۵۔ آثار الصنادید ص ۲۷۲

۶۔ " " " "

۷۔ ارواحِ ثلاثہ ص ۱۰۹

۸۔ الحیات بعد الممات ص ۱۹۷

۹۔ سید احمد شہید ص

۱۰۔ حکایاتِ اولیاء ص ۷۷

۱۱۔ حکایاتِ اولیاء ص ۷۴

۱۲۔ وصایا الوزیر ج ۲ ص ۱۰۹

۱۳۔ حیات سید احمد شہید ص ۳۱۱

۱۴۔ دیباچہ عبقات از مولانا بنوری ص ۲

باب ۹

۱۔ الحیات بعد الممات ص ۴۹

۲۔ " " " " ۱۹۷ مطبوعہ کراچی

۳۔ علم و عمل (اردو ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی از جناب محمد ایوب صاحب قادری ایم اے) ج ۲ ص ۲۳۳

۴۔ مکتوبات ص ۲۳

۵۔ آثار الصنادید ص ۲۷۱ - ۲۷۴

۶۔ تذکرہ ص ۲۴۴ - ۲۴۶ طبع ۱۹۶۷ء

۷۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۱۹۵

مراجع وماخذ

۱- آب حیات : مولانا محمد حسین آزادؒ، طبع ہفت دہم ۱۹۵۷ء

۲- ابجد العلوم : حضرت نواب سید صدیق حسن خاںؒ، مطبع صدیقی بھوپال ۱۲۹۶ھ

۳- اتحاف النبلاء المتقین، باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین } حضرت نواب سید صدیق حسن خاںؒ : مطبع نظامی کانپور، ۱۸۷۱ء

۴- آثار الصنادید : سر سید احمد خاں، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، ۱۹۶۶ء

۵- اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ : طبع اوّل، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۶- اشاعت السنۃ النبویۃ : ش ۳، ج ۷، مجریہ ۱۸۸۴ء

۷- اکمل البیان : حافظ عزیز الدین مراد آبادیؒ، المکتبۃ السلفیۃ لاہور

۸- اکمل التاریخ : مولوی محمد یعقوب ضیاء قادری، عثمانی پریس بدایوں، ۱۹۱۶ء

۹- التاج المکلل : حضرت نواب سید صدیق حسن خاںؒ

۱۰- الحیات بعد الممات : قاضی فضل حسین، کراچی

۱۱- العلم الخفاق من علم الاشتقاق : حضرت نواب سید صدیق حسن خاںؒ

۱۲- المعارف : (ماہنامہ، لاہور) ج ۶، ش ۲، مجریہ ۳، مارچ ۱۹۷۳ء

۱۳- الیانع الجنی : شیخ محسن بن یحییٰ ترہتیؒ، جید برقی پریس دہلی، ۱۳۴۹ھ

۱۴- انوارِ آفتاب صداقت : قاضی فضل احمد، لاہور، ۱۹۵۱ء

۱۵- ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح } حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ : کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند

۱۶- باغی ہندوستان : مولانا محمد عبد الشاہد شروانی، مدینہ پریس بجنور، ۱۹۴۷ء

۱۷- پاکستان میں فارسی ادب : ڈاکٹر ظہور الدین احمد

۱۸- تاریخ ادب اُردو، رام بابو سکسینہ/ ترجمہ مرزا محمد عسکری، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور
۱۹- تاریخِ دہلی ؛
۲۰- تاریخِ ہندوستان : مولانا ذکاء اللہ دہلوی، شمس المطابع دہلی، ۱۸۹۸ء
۲۱- تحریکِ آزادیٔ فکر، حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ، ۱۲ رجب، ۱۹۶۹ء
۲۲- تذکرہ ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ ۱۹۶۷ء
۲۳- تذکرہ اولیاء ہند و پاکستان (اُردو ترجمہ) مرزا محمد اختر دہلوی، سیٹھ آدم جی عبداللہ پبلشرز بمبئی والے، لاہور
۲۴- تذکرہ شاہ ولی اللہ : مولانا مناظر احسن گیلانی، دوآبہ پریس لاہور ۱۹۴۶ء
۲۵- تذکرۃ الشعراء ، دولت شاہ سمرقندی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ
۲۶- تذکرۂ صادقہ : مولانا عبدالرحیم صادق پوری، دی آزاد پریس پٹنہ، ۱۹۶۴ء
۲۷- تذکرۂ صوفیاء سرحد : مولانا اعجاز الحق قدوسی
۲۸- تذکرۂ علماء ہند : رحمان علی/ ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری کراچی، ۱۹۶۱ء
۲۹- تراجم علماء حدیثِ ہند : مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہرویؒ، جید برقی پریس دہلی، ۱۹۳۸ء
۳۰- تفسیر کبیر، امام فخر الدین رازیؒ طبع اول مصر ۱۳۵۸ھ
۳۱- تقویۃ الایمان : حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ، اہل حدیث اکادمی لاہور، ۱۹۷۳ء
۳۲- تنویر العینین : " " " " المکتبۃ السلفیۃ، لاہور
۳۳- جماعتِ مجاہدین : مولانا غلام رسول مہر، علمی پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۵۵ء
۳۴- حارق الاشرار، شیخ فتح اللہ (ملحق بہ تقویۃ الایمان) مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان
۳۵- حالنامہ (قلمی) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور
۳۶- حدائق الحنفیۃ : فقیر محمد جہلمیؒ، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۰۶ء
۳۷- حکایاتِ اولیاء (مجموعہ امیر الروایات)
۳۸- حیاتِ سید احمد شہیدؒ : مولانا محمد جعفر تھانیسری، نفیس اکیڈمی، کراچی) لاہور ۱۹۵۶ء
۳۹- حیاتِ طیبہ : مرزا حیرت دہلوی، اسلامی پبلشنگ کمپنی، لاہور

۴۰- حیات عبدالحیّ : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی،

۴۱- حیاتِ ولی، شیخ رحیم بخش دہلوی، افضل المطابع دہلی

۴۲- خانوادۂ قاضی بدرالدولہ : مولانا محمد یوسف کوکن عمری

۴۳- خم خانہ جاوید : لالہ سری رام، دہلی ۱۹۱۷ء

۴۴- دہلی اور اس کے اطراف، مولانا حکیم سید عبدالحیؒ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جون ۵۸ ۱۹ء

۴۵- رحیق (ماہنامہ) لاہور، مجریہ نومبر ۱۹۵۷ء

۴۶- رودِ کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، لاہور، ۱۹۵۸ء

۴۷- سرگذشتِ مجاہدین : مولانا غلام رسول مہر

۴۸- سلسلۃ العسجد : حضرت نواب صدیق حسن خاںؒ

۴۹- سلیم التواریخ، صوفی اکبر علی، جالندھر ۱۹۱۹ء

۵۰- سید احمد شہیدؒ : مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۵۱- سیرت سید احمد شہیدؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۵۲- شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک: مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۵۲ء

۵۳- صحیح بخاری : امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ

۵۴- صحیح مسلم : امام مسلمؒ

۵۵- عبقات، حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ، مجلسِ علمی کراچی، ۱۹۸۰ء

۵۶- علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی

۵۷- علماء ہند کا شاندار ماضی:

۵۸- عوارف المعارف:

۵۹- غدر کے چند علماء : انتظام اللہ

۶۰- فتاویٰ رشیدیہ : مولانا رشید احمد گنگوہی، محمد سعید اینڈ سنز کراچی

۶۱- فتاویٰ عزیزی : شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، مطبوعہ مجتبائی

۶۲- فتاویٰ نذیریہ، شیخ الکل، حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ، اہل حدیث اکادمی لاہور ۱۹۵۱ء

۶۳۔ فتوح الغیب : حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

۶۴۔ فتوحاتِ مکیہ : شیخ ابنِ عربیؒ

۶۵۔ فوائد الفواد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ) امیر حسن سنجری، نول کشور پریس لکھنؤ

۶۶۔ کالا پانی : مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ / ترتیب محمد سرور طارق، طارق اکیڈمی، فیصل آباد

۶۷۔ کلامِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ : ترتیب محمد خالد سیف، طارق اکیڈمی، فیصل آباد

۶۸۔ لائیڈن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : طبع اوّل (ڈاکٹر محمد شفیع کا مقالہ)

۶۹۔ مثنوی سلکِ نور : حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ، مطبوعہ لاہور ۱۳۴۰ھ

۷۰۔ محمد بن عبدالوہابؒ، ایک مظلوم اور بدنام مصلح : مولانا مسعود عالم ندوی، طارق اکیڈمی فیصل آباد

۷۱۔ مخزنِ احمدی : (قلمی نسخہ مملوکہ لائبریری آف پنجاب یونیورسٹی)، لاہور

۷۲۔ مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں : مرتبہ محمد عمران خان ندوی، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ

۷۳۔ مکاتیبِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ :

۷۴۔ مکاتیبِ شبلیؒ

۷۵۔ مکتوباتِ سید احمد شہیدؒ : نفیس اکیڈمی، کراچی

۷۶۔ منصبِ امامت : حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ، آئینۂ ادب۔ لاہور

۷۷۔ منظورۃ السعداء : سید جعفر علی نقویؒ، مملوکہ لائبریری آف پنجاب یونیورسٹی لاہور

۷۸۔ نزہۃ الخواطر : مولانا حکیم سید عبدالحیؒ

۷۹۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی : مولوی بشیر الدین احمد، شمس پریس آگرہ، ۱۹۱۹ء

۸۰۔ وصایا الوزیر :

۸۱۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر ہنٹر کی OUR INDIAN MUSLAMANS کا اردو ترجمہ

۸۲۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک : مولانا مسعود عالم ندویؒ

۸۳۔ ہندوستان میں اہلِ حدیث کی علمی خدمات : مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی، مکتبہ نذیریہ، لاہور

۸۴۔ ہندوستان میں وہابی تحریک : ڈاکٹر قیام الدین، مترجم پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی، نفیس اکیڈمی کراچی

۸۵۔ یک روزہ : حضرت امام محمد اسمٰعیل شہیدؒ، فاروقی کتب خانہ، ملتان

"اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ترکتازیوں کا سلسلہ
پہلی صدی ہجری کے آخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور
تیرھویں صدی تک جاری رہا لیکن چند غیر معروف
مستثنیات کی گنجائش رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے
کہ صحیح معنوں میں اسلامی جہاد اس سرزمین پر صرف
ایک ہی مرتبہ ہوا تھا اور یہ وہی جہاد تھا جس کے
امیر حضرت سید احمد بریلوی اور سپہ سالار حضرت
شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
دُنیوی نُقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان
میں مُسلمانوں کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا واقعہ پچھلی
عظیم الشان فتوحات اور سلطنتوں کے مقابلے
میں اتنا حقیر نظر آتا ہے گویا پہاڑ کے سامنے ایک
رائی کا دانہ ہے لیکن اسلامی نُقطۂ نظر سے دیکھا جائے
تو اس مُلک میں اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ سب
سے زیادہ درخشاں ہے۔"

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ



ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال

